"ترکشِ مارا خدنگِ آخرین"!

محمد علیؒ

ذاتی ڈائری کے چند ورق

حصّہ اوّل

از

عبدالماجد دریابادی

صاحبِ تفسیر القرآن، مؤلفِ "حکیم الأمت"، مدیرِ "صدق جدید" (لکھنؤ)

....

باہتمام

مولانا مسعود علی ندوی

مطبع معارف پریس اعظم گڈھ

قیمت:۔ ۳؍

۱۳۷۳ھ
۱۹۵۴ء

فہرست مضامین

محمد علی رح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ ماضی قریب میں (یہ "قریب" و "بعید" اضافی ہی مفہوم رکھتے ہیں) مسلمانان ہند کے سب سے بڑے سردار تھے۔ مجھے ان سے شرف نیاز وسط ۱۹۱۲ء سے ان کی آخری عمر یعنی ختم ۱۹۳۰ء تک، کہنا چاہیے کہ ۱۷، ۱۸ سال کی مدت تک حاصل رہا۔ آیندہ صفحات میں میں نے اپنے اتنے دن کے تاثرات و مشاہدات کو یکجا اور قلمبند کر دینے کی کوشش کی ہے ـــــــ ان کی مستقل سیرت یا سوانح عمری ایک بالکل الگ چیز ہے۔ کوئی صاحب اس "ذاتی ڈایری" کو اس کا بدل یا قائم مقام نہ خیال فرمالیں۔

سردار ملت کی عمر کے آخری ۵، ۶ سال ملت ہی کے بعض طبقات سے شدید اختلافات میں گزرے۔ جنگ و مقابلہ آج اس طبقہ سے ہے کل اُس طبقہ سے۔ اور اخیر زمانہ میں تو ان کے خلاف بغاوت بہت عام ہو گئی تھی۔ یہ ساری داستان یقیناً بڑی تلخ ہے۔ اور بہت سے اکابر معاصرین کے عقیدتمندوں کے جذبات کو اس حصہ سے ضرور ٹھیس لگے گی۔ لیکن اگر اس جزو کو سرے سے نظرانداز کر دیا جاتا تو پھر کتاب کے لیے رہ ہی کیا جاتا۔ اپنی والی پوری کوشش اس کی البتہ رہی ہے کہ ان تلخیوں کو زیادہ سے زیادہ نرم اور ہلکے پیرایہ میں پیش کیا جائے۔ ـــــــ بعض پڑھنے والوں

کی دل شکنی اور ناگواری کسی نہ کسی حصہ سے ناگزیر ہے۔ یہ اگر جرم ہے تو اللہ اسے معاف فرمائے، اور پڑھنے والے بندے بھی آگے بڑھنے سے قبل عفو و درگزر کی نیت اپنے دل میں پختہ فرمالیں۔

واقعات کے پیش آنے اور ان کے قلبند ہونے کے زمانہ کی درمیانی مدت برسوں کی ہوگئی حافظہ نے ضرور کہیں کہیں دھوکا دیا ہوگا، اور متعدد واقعات عجب نہیں جو خلط ملط ہو کر رہے ہوں۔ بس اس لازمۂ بشریت کے سوا، کوئی ارادی غلطی یا غلط بیانی انشاءاللہ ان اوراق میں نہ ملے گی۔ گو ان حدود کے اندر بھی اپنے نفس کے تبریہ کا دعویٰ کرنا انسان کے لیے ہے دشوار ہی۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ۔

ڈائری کا جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے، بارہا ایک ہی واقعہ کو مختلف سیاقوں میں لایا گیا، اور مختلف زاویوں سے اسے دیکھا گیا ہے، اس کے بعد تکرار بیان کا عیب جا بجا پیدا ہو جانا لازمی سا ہوگیا ہے —— خدا ان اوراق کے ناظرین کو ایسی چشم عیب پوش عطا فرمائے کہ یہ عیب (اور ایک اسی پر کیا موقوف ہے، سارے ہی عیب) انھیں نظر آتے بھی نظر نہ آئیں، اور جب وہ کتاب بند کریں تو ان کی زبان سے ڈائری نویس کے حق میں دعائے خیر ہی نکلے!

عبدالماجد

دریاباد - بارہ بنکی

فروری ۱۹۵۲ء

جمادی الاولیٰ ۱۳۷۱ھ

———•———

باب (۱)

سنہ ۱۹۱۲ء

("چون بہ توافتدم نظر")

زمانہ ۱۹۱۲ء کی برسات کا ہے، اگست کے مہینہ کی کوئی تاریخ "مسلم یونیورسٹی" ابھی قائم ہو چکی کہاں ہے، قائم ہو رہی ہے، اس کے قیام کے غلغلہ سے ساری فضا گونجی ہوئی، ہر زبان پر اس کا تذکرہ، ہر مجلس مین اسی کا چرچا، سنہ ۱۹۱۰ء سے گویا یہی شغل پڑھے لکھے اور بے پڑھے ہندی مسلمان کا رہ گیا ہے، ہز ہائینیس سر آغا خان کا طوفانی دورہ، زر خیز اور "چندہ انگیز" ملک کے طول وعرض مین ختم ہو چکا ہے۔ اور اب دور دورہ راجہ صاحب محمود آباد کا ہے، (مہاراجہ بہت بعد کو ہوئے، اس وقت صرف راجہ تھے) وہی اس کشتی کے ناخدا، وہی یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے صدر، کانسٹیٹیوشن کمیٹی (مجلس وضع آئین وضوابط) اپنا کام شروع کر چکی ہے، اور قوم کی نگاہین اب اسی کی طرف لگی ہوئی ــــــــ ہائے، سنہ ۱۹۴۸ء مین کوئی سنہ ۱۹۱۲ء کی فضا کو کیسے واپس کھینچ بلائے ــــــــ چوٹی کے افراد، قوم وملت سے چنے ہوئے کمیٹی کے ممبر ہین، کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ مین طلب ہوا ہے، اور راجہ صاحب کی صدارت مین انھین کے قصر قیصر باغ مین ہو رہا ہے ــــــــ وہ قصر محمود آباد جو مہمانون کی دعوتون

---

۱ اس کتاب کے مسودۂ اول کا سنہ تحریر۔

اور عنیا فنون کے لیے وقف تھا، اور جس کا ڈائیننگ روم قابون اور پلیٹون اور چمچون کی جھنکار سے ہر وقت جیسے گونجتا ہی رہتا تھا!

کمیٹی کے سامنے وقت کے بڑے بڑے اہم اور نازک مسئلے چھڑے ہوئے۔ اور ملت کے دل و دماغ کا عطر جیسے کھنچ کر یہیں آگیا ہے۔ سر راجہ صاحب (نام، جس سے کم ہی لوگ واقف و مانوس تھے، علی محمد خان) وسیع ڈرائنگ روم کے صدر مین تشریف فرما۔ سامنے ایک بڑی لمبی میز، دو رویہ کرسیون کی قطار۔ میز کے ایک سمت مین ایک جوان رعنا، تندرست و تنومند، کوئی ۳۳، ۳۴ سال کی عمر کا، اعلیٰ درجہ کے انگریزی سوٹ مین ملبوس بیٹھا ہوا۔ داڑھی تازی منڈی ہوئی، مونچھین ذرا گھنی اور نوکیلی۔ ذہانت بشرہ سے ٹپکتی ہوئی، شوخی و ذکاوت چہرہ سے برستی ہوئی۔ ممبرون مین ایک سے ایک قابل و فاضل اس کے بڑے اور مخدوم بھی۔ لیکن نظرین بار بار اُسی کی طرف اُٹھ رہی ہین، اور کان اُسی کی آواز پر لگے ہوئے۔ وہ بولا تو سب سننے لگے۔ وہ اٹھا تو کوئی ہنسا اور کوئی بگڑا، مگر متوجہ سب ہی ہو گئے —— یہ تھا کامریڈ کا شہرۂ آفاق اڈیٹر محمد علی، رامپور کا باشندہ اور علی گڈھ اور آکسفرڈ کا گریجویٹ۔ جس کی جادو نگاری اور انگریزی انشا پردازی کا سکہ اس وقت بھی دلوں پر بیٹھ چکا تھا، حالانکہ کامریڈ کو نکلے ہوئے، ابھی سال ہی ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا۔ اور اردو روزنامہ ہمدرد کا ابھی وجود بھی نہ تھا۔

مین نے لکھنؤ کیننگ کالج سے بی، اے کی ڈگری ابھی ابھی لی تھی۔ سن ۲۰ سال کا۔ لکھنؤ مین رہتے کئی سال گذر چکے تھے، پھر بھی قصباتی ہونے کی خوبو باقی تھی۔ اور فطری شرمیلاپن اس پر مستزاد۔ لوگون سے ملنے جلنے، بات چیت کرنے مین شرم اور جھجھک غالب۔ اپنے بعض بڑے

بھائیون کے ساتھ بڑی ہمت کر کے راجہ صاحب کے ہان پہنچا تھا، اور تماشائیون کی مختصر سی صف مین ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا کہ مین سب کو دیکھون اور کوئی مجھے نہ دیکھے۔ محمد علی کا نام ۸ - ۱۰ سال سے کان مین پڑ رہا تھا۔ علی گڈھ میگزین مین ان کی طالب علمی کے زمانہ کی شوخ تحریرون کے علاوہ ان کے بعض انگریزی مضامین (مندرجہ ٹائمس آف انڈیا بمبئی) کا مجموعہ Thought on The Present Discontent کے نام سے دو ہی ایک سال ہوئے، پڑھنے مین آیا تھا۔ اور کامریڈ کا مطالعہ ہر ہفتہ، انگریزی ادب کی چاٹ مین تو گویا فرض ہی ہو گیا تھا۔ شوق دیدار آج پہلی بار پورا ہوا ——— سنہ ۱۲ء کو آج سنہ ۴۸ء مین ۳۶ سال ہو چکے، لیکن لوح حافظہ پر یہ نقش اتنا گہرا کہ جیسے ابھی کل کی بات ہے!

یہ سرگذشت دوپہر کی تھی۔ اسی شام کو بعد مغرب، باہر سے آئے ہوئے لیڈرون کے خیر مقدم مین مسلم کلب لکھنؤ کے بالاخانہ پر ایک مختصر سی صحبت مرتب ہوئی۔ سنہ ۱۲ء کا مسلم کلب لکھنؤ کچھ چیز ہی اور تھا۔ آج اسے کس چیز سے مثال دے کر سمجھایا جائے۔ امین آباد پارک مین واقع تھا، جنوبی قطار کی تعمیرات کے مشرقی گوشہ مین۔ وہین کہین جہان آج صدیق بک ڈپو اور انوار بک ڈپو ہین۔ پارک خود اس زمانہ مین نیا نیا تیار ہوا تھا، اور ایک نمائش گاہ بنا ہوا تھا۔ (سڑک اس پار مقابل کے امین الدولہ پارک کا ابھی وجود بھی نہ تھا) کلب کے خوب رو اور خوش صفات سکریٹری سید میر جان مستعدی اخلاص و قوت عمل کے ایک پیکر مجسم تھے۔ کلب کے دو منزلہ کی کھلی ہوئی پُر فضا چھت پر برف در شربت اور سوڈا اور لمونیڈ اور پان اور سگریٹ کے دور چل رہے ہین۔ اور لیڈرون کی جھلک دیکھنے کو مشتاقانِ دید کا ایک خاصہ گروہ موجود ——— یاد کر لیجئے کہ یہ ذکر دورِ "جمہوریت" سے قبل کا ہو رہا ہے۔

۱۹۱۲ء کا لیڈر، ۱۹۲۰ء کا لیڈر نہ تھا۔ اس وقت اسے قریب سے دیکھنے کا موقع ہی کسے نصیب ہوتا تھا، بجز چند خوش نصیبون کے؟

دن کی میٹنگ اگر خواص کی مجلس تھی، تو شام کی یہ تقریب ایک دربار عام۔ اسلامی ہند کے چنے ہوئے لیڈر اور مشاہیر عوام کے درمیان ایک جگہ مجتمع، آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ ہنس بول رہے ہین۔ لیکن بارات کا دولہا اس وقت بھی کامریڈ کا ایڈیٹر ہی۔ سج دھج صبح سے اس وقت بالکل مختلف۔ بجائے ہیٹ اور انگریزی سوٹ کے، سر پر ترچھی رامپوری پگڑی، جسم پر باریک و نفیس انگرکھا، چوڑی دار تنگ موری کا پاجامہ، دلی کا جوتا ——

محمد علی اپنی زندگی کے اس دور مین بھی صاحبیت مین یکسر غرق نہین ہوئے تھے۔ معاشرت مین فی الجملہ مشرقیت و اسلامیت اس وقت بھی ملحوظ رکھتے تھے —— ملنے اور بات چیت کرنے کی ہمت تو کیا ہوتی، دل اسی سے نہال ہوا جا رہا تھا کہ اتنے قریب سے دیکھنے اور گفتگو سننے کا موقع تو مل گیا۔ کامریڈ کی سحر نگاری سے مسلمان تو مسلمان، کالج کے ہندو لڑکے بھی متاثر تھے۔ ان کے سامنے محمد علی کا نام لیکر فخر کرنے کے لیے یہ کچھ کم تھا ع

اُن کے اِک جان نثار ہم بھی ہین!

۱۹۱۲ء ختم ہو رہا تھا کہ سرکار انگریزی نے دار الحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل ہونے کا اعلان کیا، اور کچھ روز بعد اس پر عملدرآمد بھی ہو گیا۔ "مسٹر" محمد علی اور ان کا کامریڈ ان دونون کو بھی اب دہلی آنا پڑا۔ کامریڈ ستمبر ۱۹۱۲ء مین کلکتہ سے ہٹا، اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو دہلی سے نکلنا شروع ہو گیا۔ ہمدرد نکلا تو نہین، لیکن نکلنے کا اعلان اس کے بھی ہو گیا۔ بلکہ کچھ عرصہ کے بعد نقیب ہمدرد کے نام سے ایک مختصر سا روزنامہ نکلنے

بھی لگا۔ ہمدرد کی ادارت کے ساز و سامان جس پیمانہ پر شروع ہوئے، وہ اُس زمانہ مین اردو اخبارات کے لیے ایک بالکل نئی چیز تھے۔ بدایوں کے ادیب جلیل میر محفوظ علی۔ بی۔ اے (علیگ) کسی زمانہ مین محمد علی کے نیم استاد رہ چکے تھے، وہ اس وقت مالک و مدیر "ہمدرد" کے مشیر خاص تھے۔ اُنہی کے مشورہ سے اڈیٹری کے لیے پہلے تو مولوی عبد الحق صاحب بی۔ اے سے (جواب "بابائے اردو" کے لقب سے مشہور ہین، اور اس وقت حیدرآباد دکن مین انسپکٹر آف اسکولز تھے) مراسلت رہی۔ لیکن پہلا تقرر بالآخر اس عہدہ پر اردو زبان کے نامور ادیب و ناول نویس مولانا عبد الحلیم شرر کا ہوا۔ چنانچہ ستمبر میں شرر مرحوم دہلی روانہ ہوگئے اور وہاں سے از راہ قدر افزائی مجھ طالب علم سے بھی پرچہ کے لیے علمی مضامین طلب فرمائے۔

میں نے اسی سال لکھنؤ سے بی۔ اے۔ فلسفہ لیکر کیا تھا۔ مغربی منطق و فلسفہ کے بری طرح پیچھے پڑا ہوا تھا۔ لکھنا برسوں کی مشق سے بھی کچھ آگیا تھا، اس لیے شہرت تھوڑی بہت اُسی زمانہ سے علمی اور فلسفیانہ مضامین کی ہوگئی تھی۔ الناظر (لکھنؤ) ادیب (الہ آباد) وغیرہ وقت کے معزز و مقبول ماہناموں مین بہ کثرت مضامین نکل چکے تھے۔ شرر صاحب کو حسن ظن اسی بنا پر قائم ہوا تھا۔ ۱۶ر اکتوبر کو والا نامہ انھوں نے حسب ذیل تحریر فرمایا:۔

"محلہ مچھلی والاں۔ نمبر $\frac{9}{2023}$ دہلی۔

مکرمی۔ تسلیم۔

میں آپ سے رخصت ہو کے آیا۔ لیکن ہمدرد کی اشاعت مین اس لیے تعویق ہوئی اور ہو رہی ہے کہ ابھی تک اردو کا ٹائپ نہین آیا۔ اب آگیا ہے مگر پھر بھی کمپازیٹروں کی کمی کی وجہ سے ایسی ایسی دشواریاں پیش ہیں کہ اگرچہ یکم نومبر تک پرچہ شائع کر دینے کا قطعی ارادہ کر لیا گیا ہے مگر نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کامیابی ہو سکے گی یا نہیں، کیونکہ جبتک ٹائپ آنے

کے بعد بھی ایک ہفتہ تک "ریہرسل" نہ کر لیا جائے جرأت اشاعت نہیں ہو سکتی۔

مجھے ہمدرد کے لیے قابل لکھنے والوں کی ضرورت ہے۔ کیا براہ کرم آپ میری مدد کے لیے آمادہ ہو سکیں گے؟ میں چاہتا ہوں کہ ہفتہ میں کوئی نہ کوئی آپ کا مضمون چھاپنے کے لیے ضرور مل جایا کرے۔ مہربانی فرما کر کوئی ایک مضمون تو ضرور ارسال فرمائیے۔ اور اگر آپ مسلسل بھیجنے کا وعدہ فرمائیں تو روزانہ پرچہ بھی آپکے نام جاری کر دیا جائے۔ پہلا مضمون جلد سے جلد مرحمت ہو۔

خاکسار

محمد عبد الحلیم شرر"

باب (۲)

۱۹۱۲-۱۳ء

(ہمدرد مولانا شرر)

محمد علی کا معیار پرچہ کے اڈیٹوریل اسٹاف اور لکھنے والوں ہی کے لیے اعلیٰ نہ تھا، بلکہ کاغذ، چھپائی وغیرہ ظاہری لوازم کے اعتبار سے بھی وہ اردو کے ہمدرد کو اپنے انگریزی کامریڈ ہی کی سطح پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اور کامریڈ ظاہری صفائی اور زینت کے معیار سے ولایت کے ہفت روزہ جریدوں کا گویا ہم سطح تھا۔ چھپائی لیتھو کے بجائے ٹائپ کی ہمدرد کے لیے طے پائی، اور خوشنما، نئے ٹائپ کے لیے آرڈر بیروت (شام) اور مصر کو بھیجے گئے قدرۃً وہاں سے آنے میں مہینوں کی مدت لگی ——— میں اس درمیان میں فلسفہ میں ایم۔ اے کرنے علیگڈھ چلا گیا تھا (لکھنؤ میں اس کا کوئی انتظام اُس وقت تک نہ تھا) مل اور اسپنسر کے قسم کے فرنگی فلسفی اس زمانہ میں ہر وقت سر پر سوار رہتے تھے۔ شرر صاحب کی فرمائش پر مِل کی کتاب "لبرٹی" (آزادی) کے کچھ حصہ کا ترجمہ کرکے ان کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ ترجمہ والی ترکیب محمد علی کو کچھ زیادہ پسند نہ آئی۔ خود اُس وقت انگریزیت مآب ہونے کے باوجود بہرحال فرنگیوں اور فرنگیت کے جامد مقلد نہ تھے۔ اُن کی چیزیں لینا چاہتے بھی تو انھیں اپنا کر۔ شرر صاحب کا دوسرا والا نامہ ۲۲ اگست ۱۲ء کا لکھا ہوا حسب ذیل

موصول ہوا :-

"مکرمی - تسلیم -

آپ کے علیگڈھ آنے کا حال سنکر مجھے خوشی ہوئی۔ آپنے مِل کی کتاب "لبرٹی" کا جو
پہلا جزو بھیجا، اُسے دیکھکے نہایت شکرگذار ہوا۔ مین نے محمد علی صاحب کو بھی اُسے دکھایا۔
ان کی یہ رائے ہے کہ کتاب کا ترجمہ مسلسل نکالنا تو مناسب نہین۔ لیکن آپ اسی کو اپنے
طور پر اور اس سے اخذ کر کے اگر مختلف مضامین کے عنوان سے تحریر فرمائین تو زیادہ
مناسب ہوگا۔ اور مین سمجھتا ہون کہ شاید آپ بھی اسے پسند فرمائین گے"۔

ٹائپ اور پریس کے الجھاوے جلد ختم ہونے والے نہ تھے۔ نقیب ہمدرد تو جوں توں
نکلتا رہا۔ اصل روزنامہ ۸ صفحہ کی ضخامت والا، ملتوی ہی ہوتا چلاگیا، اور ۱۲ء سنہ مدت
ہوئی ختم ہوچکا۔ کچھ روز بعد شرر صاحب بھی اکتا کر لکھنؤ واپس آگئے — —
لکھنؤ والوں کا دل ذرا باہر لگنا مشکل ہی ہوتا ہے، چاہے وہ "باہر" دلی ہی ہو! اور پھر یہ
کچھ ضروری بھی نہین کہ جو کامیاب ناول نویس اور ادیب ہو وہ روزنامہ کا ایڈیٹر بھی بہت
اچھا ہو —— نہ ہر اچھے باورچی کے لیے رکابدار ہونا لازمی، اور نہ ہر رکابدار
کے لیے اچھا باورچی ہونا!

شرر صاحب کے بعد محمد علی کو ایڈیٹوریل صیغہ کے لیے قاضی عبدالغفار بی۔ اے۔ مرادآبادی
اور سید جالب دہلوی مل گئے، اور کچھ روز بعد محمد فاروق ایم۔ اے دیوانہ گورکھپوری
بھی ہاتھ آگئے —— مئی ۱۳ سنہ میں ایک خط خود محمد علی کی طرف سے
چھپا ہوا وصول ہوا :-

مدمکرمی ۔ السلام علیکم

ہمدرد چار صفحہ کا نکلتا ہے ۔ اور یکم جون سے انشاء اللہ آٹھ صفحہ کا نکلنا شروع ہوگا۔ اب ضرورت ہے کہ مین آپ سے قلمی امداد کے لیے عرض کرون ۔ اس سے غالباً آپ کو بھی عذر نہ ہوگا کہ ہمدرد آپ کی امداد کا حاجتمند بھی ہے اور مستحق بھی ۔ مین چاہتا ہون کہ اصل ہمدرد کے ابتدائی پرچون سے آپ کے مضامین نکلنے شروع ہوجائین ، اس لیے اگر بہ واپسی ڈاک مضامین عنایت کرین گے تو اور بھی زیادہ میری مشکوری کا باعث ہوگا ۔ والسّلام

نیازمند ۔ محمد علی "

یہ گشتی خط تھا ۔ یقیناً بہت سے اور لوگون کے نام بھی گیا ہوگا ۔ میرے نام کا الگ ذاتی خط نہ تھا ۔

جون ۱۳ء سے خدا خدا کر کے ہمدرد نکلنے لگا ۔ اور اردو صحافت کی تاریخ مین ظاہری ، معنوی دونون حیثیتون سے گویا ایک نیا باب کھل گیا ۔ مین نے اپنے عریضہ مین لکھ دیا تھا (جیسا کہ اس کے کئی مہینہ قبل شرر صاحب کو بھی لکھ چکا تھا) کہ برکلے کی "برکلی" کے ترجمہ کے اجزاء ، قسط وار اشاعت کے لیے حاضر کرسکتا ہون ۔ ۲۴ جون کا لکھا ہوا خط قاضی عبدالغفار مرادآبادی سب ایڈیٹر کے قلم سے ، حسب ذیل موصول ہوا :۔

" جناب بندہ ۔ تسلیم ۔ عنایت نامہ وصول ہوا ۔ یاد فرمائی کا شکریہ قبول فرمایئے ، اپنے جس مضمون (ترجمہ) کا جناب حوالہ دیتے ہین ، وہ ضرور عنایت فرمایئے ، اور بلا تاخیر عنایت فرمایئے ۔ ہمدرد کا نصب العین یہی ہے کہ بھرتی کے مضامین سے پاک رہے ، اور علمی مضامین کا انبار لگا دے جس سے پبلک کے معلومات مین اضافہ ہو ۔ یہ آپ کی عنایت ہے اور مین اس کا مشکور ہون کہ آپ ہمدرد کو اپنے مضامین کے قابل سمجھتے ہین ۔ مین جانتا ہون کہ ہمدرد مین ابھی اصلاح

اور ترقی کے لیے بہت گنجایش ہے۔ مگر مجھے قوی امید ہے کہ اگر قابل اہل قلم میسر آجائیں تو جہاں تک ترتیب اخبار کا تعلق ہے، انشاء اللہ ہمدرد قابل اعتراض نہ ہوگا۔ لغو گوئی کا جو ایک خاص انداز اردو اخبارات نے پیدا کر دیا ہے اُس کی بیخ کنی ہمدرد کے فرائض میں داخل ہے۔ محمد علی صاحب کو آپ کے مضامین کا نہایت اشتیاق ہے۔ اور انھوں نے مجھے تاکید کی ہے کہ ان کی جانب سے میں آپ سے عرض کروں کہ اگر فرصت ہو تو دو چار دن کے لیے دہلی تشریف لائیے۔ محمد علی صاحب کے مہمان عزیز ہوجئے، تاکہ آپ سے تفصیلی گفتگو کا موقع ملے، اور ہمدرد کے مستقبل کے متعلق بہت سے معاملات کا تصفیہ ہو سکے۔ اگر جناب اس دعوت کو قبول کریں تو مجھے بتا دینا چاہیے کہ محمد علی صاحب ہر جولائی تک دہلی ہوں گے اور اس کے بعد باہر چلے جائیں گے۔ ڈاکٹر انصاری کی واپسی[1] پر وہ پھر دہلی میں ہوں گے، اور اپنے دوران قیام دہلی میں جب آپ تشریف لانا پسند کریں، وہ بڑی خوشی سے آپ کو اپنا مہمان بنانا چاہتے ہیں۔ امید کہ جواب سے جلد یاد فرمایا جاؤں۔ مہربانی فرما کر مضمون بہ واپسی عنایت فرمائیے۔

نیاز مند۔ بی۔ ایم۔ اے عفی عنہ

سب ایڈیٹر ہمدرد۔ (بہ خط انگریزی)"

ہمدرد کی داستان کا تسلسل ڈائری نویس کو بہت دور نکال لایا۔ "ذاتی" ڈائری میں ذاتی نقوش و تاثرات کے لیے اب پھر دو ایک سال قبل کی طرف واپس چلیے۔

---

[1] ڈاکٹر صاحب اس وقت محمد علی ہی کی تحریک پر اپنا مشہور طبی وفد لیکر جنگ بلقان کے زخمیوں کی تیمارداری اور علاج کے لیے ترکی گئے ہوئے ہیں۔

باب (۳)

۱۴-۱۹۱۳ء

اے در لبِ لعل تو اعجازِ مسیحائی!

(جلسہ مسلم یونیورسٹی کمیٹی۔ پہلی رسائی)

دسمبر ۱۳ء کی آخری تاریخین ہین۔ لکھنؤ کی قیصر باغ بارہ دری مین کانفرنس کا بڑے معرکہ کا سالانہ جلسہ ہو رہا ہے۔ "کانفرنس" سے مراد اس زمانہ کی بڑی اہم مجلس "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" ہے۔ لیکن کانفرنس سے بھی کہین بڑھ چڑھ کر ہنگامہ خیز و ہنگامہ پرور جلسہ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا ہو رہا ہے۔ کلکتہ کے "الہلال"، لکھنؤ کے مسلم گزٹ، کلکتہ اور دہلی کے کامریڈ کے مسلسل پُرجوش مقالات نے مسلمانون کے عام طبقہ مین پہلی بار بیداری اور خودداری کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ ابتک عوام اور حاضرین کا کام جلسون مین صرف "سمع و طاعت" تھا۔ یعنی تقریرون کا سننا، فصاحت بیان کی داد دینا، اور زیادہ سے زیادہ، ووٹ کیلئے ہاتھ اٹھا دینا۔ تجویزون کی تحریک و تائید اور فیصلہ صادر کرنا صرف لیڈرون کے لیے مخصوص تھا۔ آج مسلم پبلک (عامۃ الناس) نے غلط یا صحیح بہرحال پہلی بار طے یہ کیا تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے مسائل کو وہ خود ہی طے کرین گے۔ ایک طرف "تجربہ" تھا دوسری طرف "جوش"۔ اور انکی یہ پہلی معرکہ آرا جنگ قابل دید تھی۔ ایک طرف پرانے کارکنون کا یہ اصرار کہ گورنمنٹ

جن شرائط پر بھی یونیورسٹی کا چارٹر دے رہی ہو، قبول کرلیا جائے۔ دوسری طرف "آزاد خیالوں" کا یہ نعرہ کہ لیں گے تو یونیورسٹی اپنے شرائط پر لیں گے ورنہ نہ لیں گے۔ "علی گڈھ پارٹی" کے دوسرے بزرگوں کے لیے تو اسٹیج پر آنا اور زبان کا کھولنا ہی دشوار تھا۔ ادھر وہ نمودار ہوئے نہیں، کہ اُدھر جلسہ نے ان کے خلاف طرح طرح کے آوازے کسنے اور نعرے لگانے شروع کیے نہیں! صاحبزادہ آفتاب احمد خان مرحوم اس جماعت میں سب سے زیادہ سنجیدہ اور سلجھی ہوئی تقریر کرنے والے خوش بیان مقرر تھے۔ ان کی متین، مدلل و فصیح تقریر بھی جلسہ کو مطمئن کرنے میں ناکام رہی۔ قوم نے یہی بہت کیا کہ انکی تقریر کو صبر و سکون کے ساتھ سن لیا۔ ایک جوش و تلاطم ہر سو برپا تھا، اور وقت کا ہر لمحہ "باغیوں" کے سردار، مولانا ابو الکلام آزاد (صاحب "الہلال") کی فتحمندیوں کو نمایاں سے نمایاں تر کرتا جا رہا تھا۔ اور محمد علی کا شمار بھی اسی جماعت میں تھا ——— اجلاس اس منزل پر پہنچ کر دوسرے دن کے لیے ملتوی ہو رہا۔

رات فریقین نے خدا جانے کن کن امیدوں اور آرزوؤں، کن کن اندیشوں، اور مایوسیوں کے ساتھ، اور کہیں کہیں پردہ کارروائیوں میں گزاری۔ اجلاس شروع ہوا تو آج قیادت کا عَلَم بجائے الہلال کے کامریڈ کے ہاتھ میں تھا۔ محمد علی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو سارا جلسہ پیکر اشتیاق و انتظار تھا۔ محمد علی کی انگریزی انشاء و تحریر کا لوہا سارا ہندوستان مانے ہوا تھا، لیکن تقریر کی ابتک کوئی خاص شہرت نہ تھی۔ ایڈیٹر کی حیثیت سے اتنے ہی دنوں میں محمد علی کا سکہ ملک بھر پر بیٹھ گیا تھا۔ لیکن لیڈر کی حیثیت سے محمد علی کا شمار ابھی صفِ اول میں نہ تھا۔ ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن کو ابھی ابھی ان ہی نے ترکی و

بلقان روانہ کیا تھا۔ اس جلسہ مین جب تقریر کو کھڑے ہوئے تو وہی طبی وفد والی خاکی وردی زیب تن تھی۔ عمر کی طرح صحت بھی شباب پر تھی۔ اور آواز اتنی بلند کر عمارت (قیصر باغ بارہ دری) کے ہر گوشہ مین صاف اور بے تکلف پہنچ جائے ——— محمد علی کی لیڈری (قیادت) کا یہ پہلا امتحان تھا۔

تقریر شروع ہوئی۔ اس مین نہ مولانا ابو الکلام کا جوشِ خطابت اور الفاظ کی طلسم بندی تھی، اور نہ آفتاب احمد خان مرحوم کی متانت استدلال۔ بلکہ شروع سے آخر تک اپنی ذاتی ذمہ داری اور ضمانت کی تحریک تھی۔ محمد علی نے نہ دلائل منطقی سے کام لیا، نہ خطابت کا حربہ چلایا۔ بس اپنے کو صداقت واخلاص کے ساتھ قوم کے آگے پیش کر دیا۔ خلاصۂ تقریر یہ تھا کہ "بحثا بحثی بہت ہو چکی، آپ لوگ بیشک یونیورسٹی چارٹر کو آنکھ بند کر کے نہ قبول کرلین، یقیناً اپنے ہی شرائط پر لین، لیکن شرائط کی تفصیل و تعین کے لئے تو یہ بڑا جلسہ موزون نہیں۔ یہ کام ایک چھوٹے سے وفد کے سپرد کیجئے، وہ آپ کا نمائندہ ہو کر گورنمنٹ سے نپٹ لیگا۔ اس وفد مین مجھکو رکھیے، اور مجھ پر اور میرے رفیقون پر اعتماد رکھیے۔ آپ سے "سادہ چک" مانگنے کھڑا ہوا ہوں، آپ میری ساکھ پر سادہ چک دیجئے۔ رقم کی خانہ پُری میرے اوپر چھوڑیئے"۔ تقریر جس حد تک موثر و کامیاب رہی، اُس کی توقع شاید خود مقرر کو بھی نہ رہی ہو۔ مخالفانہ نعرے اور آوازے رُکے، پیشانیون کے بل مٹے، اور تجویز تالیون کی گونج اور مسرت کے جوش مین پاس ہو گئی ——— محمد علی پہلے امتحان مین کامیاب ہوئے۔ اور بگڑے ہوئے جلسون کے سنبھالنے کا جہان تک تعلق ہے کامریڈ کے ایڈیٹر کا نام بھی مسلمان لیڈرون کی صفِ اول مین آنے لگا۔

عین یہی زمانہ تھا کہ والد مرحوم کی خبر وفات عین حج کے بعد مکہ معظمہ سے موصول ہوئی۔

ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ——— ہائے، کیا چیز ناداری بھی ہوتی ہے!

سوال یہ یک بیک نظر کے سامنے آگیا کہ اب روزمرہ کا خرچ کیسے چلے گا، اور آئندہ تعلیم جاری رکھنے کی کیا صورت ہوگی؟ آگے چل کر تو اس سوال کو اللہ نے راجہ صاحب محمود آباد مرحوم کے ہاتھوں ایک بڑی حد تک حل کرا دیا، لیکن معاً اس وقت نظر ہمدرد ہی پر پڑی کہ اسی سے علمی مضامین کے لیے کوئی مستقل ماہانہ معاوضہ طے کر لیا جائے۔ تلاش ہمدرد کے مالک کی ہوئی۔ کہ ان ہی سے زبانی معاملت کر لی جائے۔ جلسہ گاہ کے اندر محمد علی شاگردوں، معتقدوں، مداحوں کے جھرمٹ میں آتے ہوئے دکھائی دیے۔ اجنبی ہونے کے باوجود بڑھ کر قریب پہنچا اور عرض کی کہ کچھ وقت دیجئے۔ الگ کچھ عرض کرنا ہے۔" نرمی اور ہمدردی کے لہجہ میں بولے "الگ وقت کہاں سے لا سکتا ہوں۔ یوں ہی چلتے پھرتے جہاں چاہیے پکڑ لیجئے، اور جو کچھ کہنا ہو فرما ڈالیے۔" ——— محمد علی کی مانگ اب ہر طرف بڑی رہنے لگی تھی۔ اس کا اندازہ اسی وقت ہوا۔

بی۔ اے۔ لکھنؤ سے وسط ۱۳ء میں کر لیا تھا۔ ایم۔ اے (فلسفہ) کی تحصیل کا کام پہلے علی گڈھ اور پھر چند روز کے لیے سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں کی۔ اور اب شروع ۱۴ء میں تلاش معاش شروع ہوئی۔ مدتوں خبط یہ رہا کہ کسی کالج (اور کسی کیوں، اپنے ہی پرانے کیننگ کالج) میں فلسفہ پڑھانے کی جگہ حاصل کر لیجئے۔ کامیابی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ محکمہ ریلوے میں ایک نیا نیا ذرا اونچا عہدہ اسسٹنٹ ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کے نام سے کھلا تھا، نیت اس طرف گئی۔ اونچی ملازمتوں کے لیے ذرا اونچی سفارشیں اس وقت بھی لازمی تھیں۔ تقرر ریلوے بورڈ کے ممبروں اور عہدہ داروں کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں تک اپنی

رسائی کہاں۔ ہمارے بارہ بنکی کے ایک وکیل اور علی گڈھ کے نامور گریجویٹ شیخ ولایت علی مولوی مرحوم۔ محمد علیؒ کے خاص الخاص دوستوں، رفیقوں، معتقدوں میں تھے۔ "بمبوق" کے عجیب اور فرضی نام سے ان کے ظریفانہ مضمون کامریڈ کے کالموں میں انگریزی کی بہترین انشاپردازی کے ساتھ نکلتے رہتے تھے۔ اردو میں بھی کبھی کبھی لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے صلاح دی کہ "دلی چلے جاؤ۔ محمد علی کے نام تعارف نامہ لکھے دیتا ہوں۔ اُن سے دلی کے اعلیٰ حکام سے تعلقات ہیں۔ ریلوے بورڈ والوں سے بھی ضرور ہوں گے۔ وہ ان لوگوں سے ملا دیں گے۔"

سنہ ۱۲ء میں برسات کا موسم تھا، اور رمضان کا مہینہ جب یہ اپنی خالص ذاتی غرض لیکر دلی پہنچا۔ اسٹیشن سے سیدھا دفتر ہمدرد، کوچۂ چیلاں کے لیے تانگہ کیا۔ فاروقی صاحب دیوانہ گورکھپوری اب عرصہ ہوا ہمدرد میں آچکے تھے، اور "تجاہل عاشقانہ"؎ میں لگے رہتے تھے۔ اُن سے پرانی شناسائی علیگڈھ کے زمانہ کی تھی۔ وہ ریاضیات میں ایم۔ اے ہوچکے تھے جب میں ایم۔ اے کرنے علی گڈھ پہنچا تھا۔ انھیں کھوج لگا کر ساتھ لیا۔ وہیں دفتر کے متصل ہی رہتے تھے۔ اور انھیں ہمراہ لے ڈرتے ڈرتے محمد علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا —— باقاعدہ ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔ وقت کی ایک مشہور شخصیت کے سامنے جاتے ہوئے، وہ بھی تمامتر اپنی ایک غرض لیکر، حجاب اور خوف کا احساس ہونا ایک حد تک طبعی تھا، اور پھر مجھ جیسے شرمیلے اور ملاقات چور نوجوان کے لیے

؎ یہ ہمدرد کے ایک مستقل ظریفانہ کالم کا عنوان تھا۔ ڈاکٹر فاروقی صاحب ہی اسے لکھتے تھے۔

باب (۴)

سنہ ۱۹۱۴ - ۱۶ء

(نظر بندی ، ملاقات ، مراسلت)

صبح سویرے کا وقت تھا، اور رمضان کا مہینہ۔ مین فرنگی الحاد مین غرق، مجھے اُس زمانہ مین رمضان سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا۔ ہمدرد و کامریڈ کے دفتر کوچہ چیلان مین ایک خاصی عالیشان عمارت مین تھے۔ ٹھیک اس کے مقابل، سڑک کے اس پار ایک مکان اوسط درجہ کی حیثیت کا اور تھا۔ محمد علی صاحب اس مین رہتے تھے، اور وہین میری حاضری ہوئی۔ کمرہ معمولی سا، اور بجز ایک مختصر سیتل پاٹی کے ہر قسم کے فرنیچر سے مُعرا۔ نہ میز نہ کرسی، نہ کوچ نہ صوفے۔ اس جانماز نما سیتل پاٹی پر ٹھیٹھ ہندوستانی قسم کا کرتا، پاجامہ پہنے ہوئے کامریڈ کا ایڈیٹر بیٹھا ہوا! اور چند سخت مذہبی قسم کے مسلمانون سے جامع مسجد کے انتظامات فرش و شامیانہ سے متعلق بحث و گفتگو مین سرگرم! ——— مین دور سے کامریڈ پڑھنے والا اور محمد علی کی آکسفورڈ کی ڈگری سے مرعوب، اس سادگی اور اس اسلامیت اور مشرقیت کے منظر کا تصور بھی نہین کر سکتا تھا۔ اپنی انگریزیت پر قیاس کر کے سمجھ رہا تھا کہ مکان اور مکین دونون صاحبیت اور فرنگیت کا مکمل نمونہ ہون گے!

وہ لوگ رخصت ہوئے اور اب میری پیشی ہوئی۔ محبت اور تپاک کا برتاؤ پہلے

شروع ہوگیا۔ ہمبوق مرحوم کا خط لیکر پڑھا، اور زیادہ ملتفت ہوگئے۔ ذرا دیر کے بعد اٹھے، اور سڑک پار کرکے، بالا خانہ پر اپنے دفتر کے کمرہ مین لائے۔ یہان کی شان دوسری تھی، ڈرائنگ روم، کچھ انگریزی اور کچھ ترکی وضع کے بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ۔ کوچ اور کرسیان، گدے اور قالین۔ اور دیوار تصویرون سے مرصع! ۱۴ء کا محمد علی اب ۱۳ء کا محمد علی نہ تھا۔ بڑھی ہوئی سیاسی آزاد خیالی اور ترکون سے (جن کے کاندھون پر اُس وقت تک خلافتِ اسلامیہ کا بھی بار تھا) روز افزون ہمدردی دیکھ کر انگریز کھٹک گئے تھے۔ اور اب محمد علی کی وہ پوچھ گچھ، وہ قدر و منزلت اعلیٰ حکام مین باقی نہین رہی تھی۔ دیر تک تفصیل کے ساتھ اپنی سعدوریان بیان کرتے رہے۔ گویا میرا کام نہ نکال سکنے پر شرمندہ و محجوب تھے۔ اور اور باتین بھی اِدھر اُدھر کی خوب کین۔ سیاسیات ادبیات، لطائف و ظرائف سبھی کچھ۔ اچھی انگریزی لکھنے والے ہندوستانیون کا ذکر آیا۔ رائٹ آنریبل سید امیر علی، عبد اللہ یوسف علی، اور آر۔ سی۔ دت کے نام اب بھی یاد پڑ رہے ہین۔ اس پہلی ہی ملاقات مین محمد علی نے ان ہندوستانیون سے اپنی پوری بیزاری کا اظہار کر دیا، جو انگریزیت کے شوق مین خود بھی انگریز یا نیم انگریز بن گئے تھے۔

دوپہر کے کھانے کا وقت آگیا۔ اور باوجود خود روزہ دار ہونے کے مجھ سے کھانے کے لیے صرف کہا ہی نہیں، بلکہ اصرار دیر تک جاری رکھا۔ پہلی ہی ملاقات مین ایسے گھل مل گئے، کہ جیسے برسوں کی پرانی شناسائی ہے۔ میری واپسی شام کی گاڑی سے ہوئی۔ اس سے بہ اصرار روکتے رہے۔ اور یہ مشرقی مہمان نوازی کی ایک دیرینہ سنت ہے ———— ہمارے لیڈروں کے اخلاق پبلک کے سامنے جیسے بھی کچھ ہوں، نجی کی زندگی مین اس سادگی، اس اخلاص، اس بے تعصبی کی مثالیں اس سے قبل تو کیا

دیکھنے میں آئیں، اس کے بعد بھی کمتر ہی ملیں۔

کامریڈ کی دھوم تو مچی ہوئی تھی ہی، ہمدرد نکلا تو اس کی بھی دھوم مچ گئی۔ بڑے چھوٹے سب اس کے گرویدہ۔ لیکن محمد علی کا قدم اب روز بروز اسلامیت کی طرف اور زیادہ ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ مئی ۱۳ء میں شہر کانپور میں ایک سڑک نکالنے کے سلسلہ میں میونسپلٹی اور کلکٹر نے ایک مسجد کے غسل خانہ کو گرا دیا، اور اس پر جب مسلمانوں نے اپنے پرجوش احتجاج کا مظاہرہ کیا، تو ان کے مجمع پر گولیاں تک چل گئیں۔ بڑا ہنگامہ برپا ہوا۔ اور اسکے لیڈروں میں محمد علی بھی تھے۔ کامریڈ نے اپنے احتجاجی اور تنقیدی مضامین مین کلکٹر تو الگ رہے۔ خود صوبہ کے حاکم اعلیٰ سر جیمیس مسٹن کی بھی خوب خبر لے ڈالی۔ حکام اس وقت یوں بھی مسلمانوں کی زبان سے کسی کڑوی نکتہ چینی کے عادی نہ تھے۔ اور پھر یہ سر جیمیس مسٹن تو محمد علی کو اپنا بڑا پرانا "یار وفادار" سمجھ رہے تھے۔ قدرۃً بہت بگڑے۔ ادھر جنگ بلقان کے سلسلہ مین ٹرکی کی ہمدردی میں بھی محمد علی پیش پیش۔ اور اب چہرہ پر داڑھی بھی! ——

یہ سب تو تھا ہی کہ نومبر ۱۴ء میں یورپ کی پہلی جنگ عظیم میں ٹرکی بھی جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے برطانیہ کے مقابل آگیا۔ اور کامریڈ نے اپنے ایک بڑے لمبے اور بڑے زوردار مقالہ میں جو Choice of The Turks کے زیر عنوان ٹائمس (لندن) کے ایک مقالہ کے جواب مین تھا، ترکوں کو اپنے اس انتخاب مین معذور ٹھہرایا۔ یہ شرارہ غضب کا تھا۔ حکام انگریز اب کیسے اور کبتک درگزر سے کام لیتے۔ کامریڈ فوراً بند، اور محمد علی فوراً نظر بند ہوئے —— وہی محمد علی جو ابھی سال دو سال قبل تک بڑے بڑے حکام کی آنکھوں کے تارے اور منظور نظر بنے ہوئے تھے!

یہ نظربندی پہلے تو دہلی کے قریب مہرولی (درگاہ قطب صاحبؒ) ہی مین رہی۔
اس کے بعد دونون بھائی (آہ، وہ شوکت علی و محمد علی کا ضرب المثل اتحاد، اُس وقت تک
یکجان و دوقالب کا صحیح نمونہ!) نجیب آباد کے آگے لینسڈون کے پہاڑی مقام پر منتقل کر دیے
گئے۔ اور یہاں سے نومبر ۱۵ء میں چھندواڑہ (سی۔پی) بھیجے گئے۔ راستہ لکھنؤ ہو کر تھا۔
اودھر سے صبح کی گاڑی سے گذرے۔ اُس وقت سرکار کے ان "باغیون" سے ملنا بھی جرم کی سی
اہمیت رکھتا تھا۔ اس پر بھی اسٹیشن پر خاصہ مجمع مشتاقان دید کا ہوگیا۔ اور انھی میں یہ خاکسار
بھی تھا۔ دونون بھائی ایک ایک سے لپٹ لپٹ کر ملتے تھے، اور ہر کس وناکس کے آگے گویا بچھے
جاتے تھے۔ شوکت صاحب کی نظر تو مین بچا گیا، کچھ تو اپنے اُس شہر میلے پن اور جھپ کی بنا پر
کہ وہ میرے لیے اجنبی ہیں، ان سے کیا ملوں، اور کچھ اپنے اُس وقت کے اس ملحدانہ "پندار
تفوق" کی بنا پر بھی، کہ شوکت علی کا علمی پایہ میرے برابر کا نہیں، اُن سے ملنے مین اپنی کسرشان
ہے!——— آج اپنی ان حماقتون پر جتنی بھی نفرین کرلوں، اس وقت اپنی ۲۲، ۲۳ سال
کی عمر میں ان ہی کو عین سرمایہ دانش و خودداری سمجھ رہا تھا!——— محمد علی سے ملاقات
رہی۔ کوئی خاص بات اس وقت لوحِ حافظہ پر محفوظ نہیں۔

۱۵ء ختم ہو رہا تھا کہ نفسیات اجتماعی کے ایک مبحث پر اپنی ایک کتاب انگریزی میں
"سایکالوجی آف لیڈرشپ" کے عنوان سے لندن مین، اُس وقت کے ایک نامور پبلشر
ٹی، فشر انون (T. Fisher, Unwin) کے اہتمام سے نکلی۔ اور دل نے اس
پر بڑا ہی فخر محسوس کیا۔ ۱۶ء میں کچھ کاپیاں ہندوستان پہنچیں۔ اخبارات نے برطانیہ
اور ہندوستان دونون مین خوب ریویو کیے۔ بعض نے بڑے مداحانہ، اکثر نے بین بین

اور دو ایک نے مخالفانہ۔ مین نے بعض اقتباسات اشتہار مین چھپوا کر کچھ لوگون کے پاس بھجوا دیے۔ اور ان مین ایک امتیازی نام چھندواڑہ کے نظربند محمد علی کا بھی تھا۔ دل نے کہا کہ "واہ اگر ان سے نہ ملی، تو کچھ نہ ہوا۔ اشتہار دیکھ کتاب یقیناً منگائین گے، اور داد بھی دل کھول کر یقیناً دین گے"۔ اشتہار گیا، اور چند ہفتون بعد اس کا اثر اس عنایت نامہ کی شکل مین ظاہر ہوا۔ خط انگریزی میں تھا، اور ہونا ہی چاہیے تھا۔ ذیل مین اُس کا ترجمہ پیش ہو رہا ہے

"چھندواڑہ۔ سی، پی ۲۳ مئی ۱۹۱۶ء

مکرم۔

کوئی مہینہ بھر ہوتا ہے کہ انگریزی کتاب "سایکالوجی آف لیڈرشپ" (مطبوعہ ٹی فشر ان ون لندن) کا ایک اشتہار موصول ہوا تھا۔ لفافہ کے اندر سوا اس اشتہار کے اور کچھ نہ تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اشتہار آپ کے ایما سے یا کم از کم آپ کے علم مین میرے پاس روانہ کیا گیا تھا۔ اگر کتاب آپ ہی کی تصنیف ہو تو یقیناً دلآویز ہوگی۔ متعدد ولایتی اور ہندوستانی اخبارات کی مدحیہ رائیں اس اشتہار مین پڑھ ہی چکا تھا کہ ایک مفصل ریویو مسز بسنٹ کے روزنامہ "نیو انڈیا" (مدراس) میں نظر سے گزرا، جو بہت ہی مداحانہ تھا۔

اچھا۔ تو میں اب بجائے مشتہر صاحب کے براہ راست آپ ہی کو لکھتا ہون کہ کتاب کی ایک کاپی میرے نام وی، پی بھجوا دیجئے۔ اس وی پی کی فرمایش کو کتاب کا نسخہ مفت ہاتھ آنے کے لیے حسن طلب نہ سمجھیے گا۔ مجھے یہ دل سے ناپسند ہے کہ مصنف کے احباب اس سے کتاب وصول کرنے کی گھات میں رہیں۔ اب وہ زمانہ تو ہے نہیں کہ مصنفین غریب کو شاہانہ سرپرستیان حاصل ہون۔ کتابین اگر فروخت نہ ہون تو آخر طبع و اشاعت کے مصارف

کہاں سے نکلیں گے۔ اور اس میں اگر دوست احباب ہی بخل کرنے لگیں تو پھر امید کس سے رکھی جائے ؟

تھوڑا بہت وقت مجھے اس جبریہ تعطیل کے زمانہ میں مل جاتا ہے۔ اور سایکالوجی آف لیڈرشپ (نفسیاتِ قیادت) سے بڑھ کر موزون موضوع مطالعہ کے لیے ہو گا بھی کیا خصوصاً اس لیے کہ آج ہندوستان میں کوئی قابل ذکر لیڈر رہے ہی نہیں [1]۔ خدا معلوم آپ نے ہمارے پیغمبر (روحی فداہا) کی سیرت کا مطالعہ قائد اعظم کی حیثیت سے کیا ہے یا نہیں۔ مکہ کو فتح کرنا جانی دشمنوں کے حق میں "لاتثریب علیکم الیوم" کے مشہور فرمان کے ساتھ، اور انصار مدینہ سے آں بغیر کشت و خون والی اور بغیر مال غنیمت والی فتح کو قبول کرا لینا، یہ قیادت کے عظیم الشان کارنامے ہیں [2]۔ لیکن یہ سب میں قبل از وقت لکھنے لگا، پہلے کتاب تو دیکھ لوں، پھر رائے قائم کروں۔

جملہ احباب کی خدمت میں سلام

مخلص محمد علی"

مراسلت کی باقاعدہ بنیاد اسی خط سے پڑتی ہے۔

---

[1] خیال رہے کہ یہ زمانہ گاندھی جی کے دَور سے بہت پہلے کا ہے۔

[2] میں اُس وقت دَورِ الحاد سے گزر رہا تھا، اور رسولِ خدا کی عظمت کیا معنی سرے ہی سے خدا ہی کی عظمت سے دل خالی تھا! محمد علی میرے اس مرض سے ایک تو کچھ زیادہ واقف بھی نہ تھے، اور پھر جس حد تک واقف تھے بھی، دینی تبلیغ کے جوش اور دھن میں اس کی پروا ہی کب کرتے تھے۔

باب (۵)

۱۹۱۶ء سنہ (۱)

(نظربندی - مراسلات)

چھندواڑہ "سی، پی کا" "شہر" جغرافی حیثیت سے ہو تو ہو، اُس وقت ملک میں کسی گاؤں یا دیہات ہی کی طرح گمنام تھا۔ لوگوں کے کان میں پہلی بار اس کا نام جبھی پڑا، جب علی برادران وہاں نظربند کیے گئے ـــــــ یوسف علیہ السلام نہ ہوتے تو آج کنعان کی یہ شہرت شعر و ادب کی دنیا میں کہاں سے ہو گئی ہوتی؟ ـــــــ اب چھندواڑہ کا نام ایک ایک کی زبان پر تھا۔ اور عوام تو نہیں، لیکن پڑھے لکھوں اور خواص میں جسے دیکھیے علی برادران کی زیارت کے لیے کھنچا ہوا چھندواڑہ پہنچ رہا ہے۔ اور پھر خالی ہاتھ بھی نہیں دل کی عقیدت و اخلاص کے نذرانہ کے ساتھ ساتھ، مادی اعتبار سے بھی کوئی پھلوں کی ٹوکری ساتھ لیے اور کوئی مٹھائی کی ہانڈی۔ کوئی ٹوپی یا چھڑی پیش کر رہا ہے، اور کوئی پاتابہ اور جوتا۔ چھندواڑہ کیا ہوا، گویا ویرانہ میں کسی بزرگ کی درگاہ خلقت کے لیے زیارتگاہ۔ اور محمد علی اور انکے بھائی زندہ پیر! محمد علی کا خاص مشغلہ اس وقت تلاوت قرآن مجید تھا۔ حافظہ ماشاءاللہ یوں بھی بہت قوی تھا، پھر قرآن کو جو بار بار پڑھا، اور جھوم جھوم کر ذوق و شوق کے ساتھ پڑھا، تو قرآن مجید ایک بڑی حد تک انھیں حفظ ہی ہو گیا، اور محمد علی کہنا چاہیے کہ نیم حافظ تو

ہو ہی گئے۔ یعنی جس طرح بندش کو حافظہ کرنے کے دوران میں قرآن کچا کچا یاد رہتا ہے، انھیں بھی بر زبان ہی سا ہو گیا تھا، اور اس دور زندانی کی یہ برکت اخیر عمر تک قائم رہی۔

تلاوت قرآن اور حدیث وسیرت نبوی وغیرہ کے مطالعہ سے جو وقت بچتا، وہ زائروں اور مہمانوں کی خاطرداری میں صرف ہوتا۔ محمد علی غضب کے مہمان نواز اور دوست پرست تھے۔ اچھا کھانے کے بڑے شوقین لیکن اس سے بھی زیادہ دوسروں کو اچھا کھلانے کے حریص۔ قرض لیں یا کسی سے مانگ کر لائیں، بہر حال دوستوں کو کھلانا اور خوب ہی کھلانا فرض۔ جو ان کے مہمان نہ بھی ہوتے، انھیں بھی پکڑ پکڑ لاتے، اور ٹھونس ٹھونس کر انھیں کھلاتے ضرور۔ بذلہ سنج ایسے کہ روتے ہوؤں کو بے ہنسائے نہ رہیں۔ رقیق القلب اتنے کہ بات بات پر، بلکہ بلا بات کے بھی، آنسوؤں کے دریا بہا دیں۔ شخصیت ایسی جامع وہمہ گیر کہ دینی، تاریخی، ادبی، سیاسی، شعری ہر موضوع سے یکساں دلچسپی، اور سب پر یکساں تیار۔ طبیعت ہر وقت حاضر۔ کوئی تذکرہ کسی قسم کا چھڑ جائے، تو بس، اب ختم ہونے ہی کو نہیں آتا۔ ان محفل طرازیوں سے کبھی جب فرصت ملتی، تو دور افتادہ دوستوں، عزیزوں کی یاد آتی، اور ان کے آئے ہوئے خطوں کے جواب کی طرف توجہ ہوتی۔ اور وہی زندہ شخصیت خطوط میں جھلکتی رہی۔ ہر خط ایک پند نامہ لیکن خشک ذرہ بھر بھی نہیں، بلکہ حد کمال تک دلکش وشگفتہ۔

خط لکھنے کے زیادہ عادی نہ تھے، اور پابندی کے ساتھ لکھنے پر تو آخر عمر تک بھی قادر نہ ہو سکے۔ اوقات کے نظم وپابندی سے طبیعت فطرۃً بیگانہ تھی۔ اور اس کا خمیازہ ان لوگوں کو اٹھانا پڑتا، جو اپنے خطوط کے جوابات کے بہ پابندی وقت منتظر رہتے کئی کئی دن

کیا معنے، کبھی کئی ہفتے گزر جاتے کہ اچھے ضروری خط تک، جواب کی نیت و ارادہ کے باوجود، جیب کے اندر یا میز کی دراز میں پڑے کے پڑے رہ جاتے۔ اور جب دیکھتے کہ دیر بہت ہی زائد ہو چکی، تو بجائے خط لکھنے کے تار دیتے! نیت ہمیشہ، زبانی گفتگو کی طرح خطوط کے بھی خوب مفصل لکھنے کی رکھتے۔ ہجوم مشاغل کے درمیان اتنی فرصت قدرۃً شاذونادر ہی ہاتھ آتی۔ لیکن خط جب کبھی بھی لکھتے، حتی الامکان پچھلی انتظار کشی کا پورا کفارہ کر دیتے۔

محمد علی سے مراسلت رکھنا ایک نعمت تھی۔ جس کے پاس ان کے خطوط آتے وہ اپنے کو خوش قسمت سمجھتے، اور بڑے فخر و مباہات کے ساتھ اس کا ذکر دوسروں سے کرتے رہتے۔ مجھ سے ذاتی مراسلت ۱۹۱۶ء سے شروع ہوئی۔ پہلے دو ایک خط انگریزی میں آئے گئے۔ ان کی انگریزی انشاء پردازی تو خیر مسلّم تھی ہی، میں بھی اس زمانہ میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی لکھ لینے کی مشق رکھتا تھا۔ دو ہی ایک خطوں کے بعد میں نے زبان بجائے انگریزی کے اردو کر دی، اور میری ہی درخواست پر محمد علی نے بھی۔ لطیف نکتہ سنجیاں وہ جس طرح انگریزی میں کرتے، اردو میں بھی کرنے لگے۔ میں اس وقت تک مذہب میں غرق ہو چکے تھے، میں سر سے مذہب سے بیگانہ اور (معاذ اللہ) اسلام کا دشمن۔ ان کی ذات سے اپنی عقیدت و محبت جو کچھ تھی، وہ محض اُن کی ذہانت، ذکاوت، زورِ قلم اور انگریزی حسنِ انشاء کی بنیاد پر بستہ ۱۶ میں ایک بار اپنے نزدیک بڑی ہوا خواہی اور دلسوزی کے ساتھ انھیں یہ لکھا کہ آپ تو تاریخ کے جید عالم ہیں، یہ جبریہ فرصت کا زمانہ آپ خالی کیوں جانے دیتے ہیں۔ کیوں نہ کوئی کتاب تاریخ پر لکھ ڈالیے۔ جواب آیا (مراسلت کی زبان ابھی انگریزی ہی تھی) اور کتنا سچا آیا کہ "یہ وقت تاریخ نگاری کا نہیں، تاریخ سازی کا ہے۔ اغیار تاریخ بنا رہے ہیں،

اور آپ مجھے تاریخ لکھنے کی صلاح دے رہے ہیں۔ عالم اسلامی کی بربادیون نے دل ودماغ مین وہ سکون ہی کب قائم رہنے دیا ہے جو مین تصنیف وتالیف پر توجہ کر سکون"۔

اپنی زندگی کے اس دور مین اس جواب کی گہری سچائی کی کیا قدر کرتا۔ اس وقت آسے محض ایک ادبی لطیفہ سمجھ کر داد دی۔ اس کا احساس تو کئی سال بعد ہوا کہ عالم اسلامی خصوصاً خلافت ترکی کی بربادیون نے بیشک اس مسلم ہندی کا دل خون کر رکھا تھا۔ اور وہ جو کوئی شاعر محض اپنی شاعرانہ رو مین کہہ گیا ہے کہ

سارے جہان کا درد ہمارے جگر مین ہے،

یہ محمد علی کے ہان شاعری نہین، بلکہ عالم اسلامی کے حدود کی حد تک واقعہ تھی۔ دنیا کے کسی گوشہ مین پھانس کسی مسلمان کے جسم مین لگتی، اور اس کی چبھن محمد علی کے دل میں ہونے لگتی۔

جون ۱۹۱۳ئہ شروع ہی ہوا تھا کہ میرا عقد، خاندان مین ایک لڑکی کے ساتھ دستور خاندان کے خلاف میری خاص پسند اور شوق سے ہوا۔ اور عین اسی زمانہ مین علیگڈھ کے مشہور ومعروف کارکن، صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب نے از راہ محبت و قدر افزائی مجھے علیگڈھ بلایا، اور کانفرنس آفس مین لٹریری اسسٹنٹ (مشیر علمی) کے عہدہ پر مامور کر دیا۔ اور محمد علی سے مراسلت کا سلسلہ دراصل یہیں آکر شروع ہوا۔ پڑوس مین منشی انوار احمد ماہرو زبیری اور منشی محمود احمد عباسی امروہوی رہتے تھے۔ یہ دونون بھی کانفرنس آفس مین منسلک تھے، اور محمد علی کے بڑے معتقد۔ (اور اس زمانہ مین کون پڑھا لکھا مسلمان انکا معتقد نہ تھا؟) جس روز ڈاک مین محمد علی کا کوئی مکتوب ہوتا، وہ گویا یوم عید ہوتا۔ خط سلطان جہان منزل (دفتر کانفرنس) کے ہال مین بہ آواز بلند پڑھا جاتا، اور یہ دونون صاحب اپنا کام

چھوڑ چھاڑ اسی طرف متوجہ ہو جاتے ——— محمد علی کو دنیا اس وقت تک صرف انگریزی کا ادیب جانتی تھی ۔ جوہر کی اردو شاعری کے جوہر سے کوئی بھی واقف نہ تھا ۔ یہ امر میرے فخر کے لیے کافی ہے کہ ان کے اس جوہر کا انکشاف سب سے پہلے میرے ہی نام کے ایک عنایت نامہ میں ہوا ، اور پھر میں نے ہی اسے خوب پھیلایا ۔ جس روز ان کے خط میں کوئی غزل نامہ آتا ، ایک ایک شعر پہ واہ واہ کی دھوم مچتی ، اور دفتر کا خشک کاروبار کچھ دیر کے لیے بزم مشاعرہ کی چہل پہل میں تبدیل ہو جاتا ۔ پورے پورے مکتوب تو انشاء اللہ آیندہ ملاحظہ میں آئیں گے ۔ دو چار پھڑکتے ہوئے شعر ابھی اور اسی منٹ سن لیجیے ——— حالی کی غزل ' وفا کے بعد ' سزا کے بعد ' پر غزل کہی ، اور کیا خوب کہی ۔ مطلع لاثانی تھا ؎

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ——— ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو میں گویا ضرب المثل بن گیا ہے ؎

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے ——— اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اور اس شعر نے خدا معلوم کتنے کشتگانِ یاس کو بارانِ رحمت کے چھینٹوں سے زندہ کر دیا ؎

اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل ——— ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

عاشقانہ رنگ میں یہ چوٹ بھی کیا برابر کی کر ڈالی ہے ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے ——— میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

غالب کی مشہور غزل " تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی " پر یہ غزل کہنا بھی جوہر ہی کا کام تھا ؎

خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی ——— اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا ، اور سہی

ربِ عزت کیلئے بھی کوئی رہنے دو خطاب — تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی
ہم وفاکیشوں کا ایمان بھی ہے پردۂ عصمت — شمعِ محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

گفتگو پُرلطف سہی لیکن بہرحال بے ترتیب شروع ہوگئی۔ ذکر تو ابھی کچھ قبل یہ ہوا تھا کہ ۲۳ مئی سنہ ۱۲ء کے خط مین محمد علی نے میری کتاب "سائیکالوجی آف لیڈرشپ" طلب فرمائی تھی۔ سوال قدرۃً یہ ذہن مین پیدا ہوتا ہے کہ اس فرمایش کا حشر کیا ہوا؟ حشر یہ ہوا کہ کتاب پہلی ڈاک سے ہدیۃً ان کی خدمت مین بھجوا دی گئی۔ اور جب جون کا مہینہ بھی گزر گیا اور کتاب پر کوئی رائے نہ موصول ہوئی، تو دل مین ایک بےچینی سی رہنے لگی۔ کیا کتاب نہین پہونچی؟ پہونچی، مگر اتنی ناپسند ہوئی کہ اس پر اظہار رائے سے گریز کیا گیا؟ یا اور کوئی بات ہوئی؟ غرض طرح طرح کے وسوسے دل مین آنے لگے، اور آخر شروع جولائی مین ایک تقاضا کا خط لکھا، جس مین یہ فقرہ بھی تھا کہ "آپ ملک کے ان گنے چنے چند افراد مین ہین جن کی رائے اور تبصرہ کی مین وقعت کرتا ہون"۔ جواب آیا، اور اتنا مفصل کہ مکتوب کے بجائے رسالہ بن گیا۔ اگلے باب مین تمام و کمال اسی کو ملاحظہ کیجئے۔ یہ یاد رہے کہ مراسلت ابھی اردو مین نہین شروع ہوئی تھی۔ کتاب انگریزی مین، میرا خط انگریزی مین، تبصرہ بھی قدرۃً انگریزی مین۔ آگے ظاہر ہے کہ خط بجنسہٖ نہین بلکہ اس کا ترجمہ نقل ہو رہا ہے۔

باب (۶)

سنہ ۱۹۱۶ء (۲)

(نقادی ۔ نظربندی ۔ شاعری)

(دستخط سنسر) یکم اگست ۱۶ء
چھندواڑہ ۔۔ ۲۰ جولائی ۱۶ء

مکرمی ! جی ہاں جیسا کہ آپ نے یاد دلایا ہے، آپ کی "سایکالوجی آف لیڈرشپ" میرے پاس میری ہی فرمایش پر آئی ہے۔ اور آپکے اس فقرہ کو میں اپنے لیے باعثِ عزت افزائی سمجھتا ہوں کہ میں ان گنے چنے چند لوگوں میں سے ہوں، جن کے تبصرہ کی آپ کوئی پروا اور وقعت رکھتے ہیں۔ کتاب اگر ہدیۃً نہ موصول ہوئی ہوتی جب بھی اغلب یہ ہے کہ میں اس کے موضوع پر ضرور آپ کو کچھ لکھتا۔ لیکن اخبارات میں میں نے پڑھا کہ آپ کی شادی ہوئی اور آپ معاً بعد موٹر میں کہیں باہر جشنِ عروسی منانے روانہ ہو گئے۔[1] اور میں نے خیال کیا کہ کم از کم "ماہ جشن" بھر تو "فلسفۂ محبت" کے آگے "فلسفۂ قیادت" کا تذکرہ بہت ہی بے محل و نامناسب ہوگا۔ اس لیے اب تک خاموش رہا۔ امید ہے کہ یہ عذر مقبول ٹھہرے گا۔

خیر اب سہی۔ کتاب مصنف کی جس غور و فکر، وسعتِ مطالعہ اور زبردست

---

[1] عقد لکھنؤ میں ۳ جون کو ہوا تھا، اور اس کے دوسرے ہی دن ہم میاں بیوی دریاباد کیلئے روانہ ہو گئے تھے، رخصتی کی سادہ اور ہندوستانی تقریب انگریزی اخباروں میں جاکر "ہنی مون" بن گئی۔ مولانا نے اس خبر کو پڑھا تھا۔

قوتِ مشاہدہ کی شہادت دے رہی ہے، اس کے لحاظ سے مین داد دیتا ہون۔ ہمارے پڑھے لکھوں سے غور وفکر کی طرح ذوق مطالعہ بھی عنقا ہو گیا ہے اور اتنا بھی مادہ باقی نہین رہا ہی کہ دوسرون ہی کے خیالات سمجھ کر پڑھ لیے جائین۔ لیکن آپنے اپنی مختلف واقعاتِ نفسیاتی کی جو مثالین درج کی ہین ان سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہاں صرف دوسرون کے خیالات پر اکتفا نہین کیا گیا ہے۔ مین داد وستایش کی زبان مین اور بہت کچھ لکھ سکتا ہون۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو مقصود میری "تقریظ" نہیں بلکہ "تنقید" ہے۔ آپ سے ملاقات ہوتی تو زبانی میں بہت تفصیل سے اپنے خیالات ناقص عرض کرتا۔ ایک خط کے حدود کے اندر ایک فلسفہ کی کتاب پر تفصیلی ریویو کیونکر آسکتا ہے۔ آپ کو صرف مختصر اشارات پر قناعت کرنا ہوگی۔ یہ محض خاکہ کے طور پر آئین گے۔ اور آپ غالباً ان سے یہ سمجھین کہ کتاب کا مطالعہ محض سرسری اور متفرق مقامات سے کیا گیا ہے۔ لیکن آپ یقین کیجئے کہ میں عموماً مطالعہ بہت آہستہ آہستہ کرتا ہون اور آپ کی کتاب کا بغور مطالعہ تو میں نے کئی دن مین کیا، بہر حال میرے منتشر نوٹ حسب ذیل ہین :-

۱- عبارت

موجودہ فلسفیانہ زبان پر آپ کو جو قدرت بلکہ عبور حاصل ہے، اس پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہون۔ بیان ہر جگہ صاف ہے اور جو شخص نفسیاتِ جدید سے واقف ہوا سے آپکے مفہوم کے سمجھنے مین کہین بھی دقت نہین ہو سکتی۔ لیکن اس ضرورت کو تو آپ بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ پڑھنے والون کی ایک تعداد اہل "اجتماع" کی بھی ہوگی اور آپ ان "عوام" کی داد وتحسین سے خواہ کتنے ہی بے نیاز ہون۔ لیکن ان کی ضرورتون سے تو آپ قطع نظر

نہین کر سکتے۔ اور ان کی ضرورتون کا تقاضا یہ ہے کہ زبان مین مصطلحات زرا کم استعمال کیے جائیں یا یوں کہیے کہ نفسیاتی زبان کے ساتھ ساتھ توضیحات اور مثالون کا حصہ زرا زیادہ ہو۔ ممکن ہے کہ مین کچھ زیادتی کر رہا ہوں، اس لیے کہ مجھے خود طوالت کی لت پڑی ہوئی ہے، اور محض اپنا خیال، پڑھنے والے کے سامنے پیش کر دینے پر بس نہیں کرتا، بلکہ چاہتا ہون کہ کسی طرح زبردستی اس کے دل کے اندر بھی اتار دوں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ بغیر طوالت کے عیب کے بھی آپ اپنی کتاب کو اس کی موجودہ ضخامت سے دوگنا تو کر ہی سکتے ہین۔

۲۔ مغز

مغز کے لحاظ سے مین سمجھتا ہون کہ اجتماع سے تو آپنے بڑی تفصیلی بحث کی ہے، لیکن "قائدین" (لیڈرون) مین اُسی قدر اجمال سے کام لیا ہے۔ یہ بالکل درست ہوتا کہ آپ اجتماع کی نفسیت پر بحث کر کے لیڈرون کے متعلق ایک منفیانہ پہلو اختیار کرتے یہ کہہ کر کہ اجتماع مین جن اوصاف کی کمی ہوتی ہے، وہ اس کے افراد مین پوری طرح پائے جاتے ہین۔ لیکن یہ یاد رکھیے کہ جس عمومی حیثیت سے آپ اجتماعات پر بحث کر سکتے ہین، وہ اس کے لیڈرون کے لیے کافی نہیں کر سکتے۔ کتاب کی نظر ثانی کے وقت، مین آپ سے بزور سفارش کرتا ہون کہ لیڈرون کے متعلق اپنے اس تناسب کو بدل دیجئے۔ کتاب کا یہ حصہ زیادہ تفصیل کا مستحق ہے۔ اور اس حصہ مین مزید شرح وبسط کی گنجایش ہی نہیں، ضرورت بھی ہے۔

۳ - اجتماع

اجتماعات سے متعلق آپ کے نظریات سے اجمالاً متفق ہوں، لیکن یہان بھی مزید تفصیل

وتقسیم کی ضرورت تھی۔ نظم وضبط کی اہمیت کو تو آپ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اور مانا ہے کہ اجتماع
جب اس وصف سے متصف ہو جاتے ہیں تو ان کی قوت زبردست بھی ہو جاتی ہے اور مفید بھی۔
لیکن اجتماع کا مفہوم آپکے ذہن مین بس ان بڑے بڑے جلسوں اور مظاہرون کے مترادف معلوم
ہوتا ہے، جو ہندوستان مین ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں نہ کہ ان "مجلسون" اور "کانفرنس" کا جہاں
وامرھم شوریٰ بینھم کے ارشاد ربانی کی تعمیل ہوتی رہتی ہے اور جہان آزادانہ بحث
ومباحثہ نظر وفکر کے بعد "اجتماع" کے فیصلے اکثر افراد کے فیصلون سے زیادہ معقول اور
"اجتماع" کا عمل بھی افراد کے عمل سے زیادہ منظم ہو جاتا ہے۔ آپکے فحوائے تحریر سے
ظاہر ہے کہ "اجتماع" (بھیڑ) کی حقارت آپکے ذہن مین بیٹھی ہوئی ہے (خود یہ لفظ ہی
تحقیر آمیز ہے۔ عربی لفظ "جمعیۃ" اس سے کہیں بہتر ہے) کیا میرا یہ خیال صحیح ہے کہ
آپ "اجتماع" کی تحقیر کر رہے ہین یا یہ ہے آپ اپنے خیالات پوری طرح واضح نہیں کر سکے ہیں
یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ مجھے اس طرف (بلکہ یوں کہیے کہ آج سے ۱۵ مہینہ قبل، نظربندی
کے وقت تک) جمہور سے خوب خوب سابقے رہے اور ممکن ہے کہ آپ مجھے بھی ان عوام
پسند زعیمون مین شمار کر رہے ہوں، جو زبان سے تو عامۃ الناس کی بڑی تعریف کرتے
رہتے ہین، مگر دل ہی دل مین ان عوام کو کالانعام اور چوپایہ سمجھتے رہتے ہین لیکن حقیقۃً
مین جہان تک اپنے جذبات اور خیالات کا اندازہ لگا سکا ہوں، میرے خیال میں نسبتہ
سب سے بہتر بلکہ اکثر تو بہترین فیصلے جماعات ہی کے ہوئے ہین نہ کہ افراد کے، گو سرعت عمل
کے لیے افراد ہی کی قیادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن خیر یہ تو ایک الگ بحث ہے۔
مین کہہ رہا تھا کہ مجھے آپ سے توقع یہ تھی کہ آپ مختلف اجتماعات کی مختلف نفسیتون پہ
نظر رکھیں گے۔ مومنین کی وہ آزاد جماعت جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ

مدت نبوت اور خلافت راشدہ کے ۳۰ سالہ زمانہ مین موجود رہی، ایک ایسے ہی اجماع کی مثال ہے جو اپنے قائدین کی سلیم ترین منبع ثابت ہوئی گیا[1] عمر رضؓ کے متبعین مین کبھی بھی ایسا ہوا ہے کہ نکتہ چین نہ رہے ہون۔ اور پھر آج کل کے بھی کسی ایسے "اجماع" کی بابت جیسا کہ برٹش ایسوسی ایشن[2] جو ہر سال برطانیہ اور اسکے علاقون میں اپنے اجلاس کرتی رہتی ہے، آپ کیا رائے دینگے؟ (بطور جملۂ معترضہ مجھے اس سے مسرت ہو رہی ہے کہ اب آپ کو اس کا موقع حاصل ہے کہ جس "اجماع" کو ہمارے قدیم دوست آفتاب[3] بارہ چودہ سال سے برابر ہانکتے چلے آتے ہیں اب اسے صحیح معنی میں کانفرنس بنانے میں مدد دے سکیں[4]) لیکن آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ آپ "اجماع" پر اعتماد کریں اور احتیاط سے بھی کام لیتے رہیں۔ نہ یہ کہ انکی طرح اس سے بے اعتمادی قائم رکھیں اور اس سے خوف کھاتے رہیں۔

۴- قیادت

آپ کے فحوائے کلام سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ قیادت جس کا نام ہے وہ محض ایک تسلسل ہے چالبازیوں اور فریب کاریوں کا، احمق عوام الناس کے احمق بنائے جاتے رہنے کا، سکیلین اور گگ کی طرح شعبدہ بازیوں کا محض ایک طلسم ہے — کیا یہ صحیح ہے کہ آپنے یہ لفظوں میں کھل کر نہیں کہا ہے بلکہ کہیں کہیں تو آپ نے قیادت صادقہ و قیادت کاذبہ کا امتیاز بھی قائم کیا ہے۔ لیکن نفسیات کے اندر صدق و کذب کا فرق ہے بھی؟ نفسیات کے نقطۂ نظر سے تو

---

[1] اب تبلیغ دین کھلم کھلا ہو رہی ہے [2] برطانیہ مین سائنس کی ممتاز ترین علمی مجلس [3] یعنی صاحبزادہ آفتاب احمد خان مرحوم سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مولانا کے اور انکے مسلک مین بڑا اختلاف تھا اور برابر جھنگ چلی جاتی تھی،
[4] صاحبزادہ صاحب نے مجھے بطور لٹریری اسسٹنٹ کے رکھا ہے میں اس وقت اتفاق سے کانفرنس کے دفتر ہی میں

جو کچھ بھی ہے حقیقت ہی ہے۔ لیکن محرکاتِ عمل ہمیشہ مختلف ہوتے ہیں اور اخلاقی حیثیت سے بعض قابلِ ستایش ٹھہریں گے اور بعض قابل مذمت۔ مجھے توقع تھی کہ آپ مختلف انواع کے قائدین کے اعمال، خیالات و جذبات پر تفصیلی بحث کریں گے اور فرق دکھائینگے کہ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو عمداً دوسروں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ اور کچھ ایسے جو غیر ارادی فریب دہی سے قبل خود فریبی کا شکار ہو چکتے ہیں۔ اور پھر کچھ ایسے بھی جو پہلے تو ارادۃً دوسروں کو فریب دیتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ خود فریب نفس میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کتاب کا یہ حصّہ بہت ہی سرسری ہے اور اتنا مجمل ہے کہ مطالعۂ نفسیات میں اس سے مدد نہیں مل سکتی۔

۵۔ نظائر

مثالیں اور نظیریں، جیسا میں پہلے کہہ آیا ہوں میری رائے ناقص میں کافی تعداد میں موجود نہیں ہیں۔ اسکے علاوہ انکی تقسیم بھی نامساوی و نامتناسب ہے۔ شبلی مرحوم کا ندوہ والا واقعہ اور کلکتہ کے بدمعاشوں کے ہاتھ سے دو عیسائی مبلغوں کا پٹنا، یہ چیزیں اس قابل نہ تھیں کہ انھیں ایسی کتاب میں بہ طور مثال درج کیا جائے جس میں آپنے کثرت سے اہم تاریخی واقعات بیان کئے ہیں جو ناظرین کے لئے عموماً مشہور و معلوم ہیں۔

۶۔ پیغمبر خدا کا ذکر

میری تنقید کا آخری عنوان آپکے ان تذکروں سے متعلق ہے جو آپنے پیغمبر خدا اور قرآن مجید کی تمثیل لاتے وقت کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ سچے اور حقیقی مسلمان ہیں۔ اس بنا پر مجھے سخت حیرت ہو رہی ہے کہ آپنے ایسی مقدس شخصیت اور ایسی مقدس آسمانی کتاب کا ذکر کس

ہلکے پن سے کیا ہے۔ کیا آورد اور تصنع اپنی "ناطرفداری" اور "خالص علمی تحقیق" کے اظہار کے لئے ہو یا کیا؟ یہ سوال میں ایک نقادِ نفسیات کی حیثیت سے نہیں کر رہا ہوں، جو ایک مسلمان مصنف سے کتاب اللہ اور رسول اللہ کے تذکرہ کے وقت ادب و احترام کی توقع رکھتا ہے۔ میں اس سے بے شبہ خوش ہوا کہ آپ نے محض دنیوی قائدین کی مثالیں دینے پر اکتفا نہ کیا بلکہ ہمارے اولوالعزم نبی محترم کی شخصیت سے بھی قیادت اور نفسیاتِ قیادت کی مثال میں کام لیا لیکن آپ کے لب ولہجہ میں تو صاف عیسائی مشنریوں کی بو آرہی ہے۔ جو یہ دکھانا چاہتے ہیں یا کم از کم پڑھنے والے کے ذہن کو اس جانب منتقل کر دیتے ہیں کہ محمد (جن کے دین پر میں اور میرا سارا کنبہ قربان ہو) نعوذ باللہ ایک پیغمبر کاذب یا محض لسان تھے۔ بلکہ آپ تو یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ قریش اور یہود جو رسول اللہ کے گرد محض اُن کی اہانت و تحقیر کی غرض سے جمع ہوتے تھے اور ان کی بدتمیزیوں پر قرآن مجید میں احکام صادر ہوئے ہیں آپ نے ان احکام پر نقد شروع کر دیا ہے۔ گر آپ کوئی سی بھی سیرۃ اٹھا کر دیکھ لیتے تو آپ کو رسول اللہؐ کے حضور میں ادب سے گفتگو کرنے کی آیات کی شانِ نزول مل جاتی۔ اسی طرح سعد بن عبادہؓ کا بھی وہ واقعہ کہ تقسیم غنیمت کے سلسلہ میں جب انصار کو مہاجرین سے شکایت پیدا ہوئی اور سعدؓ نے رسول اللہؐ کے سامنے انصار کے جذبات کی ترجمانی کی اور رسول اللہؐ نے اس وقت تقریر فرمائی۔ آپ نے اس واقعہ کو بھی توڑ مروڑ ڈالا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں رسول اللہؐ کی یہ تقریر محض لفاظی و شعبدہ بازی تھی؟ مجھے امید نہیں کہ آپ کا ایسا خیال ہو۔ لیکن آپ کا لہجۂ تحریر یقیناً اسی خیال کا اظہار کر رہا ہے۔ آپ کی بحث قیادت پر مجموعی حیثیت سے مجھے یہ کہنا ہے کہ بہتر ہوتا اگر آپ نے قیادت کے اصلاحی پہلو کو صفاتِ قیادت سے الگ رکھا ہوتا۔ پبلک زندگی میں کم و بیش ہم سب کچھ نہ کچھ

تصنع سے کام لیتے ہیں۔ بناوٹ ہم سب ہیں ہے۔ اسی لئے ہمارے خدمتگار اور اُن سے بڑھ کر ہماری بیویاں ہمارے دھوکے میں نہیں آتیں۔ لیکن ہمارے پیغمبر صلعم نے اپنی عمر کے پورے چالیس سال مکہ والوں کے درمیان ایک عام انسان کی حیثیت سے گزارے۔ اور اس طویل مدت میں انھیں اُنکی صداقت کے جانچنے کے ہر طرح کے موقعے حاصل رہے۔ جب چالیس برس کے بعد انھیں "امین" کا لقب حاصل ہو گیا اور وہ اپنے مقدس فرض کی ادائگی کے لئے تیار ہو چکے تب جاکر اُن پر اللہ کی وحی نازل ہوئی اور جب بھی انھوں نے اُسے قبول کیونکر کیا؟ غم کے ساتھ ڈرتے ہوئے، جھجکتے ہوئے اور سب سے پہلے ایمان ان پر کون لایا؟ سب سے پہلے انکی چہیتی بیوی، پھر کمسن چچازاد بھائی، پھر اُن کا عزیز ترین و قدیم ترین دوست۔ فریب باہر والوں کو دیا جاسکتا ہے اور تصنع اور ابن الوقتی سے اُنکے سامنے کام لیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ حال تھا کہ تصدیق کرنے والے اور تسلّی دینے والے وہی تھے جو خلوت کے محرمانِ راز تھے۔ کم از کم یہ ہستی تو چالبازیوں سے بالاتر تھی۔[1] یہی صحیح ہے کہ خدا نے اس کے سامنے سب کو خاموش رہنے یا مؤدب گفتگو کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن یہ اس رُعب و سطوت و جاہ کے قیام کے لئے نہ تھا، جس کی دھن میں مٹھی بھر پردیسی لاکھوں کروڑوں پر حکومت کرنے کے گئے لگے رہتے ہیں جو اس جاہ و اقتدار کے بھوکے ہیں وہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا کبھی اعتراف نہیں کرتے۔ لیکن قرآن تو ایسی آیات سے بھرا پڑا ہے جن میں پیغمبر کو کہیں تو تنبیہ ہے کہ دیکھو فلاں غلطی نہ کر بیٹھنا جس کے بہت قریب پہونچ گئے ہو۔ اور کہیں یہ فہمایش ہے کہ فلاں بات جو کر چکے ہو، خبردار آیندہ نہ ہونے پائے۔ ہر مفسر اور تفسیر داں آپ کو بتا سکتا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول صلعم کے

[1] مولانا کی تنقید کا یہ حصہ تمامتر واقعیت پر مبنی تھا۔ یہ اپنی زندگی کے اس ملعون دور میں "فرنگی محققین" ہی کا ہم عقیدہ و ہم زبان، بلکہ ان کا گراموفون بنا ہوا تھا،

جن بعض افعال سے قرآن میں اپنی جس ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے، اسکے لئے خاص اصطلاح ہے۔ یا پھر جب پیغمبرؐ کے صاحبزادہ کا انتقال ہوا ہے اور سورج میں گرہن اُسی وقت پڑا ہو اور عرب کے لوگ گرہن کو اسی سانحہ ہی کا نتیجہ قرار دینے لگے تو اس موقع پر کوئی جاہ پسند شخص ہوتا تو اس حسنِ اتفاق سے کیا کچھ فائدہ اٹھاتا۔ لیکن قرآن جو وہم پرستیوں کا خاتمہ کرنے آیا تھا اس نے اس موقع پر بھی اپنا فریضہ خاص طور پر ادا کیا۔ ایک طرف زرادیلز کے مدعی تقدس آدین گلندو درس کا یہ دعویٰ ملحوظ خاطر رہے کہ میری پیدائش کے وقت آسمان گرجا اور دوسری طرف قرآن کو دیکھئے کہ اس قسم کے اوہام کو کس کس طرح مٹایا ہے۔ آدین گلندو درس کو بالآخر یورپ ہی میں جواب یہ ملا تھا کہ یہ موسمی کڑک اور گرج اس موسم میں تو اس وقت بھی ہوتی ہے جب کوئی بلی بچہ جنتی ہوتی اور وہ خود بخود پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن ادھر دیکھئے، اللہ نے خود پیغمبرؐ کی زبان سے اس خیال باطل کو جو طبعاً شدت کے ساتھ پیدا ہو گیا تھا، یوں دور کر دیا کہ آفتاب اور ماہتاب میں گرہن اپنی اپنی طبعی میعاد پر پڑا کرتے ہیں انھیں انسانوں کی شادی غمی سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایک اور مثال لیجئے صحابہؓ کے خیال میں یہ جما ہوا تھا کہ آنحضرتؐ کی وفات کے ساتھ ہی دنیا کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اس عقیدہ پر وہ مضطر و مجبور تھے اور جب آپکی وفات کا واقعہ پیش آیا تو جن کا ایمان سب سے زیادہ قوی اور مستحکم تھا، وہ فرط صدمہ سے دنگ و ششدر رہ گئے۔ انھیں خیال بھی نہیں آتا تھا کہ کوئی زمانہ ایسا بھی آئیگا، جب پیغمبر خدا اس دنیا میں موجود نہ ہونگے۔ جن کا ایمان اس درجہ کا نہ تھا یا جن کی عقلوں پر عقیدت مندی غالب تھی، انکا تو ایمان ہی متزلزل ہو چلا۔ عمرؓ خود اس درجہ متاثر ہوے کہ جہاں ایک سردار اعظم اور عملی انسان ہونے کی حیثیت سے انھوں نے ان لوگوں کی روک تھام کی فوری ضرورت محسوس کی، وہاں کوئی عملی تدبیر

سوا اس تخویف کے ان کے ذہن میں نہ آئی کہ "خبردار، اگر کسی نے پیغمبر خدا کو متوفی کہا تو اس کا سر اڑا دونگا۔" عین اس وقت وہ شخص جسے بجا طور پر صدیق کا لقب ملا تھا، اُٹھا اور اس نے تسلّی دلاسا دے کر لوگوں کو مطمئن کیا۔ لیکن یہ کیونکر؟ محض ان آیات قرآنی کو سنا کر جنھیں خود حضرت محمد (میری ماں اور باپ اور اولاد سب اُن پر قربان) نے دنیا تک پہونچایا تھا وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِكُمْ (اور محمد کیا ہیں بجز ایک رسول کے اُن سے قبل اور بھی رسول ہو گزرے ہیں، اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر (کفر کی طرف) واپس چلے جاؤ گے؟) حضرت ابو بکرؓ نے بالکل صحیح طور پر حضرت عمرؓ کو ٹوکا۔ محمدؐ کی وفات ہو چکی تھی۔ لیکن ربِ محمدؐ کی وفات نہیں ہوئی تھی اور وہ حی وقیوم زندہ تھا۔ یہ تھا اس انسان کی ساری زندگی کا حاصلِ وعظ جس نے کبھی اپنی عبدیت کے باب میں شک وشبہ بھی نہیں پیدا ہونے دیا۔ "جاہ وسطوت" کا جو مفہوم آج شائع ہے وہ تو یہ ہے کہ نہ صرف فرمانروا معصوم ہے بلکہ حکام بھی اس معصومیت کے حصہ دار ہیں۔ نہ صرف قانون "مادرار تنقید اور معصوم ہے (قانوناً تو قانون معصوم ہی ہے اسلیئے کہ بادشاہ کوئی جرم نہیں کر سکتا۔ قانوناً بادشاہ سے برتر کوئی قوت نہیں، اسلیئے بادشاہ کا جرم پیش کس کی عدالت میں ہو؟) بلکہ اس قانون کے نافذ کرنے والے بھی امکانِ خطا سے ماورا ہیں۔ ہمارے نبیؐ نے اس عقیدہ کو شرک قرار دیا جس سے دنیا کو نجات دلانے وہ مبعوث ہوئے تھے۔ وہ خود معصوم بے شبہ تھے مگر اس حیثیت سے کہ پیغمبر الٰہی تھے، اور پیغامبر بھی اگر معاصی کا شکار ہو سکتا تو خود پیام کی صحت مشتبہ ہو جاتی لیکن آپؐ نے اس کی صاف تشریح کر دی ہے کہ جس وقت میں اپنے منصب رسالت سے الگ ہوں، اس وقت میری تمھاری حیثیت یکساں ہے۔ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاكُمْ۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو آپؐ نے بہ حیثیت ایک تجارت پیشہ مکّی کے مدینہ کی زراعت پیشہ آبادی سے اسوقت فرمائے

جب اُن لوگوں نے ایک فصل میں آپ کے مشورہ کے بموجب اور اپنے دیرینہ معمول کے خلاف اشجار خرمہ میں قلم نہیں لگائے تھے۔ لیجیئے یہ خط بہت زاید طویل ہوگیا ہے اور اسلیئے ہوا ہے کہ مجھے خواہ غلط ہی سہی، یہ شبہہ ہوگیا ہے کہ آپ نے دنیا کے مخلص ترین قائد اعظم کی جانب چالاکی کا انتساب کیا ہے۔ اگر میرا یہ شبہہ بجا ہے تو آپ اس طوالتِ بیان کو معاف کریں اور عبارات متعلقہ پر ایک بار پھر غور کرلیں۔ جب کتاب کی طبع ثانی کی نوبت آنے لگے، اور طبع ثانی کی نوبت جلد ہی آنی چاہیے، اُس وقت تک کے لیے میرا شکریہ قبول ہو کہ آپ نے ایسا تحفہ مجھے دیا جس کے باعث مجھے بھی بہت کچھ غور کا موقع مل گیا۔ زیادہ آداب و تسلیمات۔

آپ کا مخلص ۔ محمد علی

مکرر۔ آپ نے مجھے رائے دی کہ میں اس جبریہ تعطیل کے زمانہ میں کوئی کتاب لکھنا شروع کردوں[1] اور مجھ سے اس کی توقع بھی کی جا رہی ہے، اگر یہ صحیح ہے تو جن لوگوں نے مجھ سے اس کی توقع قائم کی ہے، وہ مجھ سے واقف نہیں ہیں۔ اولاً تو مجھ میں وہ صبر و تحمل اور استقلال ہی نہیں ہے جو ایک عالم محقق میں ہونا چاہیے۔ دوسرے جو کچھ علم و عقل رکھتا بھی ہوں، اس پر میرے جذبات کہیں زیادہ غالب ہیں۔ رہی یہ جبریہ فرصت سو مجھے یہ فرصت ملنے ہی کیوں پاتی، اگر میرے جذبات اس قدر ضعیف ہوتے کہ جس وقت اغیار تاریخ سازی میں مصروف ہیں، میں تاریخ نویسی میں لگا رہتا۔ نہیں میرے عزیز دوست نہیں۔ میرا دماغ، میرا دل، دونوں اس وقت جس عالم میں ہیں، وہاں تصنیف و تالیف جیسی "تفریحات" کی گنجایش کہاں؟ البتہ کبھی کبھی دل کے ایماء سے

---

[1] میں نے عرض کیا تھا کہ اس جبریہ فرصت کے زمانہ میں تاریخ پر کچھ لکھ ڈالیے۔

دماغ دو چار شعر موزون کر لیتا ہے۔ اگر آپ کو اس کا ذوق ہو تو میں ایک آدھ غزل آپ کو بھیج سکتا ہون۔ یہ وہ غزلیں ہیں جو ۱۵ مہینے کے زمانۂ فرصت مین مہلت کے لمحے نکال نکال کر ضبط تحریر میں لا سکا ہون۔ یہان کے ایک حاکم صاحب نے وہی رائے دی جو آپ نے پیش فرمائی، یعنی تصنیف و تالیف۔ میں نے جواب دیا کہ اس وقت تو میرا موضوع تصنیف دو ہی چیزین بن سکتی ہین، ایک "کربلا" دوسرے "قتل ہجرت"۔ اپنے چند شعر اسی وقت پیش کیے دیتا ہوں۔ میری ترجمانی کسی قدر ان ہی سے ہو سکے گی۔ (انگریزی سے ترجمہ ختم ہوا)

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
قتلِ حسینؑ اصل مین مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اس طرح سے جینے میں بھی مرنے کا مزہ ہے
قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہِ قضا دیکھ
اللہ کے بانکون کا بھی ہے رنگ نرالا
اس سادگی پر شوخیِ خونِ شہدا دیکھ
ہے سنت اربابِ وفا صبر و توکل
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ خدا دیکھ
تو طیر ابابیل سے ہرگز نہیں کمزور
بیچارگی پر اپنی نہ جا شانِ خدا دیکھ

آساں نہ تھا تقرب شیریں تو کیا ہوا
تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور
ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب
یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور

خوفِ غماز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی
عہدِ اول کو بھی اچھا ہو جو پورا کر دو
تم وفادار ہو، تھوڑی سی وفا اور سہی

باب (۷)

سنہ ۱۹۱۶ (۳)

(مزید مراسلت - اسلام سے شیفتگی)

کتاب پر تبصرے بہتوں نے کیے تھے، اچھے اچھے پیشہ ور تبصرہ نگاروں نے بھی۔ محمد علی کا تبصرہ سب سے بڑھ چڑھ کر رہا۔ کوئی دوسرا ریویو نہ اتنا جامع تھا نہ اتنا مفصل، نہ اتنا گہرا نہ اتنا مبصرانہ، نہ اتنا پرمغز نہ اتنا مخلصانہ۔ نہ بیجا مداحی نہ خواہ مخواہ کی تنقیص۔ اور فنی پہلوؤں سے قطع نظر کیجئے، تو تبلیغ کا انجکشن شروع سے آخر تک جا بجا موجود!

خاکسار مؤلف کا اپنے دورِ الحاد و بے دینی میں سابقہ، اور گہرا سابقہ، بہت سے مسلمان دوستوں اور صاحبِ علم و فضل مسلمانوں کے ساتھ رہا کیا۔ ان میں سے تقریباً سب کو افراط یا تفریط ہی میں مبتلا پایا۔ اکثر تو ایسے ملے، جو دوستی اور مروت کے غلو میں میرے ہر عیب کو ہنر ہی بنا کر پیش کرتے بلکہ شاید خود بھی یہی سمجھتے رہے۔ اور میری صریح بیہودگیوں پر پردہ ہی ڈالتے رہے۔ اور کچھ ایسے بھی نکلے، جو اس کے برعکس سرتاپا شعلہ و شرر تھے۔ حمیت دین کی زیادتی اور حرارت مذہبی کی افراط انہیں میرے ساتھ انصاف میں مانع ہوتی رہی۔ انہوں میں کہنا چاہیے کہ ایک محمد علی ہی ایسے تھے، جو ایک طرف میرے الحاد و بیدینی پر برابر مجھے ٹوکتے رہے، اور دوسری طرف دوسری حیثیتوں سے میری حوصلہ افزائی اور دلجوئی میں بھی لگے رہے۔

قدرۃً اس تنقید نامہ کی بڑی قدر ہوئی۔ دو ایک روز تو یہ عنایت نامہ خود گشت میں رہا۔ ۷ر اگست کو اس کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ خط کا مضمون تو اب ۳۲ سال بعد ذہن میں کیا رہ سکتا ہے، ہاں بہ طور خلاصہ کے یہ خیال پڑتا ہے کہ پہلے تو اتنے مفصل انتقاد کا شکریہ تھا، پھر کچھ اپنی حمایت میں یہ چھوٹی تاویل تھی کہ کتاب کا مقصود پیمبری سے انکار نہیں، بلکہ "ناطرفدار" رہ کر ان شخصیتوں کو محض بشری حیثیت سے پیش کرنا تھا۔ اپنی نئی اردو کتاب "فلسفۂ اجتماع" کا ذکر تھا، جو حقیقۃً "اور معنیً اسی انگریزی کتاب کا ایک مفصل و شرح ایڈیشن تھا۔ یہ بھی ذکر تھا کہ اب انگریزی میں "نفسیات قرآنی" (سایکالوجی آف دی قرآن) پر لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ اور آخر میں کلام جوہر کی دل کھول کر داد دینے کے بعد یہ سوالات تھے کہ یہ تو آپ بڑے چھپے رستم نکلے۔ شاعری کب سے شروع کی کس سے سیکھی ؟ کتنا کلام ہو گیا ہے ؟ وغیرہ۔ اور اسی میں ایک چبھتا ہوا فقرہ اس قسم کا بھی تھا کہ آپ کی "امت" آپ کے کلام سے لذت اور تسکین دونوں پائے گی ——— جواب محمد علی نے خلاف عادت و خلاف معمول بہت جلد یعنی ۱۶ ہی اگست کو لکھ ڈالا۔ خط نہیں بلکہ دکی بھی رسالہ اور پہلے رسالہ سے ضخیم تر! ——— مراسلت کی زبان اب بجائے انگریزی کے اردو ہو چکی تھی۔ میں نے اردو میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے جواب بھی اردو ہی میں آیا۔ کچھ ابھی اور فوراً ملاحظہ کیجیے، اور کچھ کئی صفحوں کے بعد اگلے باب میں۔

"۱۶ر اگست ۱۹۱۶ء

چھندواڑہ۔

مکرمی ۔ السلام علیکم۔

عنایت نامہ مورخہ ۷ر اگست چند روز ہوئے ملا۔ مجھے تو خوف تھا کہ کہیں آپ

میری تنقید سے ناراض نہ ہو جائین ۔ مگر نیت بخیر تھی ، اور جانبین کو صرف اصلاح مطلوب تھی نہ کہ افساد ۔ اس لیے میرا خیال صحیح نکلا کہ آپ کو ایک سچی اور دلسوزی کی تنقید محض تقلیدی تعریف و توصیف سے زیادہ پسند ہوگی ۔ عریضہ ہی مفصل تھا ۔ مگر پھر بھی اگر ہم دونون ساتھ ہوتے تو جزئیات کے متعلق بھی بہت کچھ عرض کر سکتا ۔ اس زمانہ مین اسبتداد اور استعباد نے جن کا آپ نے ذکر کیا ہے دو لفظ گھڑ لیے ہین Destructive : Constructive . (یا تعمیری و تخریبی) ۔ اور اس میں سے موخر الذکر کو تو ہر سچی تنقید کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور مقدم الذکر کو اس عنقا صفت تنقید کے لیے سینت کر رکھ لیا ہے جو نہ آج تک آنکھون نے دیکھی اور نہ کبھی کانون نے سنی ، اور جو نہ کسی متنفس کے دل و دماغ مین کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی جاگزین ہوئی ۔ حالانکہ اگر فن نقادی کو صحیح طور پر دیکھا جائے تو اس کا اولین فرض یہ ہوتا ہے کہ اس قصر سر بہ فلک کی تعمیر کے لیے جس کا نقشہ اس کے تصور میں ہوتا ہے (یا کہیں کہیں شاعر یا فلسفی یا ادیب کے کلام مین بھی کوئی محراب یا گنبد نظر آ جاتا ہے) ۔ زمین کو صاف کرنے اور آس پاس کے بوسیدہ مکانات ، بدنما جھونپڑے ، اور تنگ و تاریک بے قاعدہ گلیان وہان سے دور کر دے ۔ بہر حال تعمیر سے پہلے تخریب تھوڑی بہت کرنی ہی پڑتی ہے ۔ اگر استبداد کے عام اعتراض مین کوئی اصلیت ہے تو محض اس قدر کہ تنقید تخریب کی غرض سے نہ ہو ، بلکہ تعمیر کا پیش خیمہ ہو ۔ سو میں نے جو کچھ بھی لکھا ، اسی غرض سے لکھا تھا کہ جب کبھی نظر ثانی کا موقع آئے تو آخری فیصلہ کرتے وقت میرے پراگندہ خیالات مین سے جو ضروری اور مفید معلوم ہون پیش نظر رکھے جائین ۔

پیغمبر اسلام (روحی فداک یا رسول اللہ) کے متعلق ظاہر ہے کہ آپ ان کو اتنا بڑا پیشوا مانتے ہین ، اور کتاب کے ہر پڑھنے والے سے بھی منوانا چاہتے ہین ، جتنا کہ کوئی اور پیشوا ہو گزرا ہے

جس کی نظیر کتاب میں ہے۔ ورنہ ایک مسلمان کو کچھ بھی ضرورت نہ تھی کہ جہان نپولین وغیرہ کا مواد
کیا جاتا وہان ذکر حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی کیا جائے۔ آج کل کی سیاست بین الاقوامی کی اصطلاح
مین آپ کا "غیر طرفدار" رہنا بھی ایک ایسی کتاب کے لکھنے مین جسے ہر مذہب و ملت والا پڑھے،
قرین مصلحت تھا۔ مین نے اس خیالی (Conception) پر ہرگز اعتراض نہیں کیا ہے،
اگر اعتراض ہے تو محض طرز عمل (Execution) پر۔ اب چونکہ خود آپ کی تحریر سے
واضح ہو گیا کہ آپ وہی چاہتے ہین جو مین سمجھتا تھا کہ آپ چاہتے ہون گے۔ اس لیے میری تنقید
کی نوعیت بھی واضح تر ہو گئی، اور وہ ابھی باقی ہے۔ یعنی ایک عام پڑھنے والے پر آپ کے
الفاظ اور جملون کی اور نیز اُن موقعون کا جن پر تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا گیا ہے ایک حد
تک ضرور اثر پڑتا ہے کہ وہ بار بار غور کرے کہ کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مار گولیتھ (یہ میری
بدنصیبی تھی کہ آکسفرڈ مین جب میرا ارادہ تحقیق (.Honours آنرز) کی ڈگری لینے کا تھا تو یہ میرے
رہنما مقرر کیے گئے تھے، اس کے علاوہ بیشتر بھی کچھ عربی ان سے پڑھی تھی) وغیرہ کی طرح ایک
چلتا ہوا لیڈر تو ثابت نہین کرنا چاہتے۔ چونکہ یہ نہ آپ کا مفہوم ہو سکتا تھا نہ ہے اس لیے میری
توقع بیجا نہیں کہ آپ اپنی تصنیف کو ایک بار اس شبہہ کو دل میں جگہ دیکر پڑھین کہ مصنف
کوئی غیر مذہب والا ہے جو مسلمانون کو یا کم از کم غیر مسلمون کو تو ضلالت کی طرف آہستہ آہستہ
لے جانا چاہتا ہے، تاکہ وہ عظمت، جو ایک وحی پانے والے رسول کی اس کے دل مین ہو، وہ
دور ہو جائے، اور اس طرح دور ہو کہ خود پڑھنے والون کو بھی اس تبدیلی خیالات کا احساس
نہ ہونے پائے، اور اسی لیے بطور ایک نعم البدل کے خلعتِ نبوت اتار کر لیڈری کی گون
(.Gown) پہنا دی۔ یہ ہرگز آپ کا خیال نہ تھا نہ ہے نہ ہو سکتا ہے۔ مگر جس طرح حساب
مین بچے اپنے سوالات کے جوابات کی جانچ کرتے ہین کہ تقسیم کا ہے تو ضرب دیکر دیکھتے ہیں

اور تفریح کا ہے توجمع کرکے، اسی طرح ایک پڑھنے والے کے جذبات اور اس کے دل پر جو اثرات پیدا ہو سکتے ہیں، اُن کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس سلسلۂ تاثر کو الٹ دیا جائے اور تنقید جو ایک نقاد پیش کرتا ہو، اس کو صحیح تسلیم کرکے اور جو اثر کہ آخر کار پڑھنے والوں کے دل پر بقول اس کے پڑنا ممکن یا اغلب ہو اسے قبول کرکے پھر کتاب کو پڑھا جائے اور دیکھا جائے کہ جو نقوش پڑھنے سے پیشتر ہی دل پر نقش ہو گئے تھے، باقی رہتے ہیں یا مٹتے جاتے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ جب گھڑی ساز گھڑی کے کسی ٹوٹے ہوئے پرزے کو سنبھالنا چاہتا ہے تو خوردبینی شیشہ لگا لیتا ہے جس سے نقص اصلیت سے کہیں بڑا معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس غرض سے کہ باریک سے باریک نقص بھی صاف نظر آئے اور اصلاح کی جا سکے۔ اچھے سے اچھا نقاد بھی اکثر اس غرض سے مبالغہ سے کام لیتا ہے اور عوام سے کہیں زیادہ اسے لطیف و باریک بین بننا پڑتا ہے، چونکہ غرض اصلاح ہے نہ کہ افساد، اس لیے یہ بال کی کھال نکالنا اس کیلئے جائز ہی نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اس کے لیے اصرار کرنا چاہیے۔ اسی وجہ سے میں نے بھی اس تنقید میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور مصر ہوں کہ آپ خود اس سے بھی زیادہ مبالغہ سے کام لیں۔ جوہری جب نگین تراشی میں مصروف ہوتا ہے تو زیادہ وقت اس کا اس تراش و خراش میں صرف نہیں ہوتا جو عوام کو نظر آسکے بلکہ ایسی باریک اصلاح میں جس کا نظر آنا تقریباً ناممکن ہے اور جو کچھ وہ گھنٹوں کی محنت میں تراشتا ہے وہ نہایت باریک خاک کے چند ذرے ہوتے ہیں، جن کو تراشتے تراشتے ہی ہوا لے اڑتی ہے۔ مصنف کسی طرح جوہر فروش سے کم نہیں، اور اس سے زیادہ باریک بین نقاد اس کی تصنیف کا اور کوئی نہ ہونا چاہیے۔

"فلسفۂ اجتماع"[1] کب تیار ہوئی؟ افسوس ہے کہ انجمن ترقی اردو اپنی طرف سے

---

[1] مرحوم کی دوسری کتاب کا نام۔ اسی انگریزی لیڈرشپ ہی کا گویا اردو ایڈیشن تھا۔ زیادہ مفصل تر مطول۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔

شائع کردہ کتابوں کا کافی اشتہار نہیں دیتی۔ اسے چاہیے کہ اگر کسی کتاب پر ایک ہزار روپیہ صرف کرے تو کم از کم دو سو پچاس ۲۵۰ اس کے متعلق اشتہاروں پر بھی صرف کرے، اخبار والے اس کے ساتھ ضرور رعایت کریں گے۔ میں نے خود ہمدرد میں یہی کیا تھا۔ مگر خود انجمن کے کارکن اس معاملہ میں تساہل برتتے تھے۔ آپ بیسوین صدی کی اس ضرورت اور (Psychology of The Advertisee.) پر عبدالحق صاحب کو ضرور لکھیے۔[1]

نفسیات القرآن پر آپنے جو لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، اس کے متعلق کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کام کا نقشہ، اور تخمینہ' باصلاح تعمیرات کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی ریڈیکل کے جسم میں ایک مذہبی دقیانوسی کی روح رکھنے والا سمجھیں گے، اگر میں عرض کروں کہ بقول حالی ع

یاں جنبش لب خارج از آہنگ خطا ہے[2]

جو کچھ بھی لکھا جائے، وہ یہ سمجھ کر کہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ محاورہ انسانی ہے مگر اس کی تمام Psychology. خلاق زمین و آسمان کی ہے۔ غالباً آپ نفسیات القرآن سے یہ ثابت کرنا چاہیں کہ بڑے سے بڑا Psychologist. بھی انسانی نفسیات کے اسرار و نکات سے نہ اس طرح واقف ہو سکتا ہے نہ ان کے اظہار کے لیے الفاظ اور ترکیبیں اور فقرے کسی زبان میں پا سکتا ہے۔ جس طرح خود اس ذات پاک نے

[1] مولوی عبدالحق صاحب (بعد کو ڈاکٹر عبدالحق اور بابائے اردو) اس وقت بھی انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری تھے [2] اس وقت انگریزی میں "سائیکالوجی آف دی قرآن" لکھنے کا ارادہ تھا، اسی ملحدانہ رنگ میں۔ بحمد اللہ کہ یہ ارادہ اس وقت محض ارادہ ہی کی حد تک رہا۔ محمد علی اس وقت بظاہر بالکل انگریزیت میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن دل و دماغ کے ریشہ ریشہ میں اللہ اکبر کس درجہ اسلامیت رچی ہوئی ہے۔

قرآن کریم میں ظاہر فرمادیا ہے، جو عالم الغیب والشہادۃ اور انسان کا پیدا کرنے والا ہے۔
اگر آپ کا یہ خیال ہے، تو میدان نہایت وسیع ہے مگر رہرو کو ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا
پڑتا ہے۔ مین ہرگز ان لوگون کے طرفدارون مین نہین ہون جو کلام ربانی سے اس درجہ خائف
ہو جائین کہ اسے کبھی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرین نہ اس کے متعلق کچھ سوچین نہ پوچھین پچھین۔
کلام پاک ریشم کے جزدانون اور الماری کے بالاترین حصون اور وہان کے گرد وغبار کے لیے
آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا۔ مین چاہتا ہون کہ قرآن پاک کا ہر ایک نسخہ اس کثرت سے
مستعمل ہو کر پنسل کے نشان، کاغذ کی پٹیان، بین الاوراق یہان تک کہ انگوٹھے اور
انگلیون کے نشان ہر جگہ نظر آئین اور ثابت کر دین کہ اس کتاب سے زیادہ اس کے ماننے
والے کسی کتاب کو نہین پڑھتے، نہ اس سے زیادہ کسی کتاب کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہین۔ مگر مجھے
اُن لوگون سے ہمدردی ضرور ہے جو قرآن کو نہایت احتیاط واہتمام کے ساتھ چھوتے ہین
گو برس دو برس مین ایک ہی دفعہ کیون نہ ہو۔ یہ ام الکتاب ہے اور اس کا ادب باقی
رکھنا اس لیے لازم ہے کہ اگر اتنی احتیاط نہ برتی جائے تو تحریف کا اندیشہ ہے۔ اور باقی
تمام صحفِ ماقبل، اس خطرہ کے بیجا نہ ہونے کا کافی سے زیادہ اور سخت دلخراش ثبوت
ہین۔ اس لیے ایک صاحب نے جب ایک ترجمہ بلا متن میرے پاس ریویو کے لیے
بھیجا تو مین نے انھین اطلاع دیدی کہ مجھے ایندھن کی آج ضرورت نہین ہے۔ کیا مسلمانون
کے لیے یہ بات مایۂ ناز نہین ہے کہ تیرہ سو برس سے زیادہ عرصہ گزر گیا مگر مسلمانون نے
اس ام الکتاب کو اس احتیاط سے رکھا کہ آج تک ایک لفظ یا حرف تو کجا زیر و زبر
کا بھی فرق نہین ہونے پایا۔ اور تمام فرقے اس پر اتفاق کلی کرتے ہین۔ قرآن پاک تو
قرآن پاک دوسرے صحائف۔ ہمارے کتبِ حدیث کی تحقیق و تدقیق اور صحت وحفاظت

کا بھی مقابلہ نہین کر سکتے۔ قصہ مختصر، مجھے امید ہے کہ جو کچھ بھی آپ لکھین گے، آداب قرآن کو ہر طرح ملحوظ رکھین گے۔ مگر لکھیے ضرور۔ اس سے ہرگز نہ خائف ہوجیے، یہ تو ایسی سیدھی سادھی کتاب غیر ذی عوج ہے کہ عرب کے گنوار مدینہ منورہ جاتے اور نبی اکرمؐ سے اسے سنتے اور ہم سے کہیں زیادہ سچے اور پکے مسلمان بن کر اپنے بالون والے خیمون اور ریگستان اور اپنے گلون مین واپس آجاتے۔ مفسرین کا جہان شکریہ ادا کرنا ہے، وہان یہ شکایت بھی باقی ہے کہ باوجود سچی محبت و احترام کے انھون نے بھی ایک حساب سے ادب قرآن پاک قائم نہ رکھا، جو کچھ لکھا وہ زیادہ تر اس نیت سے کہ اپنا تمام کمال اس صحیفۂ اکرم پر صرف کردین۔ مگر بعض اوقات یہ بھول گئے کہ کہین حاشیہ متن کو اپنے بوجھ اور پھیلاؤ سے چھپا اور دبا نہ لے۔ یہی حال شیکسپیر کے جرمن مشرحین کا ہے، اُن کا ساری دنیا پر احسان ضرور ہے کہ شیکسپیر کو خود اس کے ہم وطنون کے تغافل سے نجات دی مگر اب تو بعض نے شیکسپیر کو محض اپنی مضمون آفرینی کا آلہ بنا لیا ہے۔ خدا مسلمانون کو قرآن پاک کے متعلق اس شر سے بچائے۔ آمین!

باب (۴)

سنہ ۱۹۱۶ء (۴)

شاعری کی کہانی شاعر کی زبانی

خط کا ایک حصہ نقل ہو چکا۔ دوسرا جزو جو شاعری کے متعلق تھا، وہ اب نقل ہو رہا ہے، اور آج سے پیشتر بھی خدا معلوم کتنی بار کن کن پرچون رسالون اور کتابون مین نقل ہو چکا ہے۔

"آپ میری شاعری کا کیا پوچھتے ہین۔ بچپن مین تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ مین اُس وقت زلف وابرو کی تعریف مین خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رام پور مین اُس زمانہ مین پیدا ہوا تھا، جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغؔ، امیرؔ، تسلیمؔ، عروجؔ، دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رام پور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان مین بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے، جن مین ایک میرے حقیقی بھائی ذو الفقار علی خان صاحب گوہرؔ اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علی خان اور اُن کے بھائی حافظ احمد علی خان صاحب شوقؔ شامل تھے۔ گھر پہ بارہا مشاعرہ ہوا۔ پھر داغ کو نواب کلب علی خان صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پہ رہتی تھی از راہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا، تاکہ وظیفہ محض "کار بے کاران" کی نذر نہ ہو۔ یہ میرے مکان کے عقب مین تھا،

اس لیے روزانہ ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں، جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا (ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو) ؎

آیا دلی سے ایک مشکی خر　　آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کی غزل یاد کیجئے ؎

آج رخصت جہان سے داغ ہوا　　خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار علی روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا اور مجھے بھی لے جاتے تھے۔ داغ نے پہلے دن پوچھا کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں۔ میری عمر بہت کم تھی مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیے تھے جنھیں میں نہایت شان اور زور سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے داغ ہی کے چند شعر انھیں سنا دیے۔ سن کر پھڑک گئے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچہ کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ سنیے میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں، بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں، اس کو ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں، غرض کوئی بے ادبی و گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔ میری پیدائش ۱۸۷۸ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت لغو و فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے، اور اچھا ہوا کہ وہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری Official Biography یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری امت کی طرف سے لکھنے کا وقت آتا تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا۔ اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتش دان کی نذر کیا جائے یا سیرت پیشوائے قوم و ملک میں جگہ دی جائے۔ ہمدرد[1] کے منشی نے

[1] ہمدرد دہلی ۱۹۱۲ء میں منشی بھی رہا تھا کوئی مضمون بغیر منشی کی منظوری کے نہیں چھپ سکتا تھا۔

دجن کا چند ماہ کے بعد ہی یکایک انتقال ہو گیا) تو ہمدرد میں سے ایک بار چڑے چڑیا کی کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا۔ اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ "بھائی ہے تو چڑیا چڑے ہی کی کہانی، مطلب بھی صاف صاف معلوم ہوتا ہے مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے اور روٹی کا معاملہ ہے، نہ معلوم اس میں کچھ زہر بھر دیا ہو اور جوابدہی ہمارے سر آپڑے۔" آپ نفسیات کے ماہر ہیں۔ کیا ممکن نہیں کہ میرا پوچ جنے والا سیرت نگار باوجود نقاد سخت ہونے کے، محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں اور آنے والی نسلیں ممکن ہے اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور ان اسرار سے واقف ہو کر دنیا کو نئی نئی معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالا مال کر دیں؟ اس لیے بہتر ہے کہ انھیں داخل ہی کر دو اور اس طرح ہمیشہ کے لیے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سنیے۔ گیارہ برس کی عمر میں علی گڈھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظہ کی تعریف کی کہ المامون میز پر رکھی تھی، اٹھا کر پڑھنے لگا اور میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے؟ اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا تو اس کا مجھے ترجمہ سنا دیا، حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے۔ مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے۔ پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی پھر اس کا حلیہ پوچھا جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعہ طرح اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ اسی وقت تیار ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر یہ تو جو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے لکھی اور مولانا کو گم بھرے

انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا، مگر ہماری بچر گوئی کا بھی خاصا شہرہ ہوا۔

اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر زرا زیادہ ہوئی تو امتحان نے فرصت نہ دی۔ کالج مین البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت مین شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس مین تھے تو ایک نظم میں شعرائے باکمال نے حاجی اسمٰعیل خان صاحب[1] (تربیت الدجاج اور "یونین جیک" والے) کی دعوت کے شکریہ مین تیار کی تھی، ان مین سے ایک یہ خاکسار تھا، ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب تازہ آنریبل اور موڈ کالے سکریٹری مسلم لیگ کے برادر "اصغر"[2]۔ خیر ایک سال آخری کالج مین خوب گزر گیا اور وہ مشاعرہ جسے بعد کو حسرت[3] نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا، چودھویں کو پیش ہوا کرتا تھا۔ اور شمع پیش نہ کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا "لان" جائے مشاعرہ تھا۔ ایک چودھویں کو بارش ہوگئی تو ۳۔۴ دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر یونین ہال مین کیا گیا۔ اس وقت مین نے اپنی ایک غیر طرح اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا۔

فرش زمردین نہیں وہ چاندنی نہیں لطفِ مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

علی گڈھ کالج مین شاعری تو کچھ کی، مگر وہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو بس اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور سبزۂ خط وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔

کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہان البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوق

---

[1] رئیس تاؤلی اپنے زمانہ مین مشاہیر علی گڈھ مین تھے۔ [2] سید اصغر حسین صاحب بی۔ اے (علیگ) نے سشن ججی سے پنشن پائی۔ سید وزیر حسن نے اودھ چیف کورٹ کی چیف ججی تک ترقی پائی، اب سر وزیر حسن ہین (۱۹۳۸ء) [3] یعنی مشہور شاعر حسرت موہانی۔ (۱۹۳۸ء)

نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال سہی، تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد و تقوی کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا، دو برس کسی اور کے خیال نے۔ مگر یہ آخری خیال باعصمت تھا اور محض حالات گرد و پیش اس کے محرک تھے۔ جب ان سب تجربوں کے بعد "کپڑے بھاڑے گھر کو آئے" تو تاہل کی زندگی یال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کر دیا۔ گزشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا تو وہی قومی مرثیہ، مگر زیادہ تر رسمی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ لایا ہے، اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنک آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانہ میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لیے نہ بیٹھتا ہوں، نہ کوشش کرتا ہوں۔ مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بہ غایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے۔ چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلیں لکھ کر بھیجو، اس لیے یہ لکھے بھیجتا ہوں (- Touchstone کی معشوقہ سے زیادہ قابل قدر نہیں A poor thing but my own.)

اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں۔ بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب۔ عزیزی مسعود[۱] کے رشتہ سے مجھی میرا حق پہنچتا ہے۔ والسّلام

محمد علی

مکرر یہ کہ مجھے سخت تعجب ہوگا، اگر آپ صاحبزادہ صاحب[۲] کے ساتھ نباہ کر سکے۔" ہمارا تجربہ مدتوں کا ہے۔ گو اوروں کے لیے اپنا تجربہ اکثر بے سود ہوتا ہے۔

---

[۱] باندا کے خان بہادر حاجی مسعود الزمان بیرسٹر ایٹ لاء ممبر یو۔ پی کونسل۔ میرا عقد ان ہی کی چھوٹی ہمشیر سے ہوا تھا۔

[۲] مراد وہی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سکریٹری کانفرنس علی گڑھ ہیں۔ محمد علی کی ان سے پرانی جنگ تھی۔

تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی (غالب)

خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

خوفِ غماز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

کشورِ کفر میں کعبہ کو بھی شامل کر لو
سیرِ ظلمات کو تھوڑی سی فضا اور سہی

ربِّ عزت کے لیے بھی کوئی رہنے دو خطاب
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

عہدِ اول کو بھی اچھا ہو جو پورا کر دو
تم وفادار ہو تھوڑی سی وفا اور سہی

حکمِ حاکم نہ سہی مرگِ مفاجات سے کم
مالک الملک پہ ایمان کی سزا اور سہی

جس نے ہنگامہ عدالت کا تری دیکھا ہو
اس گنہگار کو اک روز جزا اور سہی

بندگی میں تری سہتے ہی ہیں لو کی لپیٹیں
چند دن کے لیے دوزخ کی ہوا اور سہی

دل تو جا ہی چکا گر جان بھی جاتی ہے تو جائے
ترکشِ کفر میں اک تیرِ قضا اور سہی

ہم وفاکیشوں کا ایمان بھی ہے پروانہ صفت
شمعِ محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

دار و دیارِ غیر میں مجھکو وطن سے دور (غالب)

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور
جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور

گر بوئے گل نہیں، نہ سہی، یادِ گل تو ہے
صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور

پاداشِ جرمِ عشق سے ہے کب تلک مفر
مانا کہ تم رہا کیے دار و رسن سے دور

کچھ بھی وہاں نہ خنجرِ قاتل کا بس چلا
روحِ شہید رہتی ہے نعش و کفن سے دور

تقوی کے بعد خوف کہاں، حزن پھر کہاں
عالم ہی اک جدا ہے وہ رنج و محن سے دور

مستِ مئے الست کہاں اور ہوش کہاں
طرزِ وفا سے غیر ہے اپنے چلن سے دور

واعظ کا ارتداد، نہ میرا ہی ترکِ کفر
کچھ بھی نہیں ہے ساقیِ توبہ شکن سے دور

ہے بُعد کربلا سے بھی، قربِ یزید بھی
اور چاہتے یہ ہیں کہ نہ ہو پنج تن سے دور

اللہ رے نورِ چشمِ محبت کی جستجو
نکلا اسیرِ مصر نہ کچھ بھی وطن سے دور

آسان نہ تھا تقربِ شیریں تو کیا ہوا
تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور

مسلم اجل سے دور نہیں روزِ کربلا
رہتا نہیں برات میں دولھا دلہن سے دور

منقارِ عندلیب کو صیاد سی چکا
مانا کہ گوشِ گل ہے لبِ نالہ زن سے دور

یوں بچ سکو مواخذۂ حشر سے تو، ہاں
مارو ہو یارِ غیر میں ہم کو وطن سے دور

مفتیِ مفت خوار کو سب کچھ حلال ہے
بوئے شرابِ شرک ہو پھر کیوں دہن سے دور

دستِ دراز کو ترے اے رندِ باصفا
رکھے خدا عمامۂ شیخِ زمن سے دور

ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب
یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور

ہیں اتنے لافِ شوق پہ مرعوبِ حسن بھی
یہ طائفہ عجیب ہے اک مرد و زن سے دور

تم ہو تو نذرِ عشق، نہ لکھیں وہ مرثیہ
یہ بات ہے مروتِ اہلِ سخن سے دور

تاویل بڑھ کر اقرب للکفر ہو گئی
کچھ بھی نہیں ہے شیخ ترے علم و فن سے دور

تم سے بعید تھا کہ بھلا دو، اگرچہ ہم
اک عمر ہو گئی کہ ہوئے انجمن سے دور

شاید کہ آج حسرتِ جوہر نکل گئی
اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ممکن ہے نالہ جبر سے رک بھی سکے مگر
ہم پر تو ہے وفا کا تقاضا جفا کے بعد

اک شہرِ آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل
ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

غیروں کے ساتھ ہم سے الگ حیف ہے اگر ‏ یہ بے حجابیاں بھی ہوں عذرِ حیا کے بعد

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے ‏ میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں ‏ آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

کیا زندگی جو دل میں کوئی آرزو نہ ہو ‏ رہتی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

ہے کس کے بل پہ حضرتِ جوہر یہ روکشی
ڈھونڈھیں گے آپ کس کا سہارا خدا کے بعد

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ ‏ دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

یہ نورِ خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا ‏ کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ تو بھی بجھا دیکھ

سمجھا بھی ہے کچھ تو کہ یہ ہے کس سے تمرد ‏ اللہ کو مان، اپنی حقیقت کو ذرا دیکھ

سونے کا نہیں وقت یہ ہشیار ہو غافل ‏ رنگِ فلکِ پیر، زمانہ کی ہوا دیکھ

ہے سنتِ اربابِ وفا صبر و توکل ‏ چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ خدا دیکھ

اللہ کے بانکوں کا بھی ہے رنگ نرالا ‏ اس سادگی پہ شوخیِ خونِ شہدا دیکھ

خو تیری دو روزہ مرا پیماں ہے ازل کا ‏ پابندِ جفا تو ہے تو میری بھی وفا دیکھ

ہم کہہ نہیں سکتے وہ کریں چارہ گری بھی ‏ حالِ دلِ بیمار طبیبوں کو سنا دیکھ

تو طیرِ ابابیل سے ہرگز نہیں کمزور ‏ بے چارگی پر اپنی نہ جا شانِ خدا دیکھ

وحشت رہِ غربت میں اکیلا تو نہیں تو ‏ بطحا کے مہاجر کا تو نقشِ کفِ پا دیکھ

عقبیٰ تو کہاں، واں نہیں دنیا بھی کچھ ٹھیک ‏ اس کافرِ بے فیض سے دل تو بھی لگا دیکھ

اس طرح کے جینے میں بھی مرنے کا مزا ہے ‏ قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہِ قضا دیکھ

ہو حسنِ طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا ‏ ہو صدقِ طلب پھر اثرِ آہِ رسا دیکھ

ہوں لاکھ نظربند، دعا بند نہیں ہوں

اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

سینہ ہمارا فگار دیکھیے کب تک رہے ... چشم یہ خوں نابہ بار دیکھیے کب تک رہے

عشق، سو وہ بھی ترا، صبر طلب ہے بہت ... صبر ہمارا شعار دیکھیے کب تک رہے

سب کو یہاں ہے فنا ایک تجھے ہے بقا ... یہ ستم روزگار دیکھیے کب تک رہے

یوں تو ہے ہر سو عیاں آمدِ فصلِ خزاں ... جور و جفا کی بہار دیکھیے کب تک رہے

زور کا پہلے ہی دن نشہ ہرن ہو گیا ... زعم کا باقی خمار دیکھیے کب تک رہے

پہلے رہا ورد دل مونس جاں مدتوں ... ورد مگر اگلی بار دیکھیے کب تک رہے

ہم نے یہ مانا کہ یاس کفر سے کم تر نہیں ... پھر بھی تیرا انتظار دیکھیے کب تک رہے

حق کی کمک ایک دن آہی رہیگی ولے ... گرد میں پنہاں سوار دیکھیے کب تک رہے

ماتم شبیر ہے آمد تمہاری تلک ... قوم ابھی سوگوار دیکھیے کب تک رہے

رونق دہلی پہ رشک تھا کبھی جنت کو بھی ... یوں ہی یہ اجڑا دیار دیکھیے کب تک رہے

طاعت و آزادگی یوں تو نہ ضدین تھیں ... جبر کا یہ اعتبار[1] دیکھیے کب تک رہے

دین پہ دنیا فدا کرتے رہے مدتوں ... کفر پہ ایمان نثار دیکھیے کب تک رہے

یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے بقول آپ کے میری "امت" اُن سے کچھ تسکین پائے۔ بہرحال مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق۔ یہ صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لیے ہیں۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔

آپ کا نیازمند محمد علی

انوار احمد صاحب کو اور نیر عباسی صاحب کو سلام شوق دونوں کی طرف سے[2]۔

[1] عجب نہیں جو یہ لفظ "وضعدار" ہو۔ مطبوعہ کلام جوہر سے یہ شعر خارج ہے۔ دونوں صاحب کانفرنس میں اہلکار تھے۔

[2] "دونوں کی طرف سے" یعنی مولانا شوکت علی صاحب کی طرف سے بھی، کہ وہ بھی نظربندی میں ساتھ تھے۔

باب ۹

سنہ ۱۹۱۶ء (۵)

اسلام کا دیوانہ نظر بند

خط کیا آیا، یہ کہیے کہ بزم مشاعرہ مین شمع گردش مین آئی۔ ابھی اس کے ہاتھ مین ہے، ابھی اس کے۔ خدا جانے کتنوں نے پڑھا، کتنون نے دوسروں کو پڑھتے ہوئے سنا۔ کتنون نے ان اوراق کو آنکھون سے لگایا۔ کتنے پڑھ کر جھوم جھوم گئے، لوٹ لوٹ گئے۔ کلام خود دلکش، اور پھر سب سے بڑھکر وقت کی فضا، جتنا حصہ سیاسیات اور ایمانیات کا تھا، وہ قال نہیں، سرتاسر حال تھا۔ لوگ کیسے نہ وجد میں آجاتے ——— جواب مین ایک خط جلد ہی لکھ ڈالا۔ اور جب اس کا جواب نہ آیا، تو انتظار کر کے دوسرا خط ۲۵ ستمبر کو، اور مزید انتظار کر کے تیسرا خط ۱۱ر اکتوبر کو ڈاک کے سپرد کیا۔ گھر کا ایک لڑکا کام کاج میں رہتا تھا اور خط ڈاکخانہ اکثر اسی کے ہاتھ جاتا تھا، بدگمانی یہ ہوئی کہ کہیں اسی نے ٹکٹ کے لالچ میں آکر ٹکٹ تو نہیں اکھاڑ لیے، اور خط پھاڑ کر پھینک دیے۔ اس درمیان میں یعنی ختم اگست پر علیگڈھ سے تعلق قطع کر کے میں لکھنؤ واپس آگیا تھا اور قیام زیادہ تر لکھنؤ یا کبھی اپنی سسرال باندے میں رہتا تھا ——— شادی کے ابھی تین ہی چار مہینے تو ہوئے تھے،

علی گڈھ سے واپس آجانا تمامتر اپنا ہی فعلِ خود اختیاری تھا۔ وطن سے باہر جی نہ لگا۔

طبیعت نے بہانہ علی گڈہ کی آب و ہوا کی خرابی کو بنایا۔ بدنامی تھوڑی بہت بیچارہ صاحبزادہ آفتاب احمد خان کے حصہ مین آئی کہ انھون نے جمنے نہ دیا۔ حالانکہ اُن مرحوم کا اس مین قصور ذرہ بھر بھی نہ تھا، وہ غریب تو مجھے دل سے روکنا چاہتے تھے،

میرے ان تینون خطون مین تھا کیا؟ کچھ تھوڑی سی نوک جھونک محمد علی کی سخت مذہبیت پر تھی کہ آپ میری زیر نظر نفسیات القرآن (سایکالوجی آف دی قرآن) مین مجھ سے کسی مولویت یا اسلامیت کی توقع کیون رکھتے ہین، مین تو قرآن کے فلسفہ پر (نعوذ باللہ) اسی طرح لکھون گا جس طرح یونان اور یورپ کے بڑے بڑے فلسفی ارسطو یا کانٹ پر لکھا جاتا ہے۔ یہ بھی مسرت کے ساتھ ذکر تھا کہ مشہور برطانوی صحافی سر ولینٹائن چرل (Chirol) نے سایکالوجی آف لیڈرشپ پر اچھی رائے لکھ کر بھیجی ہے لکھنؤ سے ہمدم نیا نیا، یکم اکتوبر سے، سید جالب دہلوی (سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر ہمدرد) کی ایڈیٹری مین نکلا تھا، کچھ اس کا ذکر خیر تھا۔ اور ایک چوٹ یہ بھی تھی کہ آپ کا اپنے اس جوش دینی اور تقشف مذہبی کے ساتھ، علی گڈھ کے ظریف محمد ایم۔ اے۔ سے (جو دہریت والحاد کے مبلغ تھے) دوستی کا نباہ کیونکر ہوا؟ ——— جواب وسط نومبر کے قریب آیا، اور اتنا مفصل و دلچسپ کہ سارے پچھلے انتظار کی تلافی ہو گئی۔ آج آپ کو کسی انتظار کی بھی ضرورت نہین۔ معاً پڑھنا شروع کر دیجئے۔

"۱۰ نومبر ۱۹۱۶ء"

بہ حمد واللہ

"مکرمی۔ تسلیم

یہ سچ ہے کہ آپ کے ملازم صاحب نے ایک خط آپ کا ضرور تلف کر دیا۔ مگر

اس کے بعد کے دونوں خط مورخہ ۲۵ ستمبر و ۱۱ اکتوبر مجھے ملے۔ میری اس خاموشی سے آپ ضرور متردد اور غالباً مجھ سے ناخوش بھی ہوں گے۔ مگر میرے عذرات سن کر ضرور مجھ سے ہمدردی بھی فرمائیں گے۔ آپ کا پہلا عنایت نامہ مجھے ۲۰ ستمبر کو ملا۔ اکتوبر کے مسٹر معظم علی[1] میرے سالے بانکی پور سے مع اپنی بیگم صاحبہ اور دو چھوٹے بھائیوں کے تشریف لائے۔ چونکہ والدہ رامپور تھیں، اور میری اہلیہ کو کامل صحت نہ ہونے پائی تھی اس لیے خانہ داری کا تھوڑا بہت کام میرے بھی متعلق تھا۔ یہی کچھ کم نہ تھا کہ مجھے تیمارداری بھی کرنا پڑی، اور وہ بھی ایک نرس کی طرح۔ میرا منجھلا سالا بانکی پور سے ہی بخار ساتھ لایا۔ یہاں دو ہی روز بعد ڈاکٹر نے ٹائیفائیڈ کا تشخیص کیا اور یہ بھی جتلا دیا کہ اس عمر میں یہ مرض سخت ترین امراض سے ہوتا ہے اور علاج سوائے نرسنگ کے کچھ نہیں۔ شوکت صاحب تو ہمیشہ کے میرے تیماردار تھے۔ اب کی بار بالکل بیکار ہو گئے۔ ایک ناتجربہ کار ڈاکٹر نے کچی پھوڑیا میں نشتر لگا دیا۔ معدہ خراب پہلے ہی سے تھا، تپ میں مبتلا ہو گئے اور سخت تکلیف اٹھائی دس بارہ دن برابر مسہل ہوئے، تب جا کر چلنا پھرنا نصیب ہوا۔ میں اپنی چھوٹی لڑکی کی تیمارداری ٹائیفائیڈ میں حال ہی میں کر چکا تھا۔ میری اہلیہ سخت علیل رہیں تو ان کی تیمارداری بھی مجھی کو کرنا پڑی۔ ان امراض پیہم نے مجھے چند روزہ کی اچھی خاصی مس فلارنس نائٹ انگیل[2] بنا دیا تھا۔ یہ تو امر مسلم ہے کہ "ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف" اپنے سالے کی تیمارداری میں ایسا منہمک ہو گیا اور ایسا منہمک ہونا پڑا کہ آپ کو ایک

---

[1] معظم علی خاں مرحوم بی۔ اے۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ علی برادران کے زمانہ اسیری (۱۹۲۱ و ۲۳ء) میں مرکزی خلافت کمیٹی کے سکریٹری رہے۔ اس وقت (۱۹۱۶ء میں) بانکی پور میں بیرسٹری کرتے تھے۔ آخر عمر میں رامپور میں ہائی کورٹ کے جج ہو گئے تھے۔

[2] ایک انگریز خاتون، میدان جنگ میں تیمارداری کے کام کے لیے مشہور۔

کارڈ بھی اطلاعاً نہ لکھ سکا کہ دونون عنایت نامے مل گئے۔ میرے متعلقین کو اس کو رہ ہین پڑے پڑے ایک سال ہونے کو آیا تھا مگر تنہا چھوڑنا بھی گوارا نہ تھا۔ دوسرے لے دے کر صرف ڈھائی سو روپیہ کے وظیفہ پر معاش تھی۔ اب جبتک اس Subsistence[1] allowance پر ایک Separation allowance[2] کا اضافہ نہ ہوا، ان لوگون کو علیحدہ رکھنے کی نظر بند بجٹ مین گنجایش بھی نہ تھی۔ ایک ہنڈیا مشکل سے چڑھنے پاتی تھی۔ دو ہنڈیون کا چڑھنا معلوم۔ مگر یہ بھی سوچتا تھا کہ ہم تو پھر بھی شہر مین چل پھر لیتے ہین رہتے رہتے بہت لوگون سے واقفیت ہو گئی ہے۔ دوسرے اپنے افکار و اشغال کا کام کرتے ہین، ان بیچارون کے لیے تو یہ بھی موجود نہین۔ سوائے ایک دو گھرون کے کہیں آنا جانا نہیں "ملاکی دوڑ مسجد تک" اگر ہوا خوری کے لیے کہیں باہر گئیں بھی تو سول لائنس میں دو ایک جگہ۔ حدود میونسپلٹی سے باہر نکلنے پر نظر بندون کے پر جلتے تھے۔ پھر گھر مین پیہم بیماریوں کا ہونا۔ اور خصوصاً موتی جھرا کے دو واقعات پے در پے اس لیے گورنمنٹ کو لکھا کہ جس زمانہ مین یہ الاؤنس مقرر ہوئی تھی صرف میرا بار اس پر تھا اور میں نے دراصل اصولاً اس پر زور دیا تھا اور بھائی Hailey[3] سے "دوستانہ" خط و کتابت عرصہ تک صرف اصول کے لیے جاری رکھی تھی۔ مگر ہمدرد کے بند ہو جانے کے بعد صرف یہی ایک ذریعہ معاش کا میرے اور میرے متعلقین کے لیے رہ گیا تھا۔ میرے ہی لیے کافی نہ تھا مگر ع

این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر۔ کے اصول پر جس طرح بن پڑا، اب تک کام چلایا مگر اس الاؤنس کے دو ٹکڑے کرنا اور چھ چھ برس کے دو ملازم نوکر رکھنا برابر ہے۔

[1] گزارہ معاش [2] گزارہ افتراق [3] سر ملکم ہیلی چیف کمشنر دہلی۔

سفر خرچ کی بھی گنجایش نہیں ہے۔ سفر خرچ دیا جائے اور الاونس مین اضافہ کیا جائے۔
یہ تحریر اب گورنمنٹ کے زیر غور ہے۔ نہ معلوم خزانۂ عامرہ کی کیا کیفیت ہے۔ تہی ساغر
ہے یا لبریزی۔ بہرحال متعلقین کا زیادہ رکھنا مناسب نہ تھا۔ ان کو یکم نومبر کو براہ پانگی پور
روانہ کر دیا ہے۔ ڈھائی تین ماہ بعد پھر آجائین گے۔ والدہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہم تنہا
رہ گئے تو بیچاری فوراً رخت سفر باندھ چل دین اور ۵ کو یہان آگئین۔ آپ اندازہ
کر سکتے ہین کہ اب تک مجھے کس قدر کم فرصت ملتی ہوگی۔ ۸ تک تو عزیزی مسعود کو
حرارت رہی اس کے بعد جا کر ٹوٹی اور بفضلہٖ تعالیٰ صحت کامل حاصل ہوگئی۔ مگر ۱۲ تک
تک سخت تردد تھا۔

اس قدر لمبی چوڑی معذرت کے بعد آپکے عنایت نامون کا جواب دیتا ہون۔
بھائی علوی[1] بھی مجھ سے کچھ خفا ہین کہ اب تک فلسفۂ اجتماع کی جلد روانہ نہ کی۔ مجھے پہلے بھی
خوف تھا اور اب تو آپ کے لکھنے سے اس خیال کو اور تقویت ہوگئی کہ آپ کو اجتماع
سے نفرت ہے۔ مگر تعجب ہے کہ صاحبزادہ .... صاحب کو بھی اس اجتماع سے
نفرت ہے اور آپ کو بھی اور پھر دونون مین نہ نبھ سکی[2]۔ نہ معلوم نفسیات القرآن مین
آپ وامرھم شوریٰ بینھم اور وشاورھم فی الامر کی شان مین کیا فرمائین۔
بہرحال فلسفۂ اجتماع کے دیکھنے کا مشتاق ہوں۔ ظفر الملک صاحب سے کہہ کر جلد روانہ کرائیے۔
سایکالوجی آف لیڈرشپ پر مین تو اپنی راے دے چکا ہون۔ سر ویلنٹائن شیرول[3] ایک

---

[1] یعنی مولوی ظفر الملک علوی (الناظر بک ایجنسی) [2] اب یہ کانفرنس سے واپس چلا آیا تھا۔

[3] برطانوی صحافت کا ایک نامور رکن۔ ٹائمس (لندن) کے شعبۂ خارجہ کا مدیر اعلیٰ، ہندوستان و مشرق کا سیاح (Chirol)
اس زمانہ مین ہندوستان آیا ہوا تھا۔ مین نے اپنی کتاب لیڈرشپ اسکی خدمت میں تحفۃً پیش کی تھی۔ اس نے اس کی ایک خط
میں بہت داد دی تھی۔ افسوس کی داد کو میں اس وقت معراج کمال سمجھتا تھا۔

جنیث وید باطن شخص ہے، نہ معلوم اس کی تعریف کی آپ نے کس طرح وقعت کی۔ وہ ہمارے لیے غلامی اور اپنے لیے خواجگی ہی کو پسند کرتا ہے۔ ابھی حال مین شملہ مین میرے ایک حیذ صفت دوست جگت رسنگہ صاحب نے ان کے لکچر مین صدارتی تقریر کی تھی اور فرمایا تھا کہ ۲۰ برس سے انھین مشرق بلا رہا تھا، ان کی مشرق کے حال پر یہ بڑی ہی نوازش ہوئی کہ تشریف لائے۔ "خانہ خانۂ تست" کا مضمون ہے۔ مگر کاش ان کو یہی سال سے[1] مغرب بھی پکارتا اور وہ اس کے حال پر بھی رحم فرماتے اور وطن مالوف کی طرف مراجعت فرماتے۔ مگر ان لوگون کی صرف یہی سزا ہے کہ قانونِ قدرت ان کی خاطر نہیں بدل سکتا۔ جو دوسرون کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ خود اس مین گرتا ہے۔ غلامی کو دوسرے کے لیے پسند کرنا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے اپنی غلامی کا۔ اگر اجتماع ہمارے لیے برا سمجھا جاتا ہے توکل کو خود ایسا کہنے والون کے لیے برا سمجھا جائے گا۔ روما کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ تاریخ اسلام خود اس کی شاہد ہے۔ جس طرح آپ مجھے لکھ رہے ہیں، اس سے تو نفسیات القرآن کے متعلق بھی میرا خوف روبہ ترقی ہے۔ "ناطرفدارانہ طرز ادا" مخالفین کے رام کرنے کے لیے شوق سے استعمال کیجیے لیکن اگر آپ کا قلب "ناطرفدار" ہے اور وہ حصہ جسم بھی جس مین ایمان جاگزین ہوتا ہے، محض ایک سادہ لوح ہے، جس پر آپ کی "عقلیت" کی بدولت کچھ نقوش منقش ہو گئے ہو تو ایک مسلم اور مومن سے آپ کیا توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ آپ کو مسلم اور مومن بھی سمجھے۔ جب ایک بار قلب نے اعتراف و اقبال کر لیا کہ آمنا وصدقنا تو پھر تو یہی صادق آنا چاہیے کہ "مجھے تو خوش ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے" گو روئے سخن خدا اور رسول

---

[1] یعنی کاش اپنے ہی ہان کو جنگ عظیم کو روک سکتے۔

کی طرف ہونا چاہیے۔ نہ کہ ہر گیسو دراز و ریش دراز کی طرف۔ مین اجتہاد پر ایمان رکھتا
ہون اور اس کو بہت ضروری بلکہ لابدی سمجھتا ہون۔ کورانہ تقلید میرا ہرگز مذہب نہین
اگر آپ اس طرح لکھیں کہ اپنا ایمان مقدمۂ کتاب مین واضح ہو جائے اور محض اس
Theory کی تشریح اصل کتاب مین جس سے خود آپ کے قلب کی لوحِ سادہ
پر تبدریج ایمان وعقیدہ منقش ہو گیا۔ تاکہ ناطرفدار تو ناطرفدار خود مخالفین کے
دلون پر کے کفر وشرک کے نقوش دھندلے پڑتے جائین اور بتدریج مٹ جائین۔
اور پھر اس ورق سادہ پر آپ کی کتاب کلمہ لا اِلٰہ اِلّا اللہ مُحمّد رّسُول اللہ جلی حروف
مین لکھ دے تو مین واقعی آپ کی نفسیات کی قدر کرون گا۔ برادرم ایمان ہر شئے پر مقدم
ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ جب مسلمانون نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفۂ اول بنایا تو
دراصل اس امر کا اعتراف کیا کہ ایمان ابوبکرؓ۔ عدل عمرؓ، غنا وحیائے عثمانؓ اور فقر وشجاعت
علیؓ سے بھی زیادہ قابل قدر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب آفتاب محمدی بہ تقاضائے بشری
۲۳ سال کی نبوت کے بعد غروب ہو گیا اور سارے عالم پر اندھیرا سا چھا گیا تو جو لوگ
ہر امر میں اس شمع ہدایت کی روشنی کے عادی ہو گئے تھے، خدا کی دی ہوئی آنکھین
بھی گویا کھو بیٹھے اور بعض مؤلفۃ القلوب کے ارتداد اور زندیق ہو جانے سے ان کے
ایمان بھی تھوڑی دیر کے لیے معرض خطر مین آ گئے۔ یہانتک کہ حضرت عمرؓ کو سوائے
اس کے کچھ نہ سوجھا کہ تلوار نکال کر کھڑے ہو گئے اور چلانے لگے کہ اگر کسی نے کہا کہ
محمدؐ (روحی فداہ) قضا کر گئے تو اس کی قضا اسی وقت اسی تلوار کے ذریعہ اس تک
پہنچ جائے گی۔ ایسے وقت مین وہ آمنّا وصدقنا کہنے والا آیا اور اس نے ایک
بدیہی امر ان سراسیمہ اور پریشان لوگون کو جتلایا۔ آفتابِ محمدی غروب ہو گیا تھا،

مگر خدا کا شمار آفلین مین نہ تھا۔ آفتاب اسلام اسی طرح درخشان تھا، بھائی، یہ سب ایمان کے کرشمے تھے۔ یہ فطرت صدیقی تھی، اگر کچھ کمی تھی، تو اس امین اعظمؐ کے ایمان نے پوری کر دی تھی۔ جب غار ثور مین ابوبکرؓ کو بتایا گیا تھا کہ وہاں سیکڑون دشمنون سے خائف اور مارے ڈر کے غار مین چھپے ہوئے صرف بندگانِ خدا ہی نہ تھے بلکہ ایک تیسرا اور بھی وہان موجود تھا، جو ان دونون کا نگران و نگہبان تھا۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا کی تعلیم کے بعد ایمانِ ابوبکرؓ پختہ ہوگیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ امینؐ کی خلافت صدیقؓ کو ملی۔ اگر آپ فلسفہ اور استدلال سے مدد لیتے ہین تو لیجیے مگر صرف اسیطرح اطمینان قلب کے لیے جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے مردہ زندہ کرنے کے لیے اطمینان قلب چاہا تھا۔ مخالف کے لیے دلیل اور ثبوت کے ہتھیار تیار کیجیے۔ استدلال و تحقیقات کی توپین اپنے کارخانۂ اسلحہ سازی مین ڈھالیے، یہ تو ایک مومن کے لیے ضروری ہین۔ تاکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر جاری رہے جس کے لیے ہم کو خیر امۃ کا لقب عطا ہوا ہے۔ مگر کیا یُومِنُونَ بِاللّٰہِ قرآن سے خارج کر دیا گیا ہے۔ مجھے اگر اعتراض ہے تو صرف اس پر کہ کہیں خود قلب و دماغ ناطرفدار نہ ثابت ہون۔ اسلوب بیان تمام تر ارسطو اور کانٹ کی کتابون پر تنقید کا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ ہم ان دونون کو مرکب من الخطا مانتے ہین، اور ان کی تقلید ہر امر مین فرض نہین جانتے مگر قرآن حرف بہ حرف فرمودۂ خدا ہے[1]۔ اور خدا خاطی نہین ہو سکتا۔ آپ شوق سے اُسے فرمودہ خدا ثابت کیجیے مگر خود آپ کے قلب کو مستغنی عن الحجۃ ہونا چاہیے۔ بھائی

[1] مین نے اپنی ملحدانہ شوخ چشمی کے ماتحت لکھ بھیجا تھا کہ نفسیات القرآن بالکل اسی آہنگ پر لکھی جائے گی، جس پر نفسیاتِ ارسطو یا نفسیاتِ کانٹ لکھی جاتی۔

جتنی شاعری چاہو باہر کی عورت پر صرف کرو اور اُسے لبھاؤ اور رام کرو۔ مگر گھر کی بیوی تمھاری ہے نہ دوسرے پر نظر ڈال سکتی ہے۔ نہ اس کو تمھاری گریہ وزاری اور التماس و گزارش کی ضرورت ہے۔ بلکہ اصل تو یہ ہے کہ بقول میرے ؎

نہیں جز دل کی ضرورت کوئی دل آنے میں ۔۔۔ نہ تبسم کی ضرورت نہ نگہ کی حاجت

غزالی کا فلسفہ مجھ سے زیادہ آپنے پڑھا ہوگا۔ ان کی احیاء العلوم کا اگر ترجمہ فرانسیسی زبان مین ہو گیا ہوتا تو ڈیکاوٹ کو دنیا چور سمجھتی۔ مگر ان کی خود تصنیف کردہ سیرۃ بلکہ سوانح قلبی و دماغی کو ملاحظہ فرمایئے، آخر مین اسی کا اعتراف ہے کہ اصل وہی مشاہدہ ہے جو حیاتِ ظاہرہ سے مستغنی اور استدلال و حجت سے بے نیاز ہے۔

خدا نے ہم پر بڑا رحم فرمایا جو مسلمان کے گھر پیدا کیا۔ Heredity[1] کا رجحان اسلام و توحید کی طرف، تربیتِ اسلام اور توحید کے دائرہ مین۔ اگر اس پر ہمارے فلسفہ نے ہماری امداد کی ہے تو سونے پر سہاگا ہے۔ اسلام اور ایمان کو اور بھی تقویت ہو گئی اور عقل و نقل دونون کی زد سے باہر ہو گئے۔ اب نہ ارسطو کا جادو چل سکتا ہے نہ کانٹ کا۔ لیکن اگر صرف استدلال ہی پر بھروسہ ہے اور خود اپنی عقل پر اس قدر زعم ہے کہ جو اس مین نہ سمائے وہ خدا نہین اور جو اس میں نہ آئے وہ ایمان نہین۔ تو اس کا جواب یہی ہے کہ "پائے استدلالیان چوبین بود" اور باوجود اس کے کہ میرے اور شاید آپ کے بھی استاد (شبلیؒ) آخر مین اسی ہیئت سے چلتے تھے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ "پائے چوبیں سخت بے تمکین بود"۔ خواہ کسی طرح تفسیر کیجئے، مگر قرآن خود صاف کہہ چکا ہے کہ علم انسانی بہت ہی کم ہے۔ میں اس کا ضرور قائل ہوں کہ خواہ کسی قدر کم

---

[1] یعنی وراثت۔

کیوں نہ ہو وہ خدا کی دین ہے اور ایمان کے بعد اس کی بہترین دین، بلکہ اس کے بغیر ایمان کمزور و ضعیف رہتا ہے۔ اس لیے اس کا پورا پورا استعمال کرنا چاہیے۔ اور ایمان کے لیے علم کا پشتہ ایمان کو مستحکم کرنے والا ہوتا ہے، اس لیے اس کے ذریعہ سے ایمان کا استحکام کرنا چاہیے۔ مگر زعم علم سے پرہیز ضروری ہے۔ خدا کی رحمت ہو اقبال پر خوب تعلیم مولانا روم کا اہتمام کر رہا ہے[۱]۔

پرزن و از جذبِ خاک آزاد باش ‎ ‎ ہمچو طائر ایمن از افتاد باش

تو اگر طائر نۂ اے ہوشمند ‎ ‎ بر سرِ غار آشیانِ خود مبند

اے کہ باشی در پئے کسبِ علوم ‎ ‎ با تو می گویم پیامِ پیرِ رومؒ

"علم را بر تن زنی مارے بود ‎ ‎ علم را بر دل زنی یارے بود"

آگہنہ از قصۂ اخوندِ روم ‎ ‎ آں کہ داد اندر حلب درسِ علوم

پائے در زنجیرِ توجیہاتِ عقل ‎ ‎ کشتیش طوفانیِ ظلماتِ عقل

موسیٔ بیگانۂ سینائے عشق ‎ ‎ بے خبر از عشق و از سودائے عشق

از تشکک گفت و از اشراق گفت ‎ ‎ وز حکم صد گوہرِ تابندہ سفت

عقدہ ہائے قولِ مشائین کشود ‎ ‎ نورِ فکرش ہر خفی را وانمود

گرد و پیشش بود انبارِ کتب ‎ ‎ بر لبِ او شرحِ اسرارِ کتب

پیرِ تبریزیؒ ز ارشادِ کمال ‎ ‎ جست راہِ مکتبِ ملا جلال

گفت این غوغا و قیل و قال چیست ‎ ‎ این قیاس و وہم و استدلال چیست

پائے خویش از مکتبش بیرون گذار ‎ ‎ قیل و قال ست این ترا با وے چہ کار

[۱] اقبال کی اس وقت تک صرف دو ابتدائی مثنویاں اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی شائع ہوئی تھیں۔

قالِ ما از فہمِ تو بالا تر است
شیشۂ ادراک را روشن گر است

حرفِ ملا شمس را حالت فزود
آتشے از جانِ تبریزی کشود

بر زمین برقِ نگاہِ او فتاد
خاک از سوزِ دمِ او شعلہ زاد

التہابِ دل خسِ ادراک سوخت
دفترِ آن فلسفی را پاک سوخت

مولوی بیگانہ از اعجازِ عشق
ناشناسِ نغمہ ہاے سازِ عشق

گفت این آتش چسان افروختی
دفترِ اربابِ حکمت سوختی

گفت شیخ اے مسلمِ زنار دار
ذوق و حال است این ترا با وے چہ کار

حالِ ما از فکرِ تو بالا تر است
شعلۂ ما کیمیاے احمر است

ساختی از برفِ حکمت ساز و برگ
از سحابِ فکرِ تو بارد تگرگ

آتشے افروز از خاشاکِ خویش
شعلہ تعمیر کن از خاکِ خویش

علمِ مسلم کامل از سوزِ دل است
معنیِ اسلام ترکِ آفل است

چون ز بندِ آفل ابراہیم رست
در میانِ شعلہ ہا نیکو نشست

علمِ حق را در قفا انداختی
بہرِ نانے نقدِ دین در باختی

گرم رو در جستجوے سرمۂ
واقف از چشمِ سیاہِ خود نۂ

آبِ حیوان از دمِ خنجر طلب
از دہانِ اژدہا کوثر طلب

سنگِ اسود از درِ بتخانہ خواہ
ق
نافۂ مشک از سگِ دیوانہ خواہ

سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجوے
کیفِ حق از جامِ این کافر مجوے

مدتے محوِ تگ و دو بودہ ام
راز دانِ دانشِ نو بودہ ام

باغبانان امتحانم کردہ اند
محرمِ این گلستانم کردہ اند

گلستانے لالہ زار عبرتے — چون گل کاغذ سراب نکہتے

تا ز بند ایں گلستاں رستہ ام — آشیاں بر شاخِ طوبیٰ بستہ ام

دانشِ حاضر حجاب اکبر است — بت پرست و بت فروش و بت گر است

پا بہ زندان مظاہر بستۂ — از حدودِ حس بروں ناجستۂ

در صراط زندگی از پا فتاد — بر گلوے خویشتن خنجر نہاد

آتشے دارد مثال لالہ سرد — شعلہ ہاے او مثال ژالہ سرد

فطرتش از سوز عشق آزاد ماند — در جہانِ جستجو ناشاد ماند

عشقِ افلاطون علت ہاے عقل — بہ شود از نشترش سوداے عقل

جملہ عالم ساجد و مسجود عشق — سومناتِ عقل را محمود عشق

ایں مئے دیرینہ در میناش نیست

شور "یارب" قسمت شبہاش نیست

لکھنے بیٹھا تھا خط، مگر لکھ گیا اقبال کی مثنوی شریف۔ مگر چونکہ بہ حیثیت ادب کے اس کا پایہ میری نثر سے اتنا ہی اونچا ہے، جتنا کہ زمین سے آسمان کا، اور آپ باوجود فلسفی ہونے کے ادب کو استدلال پر مرجح سمجھتے ہیں، اس لیے اسرار خودی کا یہ حصہ نقل کر دیا گیا۔ امید ہے کہ تشفی ہو گئی ہو گی۔

رہا ظریف مرحوم[1] کا معاملہ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ مجھے مرحوم سے بے حد محبت تھی۔

---

[1] ظریف محمد۔ ایم۔ اے (علیگ)۔ ان کی کتاب "اسلام اور عقلیت" دہریت و الحاد سے لبریز تھی۔ بڑے توانا و تندرست تھے، عین عالم شباب میں دفعتاً انتقال ہو گیا۔ میں نے محمد علی سے پوچھا تھا کہ آپ کے اس دینی جوش اور بھی تند تقشف کے ساتھ آپ سے اور ظریف سے دوستی کیونکر تھی؟ سنا ہے کہ ظریف غالباً ۱۹۱۵ء میں موت سے پہلے تائب اور از سر نو مسلمان ہو چکے تھے۔

میں ان کی قابلیت اور اس سے زیادہ ان کی محبت کا قدر دان تھا۔ مگر ان کی فلسفیانہ گفتگو کو میں ہمیشہ ہذیان سرائی سمجھا اور وہ مجھے اس کا قدر دان نہ پاکر محض اپنی ہیبت (؟) اور ظرافت اور محبت سے محظوظ فرمایا کرتے تھے۔ ایک مصرع غالب کا مجھے لکھا

"دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز"

مطلب یہ تھا کہ دعا وغیرہ سب کچھ لغو ہے۔ جس کے پاس توپ گولہ نہیں وہ ضرور ہارے گا نہ دنیا کا کوئی خدا ہے نہ اس کا کوئی بندہ نہ وہ بندہ نواز۔ بندگی بیکار ہے۔ انکی "عقلیات" صرف یہیں تک راستہ روشن کرتی تھی۔ مگر ۱۲ جون ۱۹۱۳ء کو ایڈریانوپل پھر غازی انور پاشا ادام اللہ فیضہ کے قبضہ میں آگیا اور دائرہ حکومت اسلام میں از سر نو داخل ہوا۔ اور شبلی مرحوم کا شعر جو انصاری صاحب کے مشن کی واپسی والی نظم میں تھا، صادق آیا ؎

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے — کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھا ہے

اس کو عقلیات کہیے یا نقلیات، بہر حال شبلی مرحوم کا شعر، ظریف مرحوم کی "ظرافت" سے صحیح تر تو اسی وقت ثابت ہو چکا تھا۔ بحمد اللہ اب خون شہیدان رنگ لایا ہے،[1] ہوا والے قلعہ نے صحیح ترین ثابت کر دیا۔ میں مرحوم سے اوائل ۱۹۱۴ء میں کلکتہ میں ملا۔ ہم دونوں تفریح کے لیے چندر نگر گئے تھے اور شب ماہ میں دریائے ہگلی کی سیر ساتھ ساتھ کی تھی۔

"مسلم قومیت کا دریا بھی موجزن تھا۔ وہ تو یہی کہتے تھے اسلام اور ایمان نہیں ہے۔ مگر ایمان چھپائے سے نہیں چھپتا۔ قرآن کریم کے بے مثل ادب کے قائل تھے۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ

[1] مصرعہ حضرت اکبر الہ آبادی کی ایک مشہور نظم کا ہے۔

الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ کے ادب پر وجد کرتے تھے۔ اس کے چند ماہ بعد مین رامپور گیا اور نظر بند ہوا، وہان نصیر حسین خان خیال[۱] کا خط آیا کہ مرحوم تفریحاً ایام رخصت مین وزیگاپٹم گئے تھے، وہان سے تار آیا ہے کہ اُن کا یکایک انتقال ہوگیا۔ ان کے پسماندگان کو اطلاع دیدو کہ مال اسباب لے جائین۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن مرحوم پر آج ہم سے کہین زیادہ اسرار ہستی آشکارا ہو گئے ہون گے۔ امید ہے کہ خاتمہ اسلام اور ایمان پر نہ کہ عقلیات پر ہوا ہو۔ دل سے مرحوم کے لیے وہ دعا نکلتی ہے، جس کے قبول ہونے کا انھین اقبال بھی نہ تھا، آپ کو تو بفضلہ تعالیٰ خدا اور رسول کا انکار نہین ہے۔ برائے خدا و رسول اپنی عقل و تمیز، علم و تحقیقات کو اسلام اور صرف اسلام کے لیے وقف کر دیجئے۔ اور اس دانشِ حاضر کے حجابِ اکبر مین مستور و محجوب نہ رہیے۔

آپ نے مارگولیتھ کا ذکر فرمایا ہے۔ مین وہ بدنصیب ہون کہ اس مردود و خبیث ولعین سے آکسفورڈ مین عربی پڑھی ہے۔ عربی اس کی مادری زبان ہے[۲]۔ قابلیت علمی بیشک بہت رکھتا تھا۔ مگر دشمن اسلام اور سب سے زیادہ زہر آلود کتاب سیرۃ النبیؐ پر اسی لئیم کی تصنیف کردہ ہے۔ مجھے خوف ہے کہ ہمارے لٹریری نوجوان اس کے پھندے مین آکر نبی امیؐ (روحی فداک یا رسول اللہ) کو عرب کا بطل اعظم نہ سمجھنے لگیں، اور

---

[۱] ابابھی مرحوم ہو چکے ہین۔ پٹنہ کے ایک ادب نواز شیعہ رئیس تھے۔ ان ہی کی روایت ہے کہ ظریف آخر عمر مین تائب ہو گئے تھے۔ خدا کرے صحیح ہو۔ [۲] مارگولیتھ کی مان ایک شاہی عورت تھی۔

رحمۃ للعالمین کے خدائی لقب سے محروم نہ کر دیں۔ سر ولیم میور کی سیرۃ میں سید احمد خان مرحوم نے بھی سب سے بڑا عیب اور پوشیدہ مطلب ڈھونڈ نکالا تھا۔ اور خطبات احمدیہ اسی غرض سے لکھ کر بہ صرف کثیر انگریزی میں ترجمہ کرا کے طبع کرائی تھی۔[1]

ہمدم سے میں قطعی خوش نہیں۔ نہ اس سے زیادہ کی اس سے توقع بھی تھی۔ اس جنگ کے خاتمہ پر ایک جنگ اور چھڑے گی اور وہ بھائی جالب سے میری ہوگی ہو casus belli (بنائے مخاصمت) وہ دو چشمی "ھ" ہوگی جو ان کے "ہمدم" کے نیچے لگی ہے خدا کی مار ہو "ہمدرد" کو اگر اس نے "ہمدم" کے قالب میں جنم لیا ہے۔ اور خدا سمجھے میر اکبر حسین ابن الوقت معروف بہ "لسان العصر" سے جنھوں نے "ہمدرد" کی سرخی وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا کو "ہمدم" کے لیے یوں بدلا ہے۔ میری غزلوں کی تعریف وہ فرمائیں یا آپ یا آپ کے احباب۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ادب میں داخل نہیں ہیں، محض میرے درد کی آوازیں ہیں۔ "دیکھیے کب تک رہے" والی زمین شگفتہ کیونکر ہو سکتی ہے، گو چشم انتظار وا ہونے سے شگفتہ چیزوں میں شمار ہو سکے تو اور بات ہے۔ حال میں چند اشعار لکھے ہیں اور لکھ کر غزل پوری کر دوں گا۔ غالب کا ایک شعر مانع اظہار وحشت ہو رہا ہے اور ورد زبان ہے۔ اس کی ردیف کو محدود کر کے غزل لکھ رہا ہوں۔ وہ شعر یہ ہے

چاک مت کر جیب بے ایام گل — کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

اسی پر چند اشعار لکھے ہیں۔

صبر پہلی شرط غمخواری کی ہے — ضبط کا یارا دوں میں یارا چاہیے

---

[1] مارگولیتھ کے مقابلہ میں میور ہزار درجہ غنیمت تھا۔ مارگولیتھ کی زہر افشانی کی کوئی حد نہیں۔

تھک کے کہتا ہوں جنوں کیسا حجاب | خاک اڑانا آشکارا چاہیے
دشمنوں سے گر "تلطف" ہے تو کچھ | دوستوں سے بھی مدارا چاہیے

(حافظ تو تلطف کی صلاح دیتے تھے، مگر آج کل این ہم غنیمت است)

ایک ہی در کا بھکاری ہوں مجھے | ایک فقط تیرا سہارا چاہیے

نہ معلوم کیوں ان ایام حج بیت اللہ میں بار بار یہ شعر زبان پر آتا ہے ؎

تم تو کعبہ کے خدا تھے پھر نکالے کیوں گئے | اے بتو! کیسے خدائی ہوتے ہوتے رہ گئی

اس پر ایک شعر خود بھی لکھ دیا ہے، بلکہ یوں کہیے کہ بے اختیار زبان پر آگیا۔

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا | کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دیکھئے یہ دونوں غزلیں کب پوری ہوں۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔ امید ہے کہ میری مذہبی "نقادی" بار خاطر نہ ثابت ہوگی۔

خوب یاد آیا المعارف[1] میرے پاس نہیں آتا۔ شکر خدا کہ بھائی ظفر الملک نے الناظر تو بھیجنا شروع کر دیا۔ ہاشمی[2] جوہر و حسرت کی نئے مین کچھ لکھ گئے مگر سنا ہے کہ جوہر پر پہلے بھی کچھ لکھا تھا، دیکھنے کا خواہشمند ہوں۔ میں تو پہلے ہی سے اسکا قائل ہوں کہ

تم ہو تو نذر عشق نہ لکھیں وہ مرثیہ | یہ بات ہے مروت اہل سخن سے دور

آپ کا خیر طلب محمد علی۔

---

[1] مراد معارف (اعظم گڈھ)، "المعارف" ایک اور رسالہ تھا، چند قبل علی گڈھ سے نکلا تھا، اور اب مدت ہوئی بند ہو چکا تھا۔ [2] سید ہاشمی فرید آبادی۔

باب (۱۰)

۱۹۱۶-۱۹ء

(اسٹیشن کا ایک پر اثر سفر، راس مسعود، مولانا سید سلیمان ندوی)

محمد علی کے ایک رفیق خاص الخاص راجہ غلام حسین[1] پنجابی تھے، علی گڈھ کے ناموراولڈ بوائے انگریزی لکھنے میں محمد علی کے شاگرد رشید۔ کامریڈ میں مدتوں سب ایڈیٹر رہے۔ جب کامریڈ اپنے ایڈیٹر کی نظر بندی پر بند ہوگیا، تو یہ لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں اس وقت ایک انگریزی روزنامہ انڈین ڈیلی ٹیلیگراف نکلتا تھا۔ اس میں منسلک ہوگئے۔ پھر کچھ روز بعد غالباً راجہ صاحب محمود آباد کی مالی امداد سے آخر ۱۹۱۶ء یا شروع ۱۷ء سے اپنا ایک مستقل انگریزی ہفتہ وار نیو ایرا (New Era) کے نام سے نکالا۔ اور اس کی بھی خوب دھوم دھام رہی۔ محمد علی خود تو چھندواڑہ میں تھے اور ان کے یہ نائب اول لکھنؤ میں۔ ان کے گرد "محمد یوں" کا ایک پورا حلقہ قائم۔ چودھری خلیق الزماں، شعیب قریشی، ڈاکٹر ناظر الدین حسن بیرسٹر ایٹ لا، ڈاکٹر نعیم انصاری، عبد الولی لکھنوی اور بارہ بنکی کے شیخ ولایت علی "بمبوق"، عبد العزیز انصاری وغیرہم، ایک ایک فرد جوش ملی سے لبریز۔ اور ان سب کے علاوہ فرنگی محل ———— ایسا مجمع اب

---

[1] راجہ، پنجابی مسلمانوں کے ایک قبیلہ کا نام تھا۔ یہ مراد نہیں کہ وہ کوئی رئیس یا نواب تھے۔

کبھی کیوں دیکھنے مین آنے لگا! ———— نیو ایرا ایک خاصی حد تک کا مریدکا قائم مقام ہو چلا تھا۔ پرچہ ابھی چند ہی مہینہ نکلا تھا، کہ غلام حسین بیچارہ کا بلاوا عالم بالا سے آگیا۔ اچھے خاصے ہٹے کٹے جوان، سرِشام سڑک پر ایک چھوٹے ہوئے گھوڑے نے پیچھے سے آکر زور سے ٹکر دی، اور یہ غریب اسپتال مین پہنچ کر راہی ملکِ بقا ہوگئے۔ محمد علی ظاہر ہے کہ اس ساری مدت مین سیکڑون میل دور نظربند تھے، لیکن اُن کے ذکرِ خیر سے لکھنؤ کی یہ محفلین ہر وقت گرم رہتیں، اور اٹھتے بیٹھتے خدا معلوم کتنے موقعون اور کتنے مختلف طریقون سے اُن کا نام زبانون پر آتا رہتا۔ بلکہ نیو ایرا نے سنسر کی آنکھ بچا کر واللہ اعلم کیونکر اُن کے ایک آدھ مضمون بھی حاصل کر لیے اور انھین گمنام چھاپ بھی دیا تھا۔

شروع ستمبر مین میرا جانا حیدر آباد (دکن) ہوا۔ عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی، اور کلاسون کے کھلنے سے ایک سال قبل ایک مستقل "سررشتۂ تالیف و ترجمہ" درسی کتابون کی تیاری کے لیے قائم ہو گیا تھا، اور مین اسی کے شعبۂ فلسفہ کے لیے ناظمِ تعلیمات سید راس مسعود صاحب (جو بعد کو نواب مسعود یار جنگ ہوئے) اور ناظمِ سررشتہ مولوی (ڈاکٹر) عبد الحق صاحب کی تحریک پر طلب ہوا تھا۔ سال بھر وہان رہنا ہوا۔ محمد علی سے مراسلت یہاں سے بھی کبھی کبھار رہی۔ جواب مین کم از کم دو خط تو اُدھر سے بھی آنے یاد ہین۔ افسوس ہے کہ وہ دونون محفوظ نہ رہے۔ ایک خط کا صرف اتنا ٹکڑا یاد ہے کہ مین نے راس مسعود صاحب کی کچھ شکایتین لکھ کر بھیجی تھین ———— سابقہ رہنے کے بعد اچھے اچھے دوستون کے بھی آپس مین رنجش پڑ جانے کے واقعات دنیا

میں اتنا کچھ نہیں ——— میرے خیال کی اُدھر سے تائید ہو کر آئی۔ محمد علی کو یہ اپنی شکایتیں، صحیح یا غلط، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سے اُن کے استبداد اور خشک ضابطہ پرستی کی تھیں۔ وہی شکایتیں اب انھیں ان کے داماد (راس مسعود صاحب) سے بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ ان کا فقرہ غالباً یہ تھا:۔

"راس مسعود صاحب اس وقت وہاں سرسید کے پوتے بنکر ان کی گدّی پر نہیں، بلکہ داماد مسعود پاشا کی حیثیت سے اپنے خسر کی کرسی پر بیٹھے ہیں"۔

۱۸ء کی آخری سہ ماہی میں واپس آ گیا اور اب پھر قیام لکھنؤ میں رہنے لگا۔

شروع ۱۹۱۹ء کا زمانہ تھا، غالباً جنوری کی کوئی تاریخ کہ نظر بند علی برادران کو کسی اہم خانگی ضرورت کی بنا پر چند روز کے لیے چھندواڑہ سے وطن یعنی رامپور جانے کی اجازت ملی، پولیس کی چوکی پہرہ میں نظر بندی کا سلسلہ ابھی ختم کہاں ہوا تھا، چل ہی رہا تھا۔ راستہ وہی لکھنؤ ہو کر تھا۔ سہ پہر کا وقت۔ پنجاب میل لکھنؤ اسٹیشن پر ۲۰، ۲۵ منٹ ٹھہرتا تھا۔ آج دونوں بھائیوں کے پیر و مرشد اور وقت کے مشہور عالم اور لیڈر مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ بھی اسٹیشن پر موجود تھے۔ گاڑی رُکی، اور معاً دونوں بھائی مولانا کی طرف قدمبوسی کے لیے لپکے۔ اُدھر سے خود مولانا بھی اسی تیزی کے ساتھ ان دونوں کے قدم لینے کو بڑھے۔ اور منظرِ عام پر ایک خاصی کشمکش باہم شروع ہو گئی۔ ان کو ان کے قدموں پر جھکنے پر اصرار، اُن کو اِن کے! ضابطہ سے ظاہر ہے کہ مولانا مرشد تھے، اور علی برادران مرید۔ لیکن اس باہمی برتاؤ کو دیکھ، دیکھنے والے اس حیص بیص میں پڑ گئے کہ مرشد کسے ٹھہرائیں اور مرید کس کو قرار دیں! ——— شمس تبریزی اور مولانا رومی

کے باہمی عشق و محبت کے قصے بھی تو کچھ اسی طرح کے مشہور رہین !

محمد علی حسب عادت حاضرین مین سے بڑے چھوٹے ایک ایک سے ملے۔ آج کے زائرین مین ایک بڑی تعداد دار العلوم ندوہ کے طلبہ کی تھی۔ محمد علی نے فرمایش کی کہ آپ لوگون مین سے کوئی خوش لحن ضرور ہوگا۔ سورۂ یوسف کا پندرہوان رکوع ذرا سنائیے

محمد علی کو قرآن مجید کی بعض اور آیتوں کی طرح ان دو آیتوں سے بھی عشق خصوصی تھا:-

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ	اے جیل کے دونوں رفیقو، یہ بتاؤ کہ الگ الگ معبود اچھے یا اکیلا اللہ سب پر غالب، کیسے غضب کی بات ہے، تم اسے چھوڑ کر صرف نامون کی پوجا کرتے ہو، جنھیں تم نے اور تمھارے بڑوں نے گڑھ رکھا ہے، اللہ نے تو کوئی دلیل انکی اتاری نہیں حکومت تو بجز اللہ کے اور کسی کی نہیں، حکم ہو کہ بجز اس کے کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا دین ہے، پر (افسوس ہے کہ) اکثر لوگ اس سے بے خبر ہین۔

محمد علی کیلیے یہ کلام قال نہین رہا تھا، حال بن چکا تھا۔ اسے سنکر وجد مین آجاتے، روتے، ہاتھ پیر پٹختے۔ فرمایش کی تعمیل ہوئی۔ پنجاب کلکتہ میل کی سی اہم گاڑی، اور لکھنؤ اسٹیشن کا پہلے نمبر کا پلیٹ فارم نمبر ایک۔ مسافرون کی بھیڑ اور پھر مشتاقانِ دید کا بھی خاصہ ہجوم۔ سب ادد گرد حلقہ باندھے

کھڑے۔ اور درمیان میں محمد علی۔ کلام پاک کے بول خوش الحان قاری کے منہ سے نکل رہے
ہیں اور محمد علی کی آنکھوں سے آنسو جاری۔ اتنی دیر پلیٹ فارم پر نہ غل غپاڑہ، نہ شور و
ہنگامہ۔ سب کے سب خاموشی کے ساتھ صورتِ تصویر۔ زمانہ یاد کر لیجئے کہ سنہ ۱۹۱۹ء کا تھا۔
سردی کا موسم۔ فرسٹ اور سکنڈ کے مسافر کثرت سے انگریز۔ یہ سب اور انگریز حکام دونوں
دور کھڑے یہ منظر حیرت سے دیکھ رہے ہیں! ریل چھوٹنے پر ہوئی، گھنٹی بجی، اور قرأت موقوف
محمد علی کوئی بہتر سے بہتر تقریر کر ڈالتے، جب بھی شاید یہ سماں اتنا مؤثر
نہ بندھ سکتا!

گاڑی چلی، اور میں سندیلہ اسٹیشن تک کے لیے ساتھ ہو لیا۔ میں پہلے سے کہہ بھی رکھا تھا۔
شوکت علی غریب نے دو ایک بار اپنی طرف مخاطب کرنا چاہا، میری اس وقت کی خود بینی ان
بیچارہ کو کب خاطر میں لاتی تھی۔ اب جب خیال آجاتا ہے تو اپنے اوپر نفرین کرنے لگتا ہوں
بہرحال بحث و مباحثہ جو کچھ بھی رہا، محمد علی ہی سے رہا۔ میں نے اپنے کسی خط میں یہ گستاخ
اور گندہ فقرہ بھی لکھ دیا تھا ——— آگے بڑھنے اور فقرہ پڑھنے سے پہلے پھر ایک دفعہ
اس حقیقت کو مستحضر کر لیجئے کہ اس فقرہ کا لکھنے والا، وہ نام نہاد "مولانا" نہیں جو ۵۵
۵۶ سال کی عمر میں یہ ڈائری مرتب کر رہا ہے۔ بلکہ ۲۶، ۲۷ سال کی عمر کا ایک "عقلیت پرست
(رشنلسٹ) ملحد تھا ——— کہ "سنا ہے آپ اس فرصتِ نظربندی میں قرآن رٹ رہے
ہیں لیکن قوم میں بہت سے حافظ نبی بخش اور حافظ غلام رسول پہلے ہی سے موجود ہیں۔
ضرورت تو اس وقت کامریڈ کے ایڈیٹر کی ہے"۔ بس اسی فقرہ پر لے دے شروع ہوئی،
اور گفتگو کا آغاز اس طرح فرمایا، کہ "کیوں صاحب، اب حافظ نبی بخش بیچارہ حقارت
کے لیے ضرب المثل ہو گئے ہیں"۔ اور پھر خط میں لکھا ہوا تو شاید ایک ہی آدھ جواب آتا،

زبانی تقریر مسلسل جوابات ہی کی نذر رہی ——— کامریڈ کا ایڈیٹر، اور شیکسپیر کے ڈراموں کا نادر و شارح، اور اولڈ بوائز کے جلسہ مین رقص کرنے والا، اب دین کا مبلغ داعی بن چکا تھا۔ اُسے دھن تھی، تو اسی کی۔ اور ریلوے کمپارٹمنٹ اور مسجد کا منبر دونون اب اس کی نظر مین ایک تھے۔

دارالمصنفین (اعظم گڈھ) سے میری وابستگی اور نیازمندی اُن کے علم مین تھی۔ معارف اور اہلِ معارف کا ذکر خیر رہا۔ مولانا سید سلیمان ندوی سے متعلق ایک فقرہ اب بھی کان مین گونج رہا ہے۔ "ابھی باہر نکلنے پر سید سلیمان سے کام لینا ہے"۔ "کام" سے مراد وہی دعوت وتبلیغ تھی۔

———— . ————

باب (۱۱)

سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء

(رہائی - لیڈری، خلافت و ترک موالات)

رامپور سے واپسی چند روز بعد ہوئی۔ لکھنؤ اسٹیشن پر ایکی بھی مین نے حاضری دی، اور ایکی بھی اسٹیشن کی حاضری کو ناکافی سمجھ، پنجاب میل کے رکنے والے پہلے اسٹیشن رائے بریلی تک ساتھ گیا۔ درجہ اتفاق سے خالی تھا، اور رائے بریلی تک وقت بھی اچھا خاصہ لگتا ہے۔ باتوں کا موقع خوب مل گیا۔ ٹائمس (لندن) کے لٹریری سپلیمنٹ کا تازہ پرچہ میرے ہاتھ مین تھا۔ محمد علی اس میدان کے مرد تھے ہی، لیکن دو ہی چار منٹ بعد علمی و ادبی موضوع چھوڑ، اپنے اسی محبوب موضوع، دعوت و تبلیغ پر آگئے۔ آواز بڑی ہوئی، گلا بیٹھا ہوا تھا۔ خدا معلوم میری طرح اور کتنے بکواس کرنے والے انھین پہلے مل چکے تھے۔ آواز کھولنے والی ڈاکٹری گولیان ساتھ تھین۔ اُن کے سہارے مجھ ملحد کو قائل معقول کرنے پر آمادہ ہوگئے ــــــــ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ہر ہر فرد کو تبلیغ کرنا اب اپنا فرض سمجھ لیا تھا ــــــــ اور اپنی آواز گاڑی کی سے شدید گڑگڑاہٹ پر غالب رکھی!

خبر اُس زمانہ مین، گرم تھی کہ نظر بندی سے رہائی عنقریب ملنے والی ہے۔ اس کا [illegible]

دیکھ میں نے عرض کیا کہ " آپکے باہر آنے پر کامریڈ اور ہمدرد تو یقیناً نکلیں گے، اور جلد سے جلد نکلیں گے، تقریباً کب تک؟" بولے کہ " نہیں، اخبارات کا خیال تو فوراً نہیں۔ باہر اگر تو سب سے پہلے دورہ کرنا ہے، اور بجائے قلم کے زبان سے تبلیغ کرنا ہے، ہندوستان کے طول و عرض میں بھی اور یورپ جا کر بھی" ———— دنیا کے ہوش و فرزانگی پر اب دین کی مستی اور دیوانگی غالب آ چکی تھی!

اسٹیشن قریب آنے لگا، تو موضوع شعر و سخن کا چھڑا۔ اور گاڑی جب پلیٹ فارم آ کر رکی، تو اپنی تازہ نظم شہدائے کلکتہ پر سنائی۔ ۱۹۱۸ء میں ایک انگریزی اخبار کے جرم توہین رسول سے مشتعل ہو کر مسلمانوں نے بلوہ کر دیا تھا۔ اور بہت سے مسلمان پولیس کی گولیوں سے شہید ہو گئے تھے۔ کامریڈ ابتداءً کلکتہ ہی سے نکلا تھا، اور محمد علی کو بعض دوسرے مقامات کی طرح کلکتہ سے بھی خاص انس تھا۔ تین شعر اس شہادت نامہ کے ملاحظہ ہوں :۔

اللہ نے بڑھائی ہے کیا شانِ کلکتہ	روحِ رسول آج ہے مہمانِ کلکتہ
ہر سو ہیں لاشہ ہائے شہیدانِ سرخ پوش	ہے آج گل بہار پہ ایمانِ کلکتہ
ہے امتحانِ منافق و مومن کا دوستو	میزانِ حشر بن گئی میدانِ کلکتہ

رہائی اُس وقت تو نہ ہوئی۔ بلکہ چھندواڑہ کی نظربندی کے بعد کچھ دن بیتول جیل کے اندر بھی کاٹنے پڑے۔ دسمبر ۱۹ء ختم ہو رہا تھا، جب رہائی کا حکم ملا۔ یہیں اُس وقت انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس دور دراز شہر امرتسر میں ہو رہا تھا۔ دونوں بھائی بجائے وطن جانے کے اور کچھ دن بیوی بچوں میں گزارنے کے، سی پی سے ہزار بارہ سو میل

شوق کے پرون سے اڑکر (ہوائی جہاز اس وقت تک کہان نکلے تھے) امرتسر پہنچے۔ اور ان بھائیون کی شرکت گویا ساری مسلم قوم کی شرکت تھی ——— مسلمان بحیثیت قوم اب تک کانگرس سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ بلکہ چند سال اُدھر تو اسے ہوّا سمجھ اس کے نام سے کانون پر ہاتھ رکھتے تھے۔ کلکتہ مین مولانا ابوالکلام اور ایڈیٹر مجیب الرحمن اور بیرسٹر عبدالرسول، اور پٹنہ مین بیرسٹر مظہرالحق اور بمبئی کے بیرسٹر جناح جیسے دس بیس سو پچاس نیشلسٹ قسم کے مسلمان اگر جیوٹ کرکے شریک ہوئے بھی تو کیا۔ شرکت ان ہی خال خال افراد تک محدود رہی۔ عام مسلمانون کے کانون پر جون بھی نہ رینگی۔ کانگرس کی تاریخ مین پہلی بار یہ ہوا کہ جب چہرہ پر داڑھیاں رکھائے ہوئے، ٹوپیون پر نشانِ ہلال لگائے ہوئے، اور زبانون سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے ہوئے ان دونون بھائیون نے کانگرس کے پنڈال مین قدم رکھا۔ تو ساتھ مین ایک لاؤلشکر بھی تھا۔ اور ——— "علی" برادران کا نام ذہن مین رہے ——— "یاعلی" کے نعروں سے ملک کا ملک گونج اٹھا!

امرتسر سے واپسی مین لکھنؤ بھی اپنے پیرومرشد سے ملنے آئے۔ سلسلۂ بیعت میں اپنے اسی نظربندی کے زمانہ مین داخل ہوگئے تھے، یا کرلیے گئے تھے۔ لکھنؤ مین مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم ومغفور کی ذات بھی عجب جامع صفات تھی۔ فیاضی، سیرچشمی، جہمان نوازی، خلق ومروت مین اپنی نظیر آپ۔ دسترخوان کی وسعت، دوست ودشمن وموافق ومخالف کی تفریق سے ناآشنا۔ محمد علی ہی کی طرح، مولانا بھی اُن چند لوگون مین تھے جو دوسرے کو کھلاکر خوش ہوتے، اور بجائے اُس پر احسان رکھنے کے الٹے اس کے شکرگزار ہوتے۔ فرنگی محل میں اُن کی وسیع حویلی محل سرا کے پرانے نام سے مشہور تھی۔ مرحوم کی زندگی مین

اس کا نام بجائے محل سرا کے مہمان سرا ہوتا تو زیادہ صحیح رہتا! بہر حال علی برادران کا استقبال شہر میں خوب دھوم دھام سے ہوا۔ اس تزک و احتشام کے ساتھ انکا داخلہ لکھنؤ میں پہلی ہی بار ہوا۔ جلوس اسٹیشن سے شہر کا گشت کرتا کراتا کہیں سہ پہر کو فرنگی محل پہنچا۔ جلسہ محل سرا میں منعقد ہوا۔ چائے، ناشتہ، ایڈریس، تقریریں، جلسہ کے سارے لوازمے موجود۔ خلقت کا ہجوم بھیڑ یا دھسان۔ جلسہ کی حیثیت بالکل خانگی تھی۔ صرف مخصوصین مدعو تھے۔ لیکن عقیدتمندی کے سیلاب کو کون روکتا؟ خلقت ٹوٹی پڑتی تھی۔ عوام اپنے کو آخر خواص سے پیچھے کیوں رکھنے لگے تھے۔

وسیع صحن کا گوشہ گوشہ ہجوم سے پٹ گیا۔ دبکا دبکایا میں بھی ایک صف میں کرسی نشین تھا۔ اور دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ محمد علی کی نظر نہ پڑے تو اچھا ہے۔ اس مجمع عام میں سب کے سامنے ملتے ہوئے جھیپ رہا تھا یہ کہاں ممکن ہوا! اندر مائیں ابھی بڑھا ہی جا رہا تھا کہ نظر سے نظر مل گئی، اور وہاں اب تاب کب تھی۔ نہ مجمع کا لحاظ نہ اپنے مرتبہ کا پاس، جھٹ وسط جلسہ سے صدارت کی کرسی چھوڑ ادھر بڑھے۔ میں لپک کر فوراً پہنچ گیا۔ کرسی سے اٹھ ہی چکے تھے، بھینچ بھینچ کر گلے لگایا، اور ترکی اظہار التفات وگرمجوشی کے طریقہ پر پیشانی اور کنپٹی کے بوسے لینے بھی شروع کر دیے!۔

عرض یہ کرنا ہے کہ محمد علی میں تصنع و تکلف کہیں چھو نہیں گیا تھا۔ خود داری یا اپنے کو لیے دیے رہنے کا، جو مفہوم عرف عام میں لیا جاتا ہے، اس کے تو وہ قریب بھی ہو کر نہیں گزرے تھے۔ قبول خلائق اور مرجعیت کے اس بلند مرتبہ پر پہنچ کر بھی اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ نیازمند سے، خلوت ہو یا جلوت، اسی بے تکلفی کے ساتھ ملتے اور خود ہی بڑھکر ملتے۔

لکھنؤ کا غالباً یہی سفر تھا، جب دونون بھائیون کو "مولانا" کی باقاعدہ آنریری ڈگری فرنگی محل (یا اس کے مدرسۂ نظامیہ) سے عطا ہوئی۔ اور جہان تک محمد علی کا تعلق ہے، انھوں نے تو اس لقب کی لاج رکھ لی۔ اور دینی مطالعہ کر کے خاصی حد تک "مولانا" اپنے کو بنا ہی لیا۔ باقی ان کی تقلید میں ہر کس و ناکس قومی کارکن کو "مولانا" کہنے کی جو بدعت سیۂ چل گئی، اس کی سند جواز کسی درجہ مین نہ اس وقت موجود تھی، نہ آج ہے۔

وفد خلافت جس کے رئیس وفد محمد علی تھے، یورپ کے لیے فروری ۲۰ء مین غالباً لکھنؤ ہی سے روانہ ہوا تھا۔ ارکان وفد مین ایک مولانا سید سلیمان ندوی تھے، اور ایک مسٹر سید حسین (جو اس وقت بمبئی کرانیکل مین تھے، اور اس وقت ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر سید حسین کے نام سے مصر مین سفیر ہند ہین[1])۔ وفد کے سکریٹری علیگڈھ کے نامور اولڈ بوائے حسن محمد حیات قرار پائے۔ جو کسی زمانہ مین پنجابی تھے اور اب تو ایک عمر سے بھوپالی ہیں[2]۔

---

[1] اب مرحوم ہو چکے ہین۔ (۱۹۵۱ء) [2] اب غالباً پاکستانی۔ (۱۹۵۱ء)

باب (۱۲)

سنہ ۱۹۲۰ء

(لیڈری۔ گاندھی جی)

اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء کا آغاز تھا کہ وفد خلافت یورپ سے واپس آگیا۔ اور اب گاندھی جی اور شوکت علی کی معیت مین مولانا محمد علی ——— اس وقت سے مولانا گویا ان کے نام کا جزو بنتا ہے ——— کا طوفانی دورہ ملک بھر کا شروع ہوا۔ اب وہ "مولانا" خاص و عام سب کی زبان پر تھے۔ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کا یہ عہد شباب تھا۔ اور ملک کا چپہ چپہ "مہاتما گاندھی کی جے" کے ساتھ ساتھ "محمد علی شوکت علی کی جے" سے گونج رہا تھا۔ "اللہ اکبر کے نعرے تھے۔ وُون تک کی زبانون پر چڑھے ہوئے۔ یہ فضا تھی کہ ایک روز گاندھی جی علی برادران کو ساتھ لیے ہوئے، صبح کے وقت دن نکلے ہوئے لکھنؤ اسٹیشن پر وارد ہو گئے۔ آج کے ہجوم کا کیا پوچھنا! آدمی پر آدمی ٹوٹا پڑتا تھا۔ اسٹیشن کے اندر بھی اور باہر بھی انسانون کا ایک جنگل ب——— گاندھی جی نے صاف کہدیا کہ "جب تک یہ ریلا ایک باقاعدہ مجمع کی شکل نہ اختیار کرے گا، اور راستہ نہ بن لیگا مین گاڑی سے نہ اترون گا"۔

دیکھنے کے قابل اب یہ منظر تھا۔ مولانا، خلقت کی نظر مین بہ حیثیت لیڈر کے اب اگر گاندھی جی کے ہم پایہ نہین، تو اُن سے بس کچھ کم ہی تھے۔ فرق وہی ۱۸، ۲۰ کا۔

لیکن یقین کیجئے کہ اس وقت راستہ صاف کرنے کے لیے جو اترا وہ کوئی اور نہیں، مولانا ہی تھے! وہ چاروں طرف چیخ چیخ کر اور دوڑ دوڑ کر اس طرح کام کر رہے تھے، کہ جیسے وہ کامریڈ کے ایڈیٹر، اور برابر کے لیڈر نہیں، بلکہ کوئی معمولی والنٹیر یا رضاکار ہیں! ایک کا ہاتھ پکڑا، دوسرے کو گھسیٹا۔ اُس کو ڈانٹا، اس کو چمکارا۔ کام دو منٹ کا تھا وقت بیس پچیس منٹ سے کیا کم لگا ہوگا۔ مجمع سا مجمع تھا! مولانا کے چہرہ بشرہ کسی چیز سے بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ یہ بھی اپنے کو کسی درجہ کا لیڈر یا مخدوم سمجھتے ہیں بس محض ایک خادمانہ حیثیت! اور پھر پلیٹ فارم سے باہر جب نکل کر آئے تو دوسرا منظر اُس پہلے سے بھی کچھ بڑھ چڑھ کر۔ جوڑی گاڑی جو لینے آئی تھی، اس کے لیے مولانا کا اصرار کہ میں اندر گاندھی جی کے برابر نہیں، بلکہ باہر کوچوان کے پاس کوچ بکس ہی پر بیٹھوں گا!

میں نے تو اپنے تجربہ میں کسی ایک لیڈر کو بھی اپنی شخصیت دوسرے لیڈر میں اس طرح فنا کرتے ہوئے نہیں دیکھا، نہ اس کے قبل نہ اس کے بعد۔ اور مسلمان لیڈروں میں تو کیا، ہندو لیڈروں میں بھی نہیں۔ آپ کے مشاہدہ میں کوئی ایسی مثال آئی ہو تو آپ ہی فرمائیں۔

مولانا اب خالی ایک ایڈیٹر یا انشاپرداز نہ تھے۔ آل انڈیا لیڈر تھے، گاندھی جی کے تقریباً ہم پلہ و ہم دوش۔ گورنر یو۔پی، سر جیمس مسٹن کی دوستی، اور گورنمنٹ آف انڈیا کے فنانس ممبر، سر گے فلیٹ وڈ ولین کی یاری ختم ہوئے مدتیں ہو چکی تھیں۔ اب وہ شدید دشمن حکومت کے تھے، اور حکومت شدید دشمن ان کی۔ خلقت اُن کے اوپر پروانہ وار گر رہی تھی، اور دن رات میں مشکل سے کوئی وقت ایسا نکلتا جسے وہ اپنا کہہ سکتے۔ عوام و خواص سب ہی کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی۔ عوام دل سے فریفتہ اور خواص مصلحت وقت

کے تقاضہ سے گرویدہ۔ راجہ صاحب محمود آباد (جو اب شاید مہاراجہ ہو چکے تھے) بھی بڑے ذی حوصلہ، سیرچشم، فیاض اور مہمان نواز رئیس تھے۔ لیکن بہرحال رئیس تھے، راجہ تھے۔ یا انگریزی اصطلاح میں "ارسٹاکریٹ" تھے۔ ایسے عوامی لیڈر کے لیے جگہ ان کے ہاں نکلنی ذرا دشوار ہی تھی۔ محمود آباد ہاؤس کی شاہانہ مدارات اور ضیافتوں سے لطف اٹھانے کے لیے ہزہائینس سر آغاخان، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت موتی لال نہرو، اور مسٹر جناح کیا کم تھے۔ گاندھی اور علی برادران کے لیے وہی فرنگی محل کی محل سرا کافی ہوئی۔ محل سرا خاصی وسیع تھی۔ محل سرا کے مالک کا قلب اس سے بھی وسیع تر۔ مولانا عبدالباری مرحوم کے ہاں "فقیری" میں بھی ایک شاہی شان۔ صبح سے شام اور شام سے آدھی رات تک ایک میلہ سا لگا ہوا۔ گاندھی جی کے لیے تو پھر بھی تنہائی کا اہتمام، حاجب و دربان کا انتظام۔ لیکن علی برادران کا سارا وقت وقف عام۔ جب دیکھیے لوگوں سے گھرے ہوے۔ ابھی اس سے بحث و مباحثہ، ابھی اُس سے قیل و قال۔ خدا معلوم غسل و طہارت، آرام و استراحت کے لیے وقت کون سا اور کب نکال پاتے تھے!

یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے گاندھی جی سے شخصی نیاز، گو بہت ہی سرسری، حاصل ہوا۔ اس وقت کلکتہ کے معتمد رسالہ ماڈرن ریویو میں انگریزی مضامین لکھتا رہتا تھا۔ عین اسی زمانہ میں میرا ایک مضمون "ستیاگرہ اور اسلام" کے عنوان سے نکلا تھا ــــــ یاد رکھیے کہ اُس وقت گاندھی جی کے چلائے ہوے الفاظ "ستیاگرہ" اور "شانتی" نئے ہونے کے باوجود بچہ بچہ کی زبان پر تھے ــــــ آیات قرآنی کی مدد سے مقابلہ میں دکھایا یہ گیا تھا کہ "ستیاگرہ" کی تعلیم اسلام کے لیے کوئی نئی اور انوکھی تعلیم نہیں۔ یہ تو صاف

قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔ زمانہ پھر یاد کر لیجئے، اب اکتوبر ۲۰ء کا تھا۔ اب مین نہ ملحد رہا تھا، نہ معاند اسلام۔ مادیت سے تمامتر روحانیت کی طرف منتقل ہو آیا تھا (اور اس انتقالِ فکری مین خود گاندھی جی کی تعلیمات کا بھی ایک حد تک دخل تھا) اور پختہ مسلمان اگر نہیں تو نیم مسلمان سے زاید تو اس وقت تک ضرور ہو چکا تھا۔ اور قرآن مجید کو اگر لفظاً وحرفاً نہین، تو کم از کم معنیً ومفہوماً تو کلام الٰہی بہرحال ماننے لگا تھا۔

غالب نے "تقریب بہر ملاقات" کے لیے "مصوری" سیکھنی شروع کی تھی[۱]، یہان تقریب کے لیے اس تازہ مضمون کو کام مین لایا گیا۔ لیڈرون کی پارٹی دوسرے دن سہ پہر کو پنجاب میل سے شاہ جہان پور، بریلی کی طرف روانہ ہوئی۔ حسب معمول مین اسٹیشن آیا۔ اور سندیلہ تک ہم سفر ہولیا۔ اتفاق سے مولانا ابوالکلام بھی اسی ٹرین مین کلکتہ سے چلے آرہے تھے۔ اور گاندھی جی اور مولانا محمد علی کو جگہ ان ہی کے سکنڈ کلاس مین ملی۔ (شوکت صاحب کہیں دور بیٹھے۔ شاید کہ حکیم اجمل خان مرحوم بھی اسی ٹرین مین کہین اور تھے، اور شوکت صاحب وہین گئے)۔ گاندھی جی تھک کر چور ہو چکے تھے، اور گاڑی چلتے ہی ناوقت ہونے کے باوجود ایک برتھ پر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ نیچے کے برتھ پر گاڑی کی دیوار سے ٹیک لگائے مولانا ابوالکلام۔ وسط مین مولانا محمد علی اور کنارہ پہ یہ خاکسار۔ ماڈرن ریویو کا پرچہ ہاتھ مین۔

اصل مقصود تو اُسے گاندھی جی کی خدمت مین پیش کرنا اور اُن سے اس مضمون کی داد لینا تھا۔ سو یہ غرض تو پوری طرح حاصل نہ ہوئی، گاندھی جی خود ہی نیند کے ماتے ہوئے تھے۔ البتہ وہ پرچہ مولانا نے ہاتھ مین لے لیا۔ اور مضمون کی چند ہی سطر پڑھ، اُس کے اصل منشاء

---

[۱] ہے سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری ✣ تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے۔

یعنی قرآنی عقیدۂ صبر اور گاندھوی عقیدۂ ستیاگرہ کے اتحاد کو پا کر، پرچہ تو بند کر دیا، اور اسکے اصل موضوع پر بحث شروع فرمادی ـــــــــ مولانا اپنی ذات و شخصیت کو گاندھی جی میں فنا کیے ہوئے تھے۔ لیکن میں اس خوش عقیدگی اور بہ قول مخالفین کے "گاندھی پرستی" کے زمانہ میں بھی اپنے عقائد اسلامی پر بالکل پختہ اور گاندھوی فلسفہ سے غیر متاثر تھے۔ اُن سے کہیں زیادہ متاثر گاندھویت سے تو میں خود تھا! گاندھی جی کو اصلاً ایک معلّم اخلاق و پیکر روحانیت سمجھ رہا تھا، اور وہ صرف ایک بلند پایہ سیاسی لیڈر!

بہرحال میں یہ عرض کرتا رہا کہ قرآن کا اصلی وعدہ اپنے پیروؤں سے روحانی حکومت یا مسیحیوں کی اصطلاح میں، آسمانی بادشاہت کا ہے۔ اور وہ فرما رہے تھے کہ نہیں، اسلام اس مادی دنیا میں بھی پوری طرح حکمران اور غالب رہنا چاہتا ہے۔ مولانا ابوالکلام بھی پوری طرح ان ہی کے ہمنوا تھے۔ اور میرے اوپر گولہ باری اس دُہرے مورچہ سے ہو رہی تھی ـــــــــ میں نے ایک بار عرض کیا کہ اچھا یہ بتائیے کہ ایک طرف ملک روم کی سلطنت ہو، اور دوسری طرف مولانائے روم کی شخصیت اور آپ کو حقِ انتخاب حاصل ہو تو آپ انتخاب کس کا کریں گے؟ میں تو سلطنت پر لات مار دوں گا، اور مولانا کو لے لونگا۔ مولانا ابوالکلام نے فرمایا "ہرگز نہیں، ہم ملک و سلطنت کو لیں گے" مولانا محمد علی نے معاً، ایک منٹ کا انتظار کیے بغیر فرمایا "بیشک۔ اور یہ اس لیے کہ جب سلطنت اسلامی ہوگی، تو وہ خود ہی مولانا کی سی شخصیتیں پیدا کرتی رہے گی" ـــــــــ ابوالکلام اور محمد علی کے درمیان اس وقت بھی نقطۂ نظر کا جو فرق تھا، اس کی پوری جھلک ان جوابوں میں نظر آرہی ہے۔ محمد علی کے ہاں مادی غلبہ، روحانی غلبہ سے الگ اور کوئی مستقل وجود رکھتا ہی نہ تھا، اس کا ضمیمہ اور لازمی نتیجہ تھا۔

یں اپنی بات پر اڑا رہا، اور یہی کہے گیا کہ "آپ نے ترتیب الٹ دی۔ شخصیتیں سلطنتیں پیدا کر دیتی ہیں۔ سلطنتیں شخصیتیں نہیں پیدا کر سکتیں"۔ گاندھی جی کچھ سوتے، کچھ جاگتے۔ یہ بحث آدھی تہائی کچھ سنتے رہے، اور جا بجا مسکراتے بھی گئے۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں یہ پر لطف صحبت ختم ہو گئی۔ میرا اسٹیشن آگیا، اور گاڑی آگے روانہ ہو گئی۔ عقیدتمندوں اور "درشن" کے طالبوں کا ریلا اس چھوٹے سے اسٹیشن پر بھی آیا۔ اور مولانا کی پوری کوشش رہی کہ کوئی زحمت مہاتما جی کو نہ ہونے پائے اور ان کے آرام میں خلل نہ پڑنے پائے۔ خود ہر زحمت برداشت کر لینے اور اپنے اوپر لے لینے کو موجود ـــــ گاندھی جی کا ایثار اس میں شک نہیں کر بہت بڑھا ہوا تھا اور ضرب المثل کی شہرت رکھتا تھا۔ لیکن اپنی آنکھوں کی اس شہادت کو کیا کروں کہ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی ہر وقت کی پیش آنے والی باتوں میں مولانا محمد علی اپنے کو جس جس طرح، ان کے سامنے دبایا، مٹایا، گرایا، اس کی نظیر بھی ملنی آسان نہیں۔

باب (۱۳)

۱۹۲۰-۲۱ء

(خلافت ۔ جامعہ ملیہ)

اسی دور کا ذکر ہے کہ ایک بار پھر علی برادران کا پھیرا لکھنؤ کا ہوا (وقت کی تفصیل اب یاد نہیں) قیام حسب معمول فرنگی محل میں۔ شب کو دعوت بھی حسب معمول فرنگی محل میں۔ وقت مقرر پر ہم سب لوگ منتظر، اور محمد علی کا پتہ نہیں۔ انتظار اور مزید انتظار۔ معلوم ہوا کہ اسٹیشن سے سیدھے، یا اور کہیں ہوتے ہوئے، غلام حسین مرحوم کی قبر پر فاتحہ پڑھنے قبرستان عیش باغ کو چلے گئے ہیں۔ "فاتحہ" محمد علی کے ہاں کوئی رسمی چیز نہ تھی۔ قبر پر رو رو کر ایصال ثواب کرنے، اور رحمت و مغفرت کی دعائیں خشوع و خضوع، گریہ و زاری کے ساتھ کرنے میں جتنی دیر بھی لگ گئی ہو، اس وقت کے گزرنے کا احساس ہی محمد علی کو کب ہوا ہوگا؟ —— جو شخص ہر اجنبی مسلمان کی مصیبت اور موت سن کر آبدیدہ ہو آئے، اور اسکی چوٹ کو اپنی چوٹ سمجھنے لگے، تو پھر یہاں تو معاملہ اپنے ایک گہرے مخلص اور عزیز ترین رفیق، اسسٹنٹ ایڈیٹر کامریڈ اور ایڈیٹر نیو ایرا کا تھا۔ آدھی رات بھی اگر بالین تربت پر گزر جاتی تو زیادہ التعجب نہ ہوتا۔ بہرحال محمد علی اچھی خاصی دیر کر کے واپس آئے، جب لوگ خوب بھوک سے بیتاب ہو چکے تھے۔

کھانے کے لیے ہاتھ دھو رہے تھے کہ میں نے قریب جا کر باتیں شروع کر دیں۔ ٹیگور کا انگریزی مضمون (Penalties of Being Known) "شہرت کا جرمانہ" اسی زمانہ میں نکلا تھا۔ اس کا حوالہ دے کر میں نے عرض کیا کہ "اب تو آپ سے بات کرنے کا موقع نکلنا دشوار ہو گیا ہے، ہر وقت اور ہر جگہ لوگ گھیرے رہتے ہیں۔ اور آپ کی بھی زبان رکتی نہیں اپنے فرط اخلاق سے باتیں کیے ہی جاتے ہیں"۔ بولے، کہ "ہاں بولتے بولتے گلا پڑ جاتا ہے، لیکن اس کا کوئی علاج بھی نہیں۔ اب یہ گلا تو جب اس میں پھانسی کا پھندا پڑے گا، جب ہی خاموش ہو گا، یوں تو ماننے کا نہیں" —— قید سے ابھی چھوٹ کر آئے تھے، لیکن قید و بند، بلکہ دار و رسن کے لیے بھی ہر وقت اب بھی تیار ہی رہتے تھے۔

سنہ۲۰ء کی آخری سہ ماہی تھی، جب علی برادران کا حملہ اُس وقت کے علی گڑھ پر ہوا، محمد علی کو اپنے علی گڑھ سے محبت نہیں عشق تھا۔ خدا معلوم دل پر کیا گزر رہی ہو گی، جب اس "بتکدہ" کو توڑ رہے تھے۔ ایک اسلام کے نام کے آگے سب کچھ بھلائے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ علی گڈھ کو بھی! —— امرتسر کی ایک تقریر میں خود زار و قطار رو رو کر، اور دوسروں کو رلا رلا کر کہہ بھی تو چکے تھے کہ

کعبۃ اللہ کی حفاظت ہمارا سب سے بڑا اور آخری فرض ہے۔ اس کے بچانے کے لیے ہمیں اپنی جانیں قربان کرنا ہیں۔ جب اس پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں، اور ہمارا قبلہ ہی خطرہ میں پڑ رہا ہے، تو ہم سب یہاں سے ہجرت کر کے گرتے پڑتے اس کی حفاظت کو جا پہنچیں گے۔ اپنے گھروں کو ویران کر دیں گے، تاکہ اللہ کا گھر محفوظ رہے۔ یہاں کی مسجدوں میں قفل ڈال جائیں گے کہ وہ بڑی مسجد آباد رہے۔ یہاں کی عبادتگاہیں سونی کر جائینگے کہ

اُس معبد اعظم کی رونق اور بہار میں نہ فرق پڑنے پائے۔"

بہر حال جوہر علی گڈھ کے مقابلہ محمد علی ایک سرکاری اثر سے آزاد "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کی طرح ڈالنے میں لگ گئے۔ خود ہی بڑی محنت سے اُس کا نصاب بنایا، اُس پر مضامین لکھے، اُن کی نشر و اشاعت کی، کلاس قائم کیے، اور خود ہی پڑھائی بھی شروع کر دی۔

جامعہ ملیہ آج بھی ماشاء اللہ قائم ہی نہیں، بلکہ بڑی اچھی حالت میں ہے۔ لیکن یہ یاد دلاتے رہنے کی ضرورت آج بھی باقی ہے کہ اُس کے اصل بانی محمد علی ہی تھے۔ جیسے علی گڈھ کے اصل بانی سر سید۔ رفیقوں، شریکوں کی رفاقت و شرکت سے اصل بانی کی شخصیت مشتبہ نہ ہو جانی چاہیے۔

سال کی یہ آخری سہ ماہی محمد علی کے لیے بڑی آزمائش کی سہ ماہی تھی۔ علی گڑھ کی تخریب اور جامعہ کی تعمیر، دونوں کے کام ساتھ ساتھ۔ فرصت بالکل غنقا۔ خدا جانے کھانے اور سونے کے اوقات کہاں سے نکالتے تھے۔ بہر حال جنوری ۲۱ء میں جب ذرا دم میں دم آیا تو ۱۳ر جنوری کو مجھے جامعہ آنے کی دعوت دی۔ مراسلت اب عرصہ دراز سے بند تھی۔ یہ مکتوب پاکر مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ اصل خط ملاحظہ ہو:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قومی مسلم یونیورسٹی۔ علیگڈھ ۱۲ر جنوری ۱۹۲۱ء

برادرم۔ السلام علیکم

اپنی عدیم الفرصتی کا اب کیا دکھڑا روؤں۔ آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں۔ اسی باعث مفصل خط لکھنے سے معذور رہوں۔ اور مجملاً لکھنے کا نتیجہ غالباً یہ ہوگا کہ آپ میرے مفہوم کو

نہ سمجھ سکیں گے۔ بہر حال یا قسمت یا نصیب کہہ کر لکھتا ہوں۔

جی چاہتا ہے کہ آپ کو یہاں دیکھوں، مگر علم سے زیادہ مذہب عزیز ہے۔ اور ایک مسلمان کے مذہب کے متعلق اگر قومی مسلم یونیورسٹی میں بھی شک و شبہ کیا جائے گا تو ہم یہ کہہ کر پیچھا نہیں چھڑا سکتے کہ ہر شخص کا مذہب اُس کا ذاتی معاملہ ہے جس سے اس دار العلوم کو کوئی تعلق نہیں۔ ابتک عمداً میں نے فلسفہ کے سینیر پروفیسر کی جگہ کے متعلق کوئی سفارش نہیں کی ہے۔ چونکہ اردو میں تعلیم دلانا منظور ہے، اس لیے اور بھی آپ کی ضرورت ہے۔ اگر تکلیف نہ ہو تو ایک دو دن کے لیے میرے مہمان بنکر یہاں کی دال روٹی کھائیے اور تمام معاملات کا تصفیہ کیجیے۔ اگر ہم دونوں ایک ہی بات پر راضی ہو گئے تو مجھے یقین ہے کہ دار العلوم کو آپ سے بیش قیمت مدد مل سکے گی۔ ممکن ہے کہ آپ شہرت ہی سے یہاں آنے سے انکار کرتے ہوں، اور مذہب کے متعلق میرے اسقدر لکھنے کو بھی خواہ مخواہ کا دخل در معقولات تصور کریں۔ لیکن مجھے تو پروپیگنڈا کرنا ہے، اس لیے تبلیغ ہی کا موقع دیجیے اور آجائیے۔ بہر حال آپ سے نصاب و نظام تعلیمات کے متعلق مشورہ کرنا ہے۔ اسی کے لیے آجائیے۔

اب رخصت ہوتا ہوں۔ والسلام۔ آپ کا قدیم نیاز مند

محمد علی"

اس ارشاد کی تعمیل تو میں کیا کرتا۔ اور اپنا لکھنؤ کا گوشۂ عافیت (خاتون منزل) چھوڑ، سرکاری یا قومی کسی قسم کی بھی قید ملازمت میں اب کیا پڑتا۔ بلکہ اب تو اس منزل میں تھا کہ خود لکھنؤ کی سکونت بار معلوم ہو رہی تھی، اور سالہا سال کے قیام کے بعد،

اور گوناگون دلچسپیون کے باوجود اسے ترک کرکے اپنے وطن قدیم، دریاباد کو ازسرنو آباد کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس لیے جواب مین تو غالباً محض معذرت لکھ بھیجی۔ لیکن یہان ذکر میرے جواب کا نہین، ذکر مولانا کے اصل مکتوب کا ہے ——— عبارت مکرر ملاحظہ کر لی جائے۔

اللہ اللہ! محمد علی کو مجھ سے جس درجہ محبت و شفقت تھی، اوپر کے صفحات سے ظاہر ہو چکی ہے۔ حسن ظن بھی مجھ سے (میری کتاب پڑھکر) اتنا رکھتے ہین کہ جامعہ مین فلسفہ اردو مین پڑھانے کا بہترین معلم مین ہی ثابت ہو سکتا ہون۔ اس ذاتی تعلق اور اتنی خوش ظنی، دونون کے باوجود لکھتے ہین، تو یہ کہ "مگر علم سے زیادہ مذہب عزیز ہے"! ——— محمد علی کے سوا کوئی دوسرا ہوتا، تو بھلا اس موقع پر یہ فقرہ لکھتا، یا اور کوئی شرط اس قسم کی لگاتا؟

میں بحمد اللہ اس وقت تک الحاد و دہریت کے چکر سے پوری طرح نجات پاچکا تھا، اور بچہ مسلم ہو چکا تھا۔ مولانا کو ان تفصیلات کی اطلاع نہ تھی۔ وہ اپنی پرانی واقفیت کی بنا پر ابتک میرے عقائد کو ناقابل اطمینان سمجھ رہے تھے۔ اسلام اور اللہ کے دین کا یہ گہرا درد ان ہی لے دل مین تھا کہ مجھے بلا بھی رہے ہین، میرا ہونا وہاں دل سے بھی چاہ رہے ہین، اور اس کو جامعہ کے حق مین مفید بھی پا رہے ہین، لیکن اس سب کے باوجود اس کے ذرا بھی روادار نہین کہ ایک ملی درسگاہ مین الحاد و دہریت کے جرثیم لیے ہوئے میں قدم رکھوں ——— محمد علی کی سیرت کا سارا نچوڑ اس ایک مختصر سے خط، بلکہ اس کے ایک فقرہ کے اندر آگیا۔ دین کے لیے اتنی صلابت اچھے اچھے علماء میں بھی اس دور میں کمتر ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ نہین کہ محمد علی کو اپنے دوستون، عزیزون، رفیقون سے

محبت نہ ہو۔ محبت میں کمی کیسی، اور نہ زیادتی ہی رہتی تھی۔ لیکن اللہ اور اس کے دین کی محبت ان سب محبتوں پر حاکم اور غالب۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ کی عملی تفسیر۔

کہتے ہیں کہ علی برادران کی ان ہی والہانہ خدا پرستیوں کو دیکھ ایک بار ان کے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ نے فرما دیا تھا کہ "یہ دونوں بھائی اگر عہد نبویؐ میں ہوتے تو انکی مسلسل فداکاریاں تو ایسی ہیں کہ جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دس مخصوص صحابیوں کے نام ایک صحبت میں لے لے کر انہیں جنت کی بشارت دیدی تھی، ایسے ہی ان دونوں کے لیے بھی کیا عجب ہے کہ نام لیکر ارشاد ہو جاتا کہ محمد علی فی الجنۃ، شوکت علی فی الجنۃ"۔۔۔۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ مرشد کا یہ قول حقیقت سے خالی اور نری تخئیل پر مبنی تھا؟

باب (۱۴)

سنہ ۱۹۲۰ء

"مستحقِ دار کو حکمِ نظر بندی ملا"

سنہ ۲۱ء علی برادران کے شباب شہرت کا سنہ تھا۔ گاندھی جی کے ہمراہ لق و دق ملک ہندوستان (غیر منقسم ہندوستان یعنی موجودہ ہندوستان و پاکستان دونوں کے مجموعہ) کا چپہ چپہ چھان ڈالا۔ آج کلکتہ میں ہیں تو کل بمبئی مین۔ صبح دہلی میں کی تو شام لاہور میں۔ شہر شہر بلکہ قصبہ قصبہ پہنچے۔ اور جہان کہین پہنچے، نام کی شہرت استقبال کے لیے پیشتر ہی سے موجود ہوتی۔ خلافت کمیٹیان گاؤں گاؤں تک مین قائم۔ مرکزی خلافت کمیٹی کا صدر دفتر بمبئی مین، جس کے سکریٹری مولانا شوکت علی ـــــ خلافت کمیٹی جب ابتداءً سنہ ۱۹ء مین قائم ہوئی، جب تو علی برادران بیتول جیل مین نظر بند تھے۔ لیکن جب سے باہر نکلے خلافت کمیٹی پر ایسا چھا گئے کہ لوگ اس کے بانیوں کو بھول ہی گئے۔ اور زبانوں پر صرف محمد علی شوکت علی کے نام رہ گئے، یہ خلافت کمیٹی کے مرادف، اور خلافت کمیٹی انکے مرادف!

فروری سنہ ۲۱ء کا اخیر تھا، جب لکھنؤ مین صوبہ خلافت کانفرنس کا جلسہ رفاہ عام[1] مین

[1] اس وقت تک بڑے پبلک جلسے وہیں ہوا کرتے تھے۔ سٹی اسٹیشن کے قریب رفاہ عام کلب اور جلسہ تہذ کی جو عظیم الشان عمارت ہے، جلسے کبھی اس کے اندر ہال مین ہوتے اور کبھی باہر احاطہ کے میدان مین۔

کے احاطہ میں دھوم دھام سے منعقد ہوا۔ خلافت کا معمولی سا معمولی جلسہ بھی اس وقت انتہائی گرمجوشی کے ساتھ ہوتا تھا، اور پھر اس کی صدارت کے لیے تو مولانا محمد علی آ رہے تھے۔ اس نام کی کشش نے اور چار چاند لگا دیے۔ یہ عین وہ زمانہ تھا کہ میں لکھنؤ کے ہمہ وقتی ہنگاموں سے اکتا کر اور تنگ آ کر لکھنؤ سے ۴۰۔ ۴۲ میل دور اپنے وطن آبائی قصبہ دریاباد (ضلع بارہ بنکی) کو منتقل ہو آیا تھا۔ اور سیاسی جلسوں سے بالکل الگ اور گوشہ گیر تھا۔ لیکن محمد علی کا نام سن کر کیسے نہ آتا ——— بہ قول شخصے سر کے بھل آیا۔

محمد علی اب اپنے وقت کے مالک کسی درجہ میں بھی نہیں رہے تھے۔ ہر وقت مصروف ہی رہتے۔ ابھی ایک کام اٹھایا ہی تھا کہ اسے ادھورا چھوڑ دوسری طرف مڑ جانا پڑا۔ ابھی بات شروع ہی کی تھی کہ دوسری بات چھڑ گئی۔ معاصرین میں اچھے اچھے نامور اور مشاہیر پوری بات کرنے کو ترس جاتے۔ خطبۂ صدارت لکھنے لکھانے کی فرصت اب کہاں سے لاتے۔ صدارتی تقریر زبانی ارشاد کی، جو شاید کئی گھنٹہ میں ختم ہو پائی۔ ایک نالۂ درد تھا، طویل و مسلسل۔ خود بھی بات بات میں روتے، اور دوسروں کو بھی رلاتے۔ آج ان تقریروں کا کوئی حصہ بھی کاش کہیں محفوظ ہوتا! ——— گراموفون کی ایجاد اس وقت بھی موجود تھی، اور سینکڑوں فاسقانہ گیت اُن میں محفوظ کیے جا رہے تھے۔ اللہ کی حمد و ثنا کی یہ دلکش اور دلدوز مناجاتیں بھی اس وقت ریکارڈ کر لی جاتیں!

مجھ ناچیز سے وہی بحث و مباحثہ، قیل و قال، جلسہ گاہ کے باہر بھی اور محلسرائے فرنگی محل کے اندر بھی۔ جلسہ دو دن رہا۔ کارروائی اردو میں تھی۔ جلسہ میں جو اہم اور مرکزی تجویز منظور ہوئی، اس کے انگریزی ترجمہ کا حکم مجھے ملا۔ خدا معلوم مجھے اپنے اوپر قیاس کر کے انگریزی

زبان کا ماہر کس بنا پر سمجھنے لگے تھے! تخت صدارت کے قریب مجھے بلایا، اور ارشاد فرمایا
کہ "یہ تجویز بہت اہم ہے۔ تار پر وزیر اعظم برطانیہ کے پاس جائے گی، اس کا ترجمہ تم ہی کرو۔"
اتنی بڑی ذمہ داری کی اہلیت اس نا اہل مین کب تھی۔ حیلہ حوالہ کر کے کام دوسروں پر
ٹال، خود وہان سے کھسک گیا! —— شیخ شوکت علی بی۔ اے مرحوم (وکیل لکھنؤ)
بہت پیش پیش تھے، عجب نہین جو ان ہی غریب کو ترجمہ کا کام بھی انجام دینا پڑا ہو۔
قومی و ملّی معاملات مین اپنی ذمہ داری کی طرف سے غفلت، اور اپنا کام دوسروں کے
سر ڈال دینے کی لت، اس وقت بھی ایسی ہی عام تھی، جیسی آج ہے۔

شام کو فرنگی محل مین حسب معمول زوروں کی دعوت —— اب ہر دفعہ بار بار
اس کا ذکر کہاں تک کیا جائے۔

اب محمد علی سارے ملک مین زمین کا گز بنے ہوئے تھے۔ پورے اور صحیح معنی مین
"متّائی" تھے۔ ابھی یہاں ابھی وہاں۔ صبح کہین، شام کہین۔ ساری فضا مین تین ہی نعرے۔
ایک "اللہ اکبر"۔ دوسرے "مہاتما گاندھی کی جے" تیسرے "محمد علی شوکت علی کی جے"۔ معلوم
یہ ہوتا تھا کہ ملک کی حکومت ان ہی تین بے تاج کے تاجداروں کے ہاتھ مین ہے، اور ساری
خلقت کے دلون پر یہی تثلیث حکمرانی کر رہی ہے۔ ٹھیٹھ گنوار اور دیہاتی، اخبارات
کی صورت تک سے بے خبر، لیکن ان نامون سے وہ بھی خوب واقف۔ کلمہ ان ہی نامون کا
پڑھ رہے ہین۔ شہرت ایسے ایسے دور افتادہ علاقون تک پہنچی ہوئی، جہاں اس کے
قبل نہ کسی لیڈر کے نام کی رسائی ہوئی تھی نہ کسی واعظ یا "سیاسی" کی —— لطیفہ یہ کہ
خواص کے علم مین تو محمد علی، شوکت علی گو "یک جان" تھے، لیکن بہرحال "دو قالب" تھے۔

عوام الناس کے ذہن مین دوئی اتنی بھی نہ تھی، جان بھی ایک اور قالب بھی ایک۔ گویا "شوکت علی" کوئی دوسرا نام تھا ہی نہین۔ بلکہ محمد علی ہی کے پورے نام کا ایک جزو تھا۔ "محمد علی شوکت علی"!

محمد علی اب انسان کاہے کو تھے، محض ایک "خبر" ہو کر رہ گئے تھے جو روزانہ چھپتی رہتی۔ آج اگر تصویر نکلتی، تو کل تقریر چھپتی، اور پرسون بیان شائع ہوتا۔ محمد علی کو اپنی ماں سے، بیوی سے، چارون بچیون سے، سب سے بے انتہا محبت تھی۔ سب کے عاشق زار تھے۔ آج خدمت ملک وملت کے پیچھے (جسے وہ خدمت دین اور عبادت سمجھ کر کر رہے تھے) ان سب کو بھولے ہوئے، سب سے چھوٹے ہوئے تھے ——— ذاتی مراسلت ومکاتبت کا موقع بھلا اس درمیان مین کیا ملتا۔ روز روز کی خبرین اخبارات سے ملتی ہی رہتی۔

ستمبر ۲۱ء کا آغاز تھا کہ محمد علی مدراس جاتے ہوئے راستہ مین والٹیر اسٹیشن پر گرفتار کر لیے گئے۔ وائسرائے لارڈ ریڈنگ کی ایک غضبناک تقریر کئی ہفتہ قبل اس خبر کے لیے کانون کو تیار کر چکی تھی۔ اور گرفتاری کے بعد لینے مشہور ومعروف مقدمہ کیلئے کراچی لائے گئے۔ جرم یہ تھا کہ کچھ روز قبل کراچی خلافت کانفرنس مین پریذیڈنٹ صدر کانفرنس ایک باغیانہ تقریر کی تھی، اور ایک باغیانہ ریزولیوشن پاس کرایا تھا، جس سے مسلم سپاہیون مین سرکار انگریزی کے خلاف بدلی وناراضگی پھیلتی۔ ساتھ کے اور مجرم پیر غلام مجدد صاحب، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد، ڈاکٹر کچلو اور مولانا نثار احمد کانپوری وغیرہ تھے۔

ہمدم (لکھنؤ) اس وقت زوروں پر نکل رہا تھا۔ اور یوپی اور دہلی مین کہنا چاہیئے کر وہی ایک روزنامہ مسلمانوں کے ہاتھ مین تھا۔ اس کے مالک آنریبل شیخ شاہد حسین قدوائی مرحوم تعلقہ دار گدیہ تو بالکل دوسرے سیاسی مسلک کے تھے لیکن ایڈیٹر سید جالب مرحوم ایک زمانہ مین خاص رفیق مولانا محمد علی کے رہ چکے تھے، اور ہمدرد مین کام کیے ہوئے تھے۔ یہ علی برادران کے حالات تفصیل کے ساتھ چھاپتے رہتے۔ اور مسلمانوں کا مذاقِ عام اس وقت مانگ بھی اسی چیز کو رہا تھا۔ جالب مرحوم کو کہیں سے (غالباً فرنگی محل سے) مولانا کا ایک خانگی مکتوب ہاتھ آگیا، حسبِ معمول خوب مفصل تھا، اور اس مین مولانا کے قلم سے والٹیر سے کراچی تک کا سفرنامہ درج تھا۔ ہمدم نے اسے بجنسہٖ شائع کر دیا۔ دریاباد مین ڈاک اس وقت صبح، کچھ دن چڑھے تقسیم ہوتی تھی۔ پرچہ جب وقت آیا، بیت الخلا جا رہا تھا، پرچہ ہاتھ میں لیے وہین چلا گیا، اور فرطِ اشتیاق مین وہین کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ —— خدا کے لیے کوئی صاحب یہاں پہنچ کر، لاحول ولاقوۃ پڑھ کر، اس عمل کے جواز و عدمِ جواز کی فقہی بحث نہ چھیڑ دیں۔ بیان نفسِ واقعہ اور فرطِ اشتیاق کا ہو رہا ہے، نہ کہ کسی مسئلہ کے جواز و عدمِ جواز کا۔

خط کے اور حصے بھی مؤثر تھے، لیکن جب اس مقام پر نظر پہنچی کہ "رات کے طویل طویل گھنٹے درود شریف کی تسبیحیں پڑھتے پڑھتے گزار دیے۔ اور آسی غازیپوری کا یہ شعر برابر وردِ زبان رہا کہ

وہاں پہنچ کے یہ کہیو صبا سلام کے بعد ۔۔۔ تمھارے نام کی رٹ ہی خدا کے نام کے بعد"

تو معاً آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ رواں ہو گیا —— دنیا بھی کیسی اندھی تھی، اور آج تک اندھی چلی آرہی ہے۔ محمد علی کو دوسرے سیاسی لیڈروں کی طرح محض

ایک سیاسی لیڈر سمجھنا کتنا کھلا ہوا ظلم تھا! جو اپنے آپ کو رسول کی محبت مین فنا کیے ہوئے تھا، جس پر عشق اپنے دین کا سوار تھا، اُس کے لیے یہ رائے قائم کرنا کہ اس کا انتہائی مقصود اپنے وطن کی آزادی اور ہندوستان کی خودمختاری تھا، یہ کیسی صریح ناانصافی اس کے حق مین بھی ہے اور اپنے حق مین بھی! محمد علی کو تو ہندوستان کی آزادی بھی اس لیے عزیز تھی کہ اس سے حرمین شریفین بھی آزاد ہو سکین گے! ——— سچ کہا ایک دوسرے عارف اور دیوانہ (مولانا مناظر احسن گیلانی) نے دس سال بعد محمد علی کی موت پر ؎

بہ دینِ مصطفیٰ دیوانہ بودی | فدائے ملتِ جانانہ بودی
سیاست را نقابِ چہرہ کردی | وگرنہ عاشقِ مستانہ بودی

باب (۱۵)

۲۲-۱۹۲۱ء

(قیدِ فرنگ۔ "جان بیٹا خلافت پہ دیدو")

کراچی کی عدالتون مین، پہلے مجسٹریٹ کے اور پھر صوبہ کی سب سے اونچی عدالت جوڈیشل کمشنر کے سامنے محمد علی نے جو جو بیانات دیے، اور جیسے جیسے قانونی نکتے اور ادبی لطیفے دوران مقدمہ میں پیدا کیے، ان کی تفصیلات کو اس "ذاتی ڈائری" کے محدود موضوع اور گنجائش سے کیا تعلق۔ مختصر یہ کہ لفظ لفظ جوش ایمانی اور غیرت دینی کا ترجمان تھا۔ انگریزی اخبارات کے لمبے لمبے کالم مقدمہ کی کارروائیون اور "سنسنی خیز" سرخیون سے بھرے رہتے۔ اور ادھر ہر روز تازہ اخبار کا انتظار بےچینی کے ساتھ رہا کرتا۔ صبح ہوئی نہین، اور اخبار کا انتظار شروع ہوا نہین۔ اور جب اخبار ہاتھ میں آگیا کچھ دیر میں ختم ہو جاتا، دل اُسی وقت سے دوسرے دن کے اخبار مین اٹک جاتا! کوئی دو مہینہ حوالات مین عام قیدیوں کی طرح گزارے۔ نومبر مین حکم سنایا گیا۔ دو دو برس کی سزا سب ملزمون کے ساتھ محمد علی کو بھی! ——— محمد علی بہت گھوم پھر چکے تھے، مارے مارے پھرتے بہت دن ہو چکے تھے، اب مشیت تکوینی کے حاکم کا حکم نافذ ہوا کہ مدت دراز کے لیے ایک جگہ جم کر بیٹھین! ان ہی کی زبان میں ؎

دیکھیے اب یہ گردشِ تقدیر   کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے[1]

[1] یہ شعر جس غزل کا ہے، وہ بیجاپور جیل مین جنوری ۲۳ء کی کہی ہوئی ہے۔ پوری غزل پڑھنے کے قابل ہے۔ آپ بیتی کے رنگ میں ہے۔

اللہ اللہ کیا سمان تھا! آکسفرڈ کا گریجویٹ، آنرز پایا ہوا گریجویٹ، کامریڈ کا ایڈیٹر، ملک کا ایک معروف ترین لیڈر، چوروں اور نقب زنوں، ڈاکوؤں اور خونیوں کے ساتھ قفس مین بند! اور جس کے ملنے والون مین ابھی کل تک گورنر اور لفٹنٹ گورنر، راجے اور مہاراجے، ایگزیکیٹو کونسلر اور خود وائسرائے بہادر تھے، آج اس کی عزت جیل کے ادنیٰ پہرہ دارون اور برقندازون کے رحم وکرم پر تھی! کوچ اور صوفے اور گدے اور قالین کی جگہ زمین کا کھرا فرش اور غذا وہ مل رہی تھی، جو کبھی اس کے چاکرون اور خدمت گارون نے بھی کیون کھائی ہوگی!

اور یہ سب کچھ دعوئ اسلام کے جرم مین! محبت اسلام کے پاداش مین! فرد جرم جو لگی تھی، اس مین آزادی ہند، سوراج وغیرہ کا کہین نام نہ تھا۔ الزام یہ تھا کہ جو احکام قرآنی اور احادیث رسول، قتل مسلم کی وعید میں ہین، ان کے مسلمان سپاہیون تک پہنچانے کی کوشش کیون کی تھی۔ تاریخ کے پیمانہ پر سوا تیرہ سو برس کے بعد اپنا اعادہ کر رہی تھی ——— اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (الحج) اور وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (البروج) اور اسی قسم کی دوسری آیتون کی تفسیر کا مشاہدہ، لفظ وعبارت کے وساطت کے بغیر ہو رہا تھا۔ ———

اُدھر محمد علی جیل گئے، اور ادھر بچہ بچہ کی زبان پر

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

کا ترانہ آگیا! ——— جس پر اپنے بیوی بچون، عزیزون، دوستون سے دو چار دن کی بھی جدائی شاق تھی، اسے حکم ۲۴ مہینون تک، سب سے الگ، قید فرنگ مین بند رہنے کا ملا ——— اللہ اللہ! کیا شان بے نیازی ہے! اپنے عاشقون کے امتحان کیسے کیسے

کرئے جاتے ہین۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔

ستمبر ۲۱ء سے ستمبر ۲۳ء تک، گرفتاری کے وقت سے رہائی کی گھڑی تک اس مظلوم پر کیا کیا گزری، اس کی تفصیل کا نہ یہ موقع نہ یہ بیان ہیان مقصود۔ مختصر یہ کہ حوالات کی مادی سختیون اور جیل کے جسمانی شدائد کے علاوہ، سرکاری و نیم سرکاری ایجنسیون نے بھی کوئی دقیقہ روحانی اور دماغی تکلیف کا اس مظلوم کو پہنچانے کا اٹھا نہین رکھا۔ اس وقت کے پانیر، اس زمانہ کے اسٹیٹسمین، اس دور کے لیڈر کی فائلیں آج بھی کہیں سے ان کی گرد جھاڑ پونچھ کر اٹھا دیکھیے۔ ایک ایک صفحہ سب و شتم سے رنگین ملے گا۔ انگریزون اور غیر کانگرسی ہندوون کے علاوہ، خود مسلمان اخبارچی اور کالم نویس خدا جانے کتنے ایسے نکل پڑے تھے۔ جن کی کہنا چاہیے کہ روزی ہی کھل گئی تھی۔ صبح ہو یا شام، جب دیکھیے محمد علی کے حق مین کوئی نہ کوئی الزام تصنیف کر رہے ہین۔ گویا ہر افترا جائز اور ہر اتہام درست ٹھہر گیا ہے ——— شیر لوہے کی سلاخون کے اندر بند تھا اور بازار کے اوباش چھوکرے، دور سے لمبی لمبی لکڑیون سے اسے کونچ کونچ کر اپنے ظرف کا ثبوت دے رہے تھے! مشیت کے بھی عجائب کاروبار ہین۔ ایک طرف یہ معاملات جاری تھے، اور اسلام کے دیوانے سے اس کے ذنوب و معاصی گویا رگڑ رگڑ کر دھلائے جا رہے تھے، تو دوسری طرف

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح
الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ	کرتے رہے، عنقریب خدائے رحمٰن ان کے
الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم)	لیے (دلوں میں) محبت پیدا کر دے گا۔

کی تجلیات بھی مستور نہین رہ سکتی تھین۔ کراچی کے قیدی کچھ روز بعد سب الگ الگ کر دیے گئے۔

شوکت علی راجکوٹ بھیجے گئے، محمد علی کے حصہ مین بیجاپور (دکن) کا جیل آیا۔ بیجاپور کے قیدی کی مقبولیت و مرجعیت کا یہ عالم تھا کہ اگر نا وقت اسے چھینک آجاتی، تو اس کی بھی تار برقیان دوڑنے لگتیں، اور دم کے دم میں یہ خبر بھی ملک کی فضا مین گونج جاتی۔

نظمین چھوٹی بڑی، رطب و یابس، خدا جانے کتنی کہہ ڈالی گئیں۔ ایک نظم خود محمد علی ہی کی طرح مقبول ہوئی۔ "جان بیٹا خلافت پہ دیدو" شہر شہر، گلی گلی، گاؤں گاؤں، کم از کم اودھ اور جوار اودھ مین تو بس یہی ترانہ تھا،

"جان بیٹا خلافت پہ دے دو"

نظم، محمد علی کی والدہ ماجدہ کی زبان سے ادا کی گئی تھی۔ کوئی خاص شاعرانہ خوبی نہین رکھتی تھی۔ فن کی غلطیان بھی موجود تھین۔ شاعر صاحب بھی کوئی مجہول الحال، غیر معروف سے تھے۔ اس پر بھی کچھ فضا کا اثر، کچھ جذبات کا اخلاص، کچھ درد انگیز دھن، مل ملا کر نظم کو وہ خداداد مقبولیت حاصل ہوئی، جو اچھے جید شاعرون کے لیے بھی باعثِ رشک ہو سکتی تھی۔ شروع کے دو بند آج ۳۰-۳۱ سال کے بعد بھی سن لیجیے، ؎

بولین اماں محمد علی کی	جان بیٹا خلافت پہ دیدو
ساتھ تیرے ہی شوکت علی بھی	جان بیٹا خلافت پہ دیدو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا	کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحان مین اترنا	جان بیٹا خلافت پہ دیدو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے	کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہے یہی دین احمد کے رستے	جان بیٹا خلافت پہ دیدو
حشر مین حشر برپا کرون گی •	پیش حق تم کو لے کر چلون گی

اس حکومت پہ دعوی کرونگی   جان بیٹا خلافت پہ دیدو

۱۹۲۲ء کا ایک عام منظر۔ شام کا وقت ہے۔ امین آباد کے چورا ہے پر یہی "صدائے خاتون" دو دو پیسہ کو بک رہی ہے۔ خدا جانے کتنی تعداد میں روز نکلتی رہتی ہے۔ لڑکے درد انگیز آواز سے گا گا کر پڑھ رہے ہیں، اکثر نواب مرزا شوق کی مثنوی "زہر عشق" کی دھن میں۔ صدہا راہگیر کھڑے سن رہے ہیں۔ پولیس کی لاری آئی۔ بہتوں کو پکڑ پکڑ کر جیل خانہ پہنچا دیا۔ روز سہ پہر سے لیکر رات گئے تک یہی تماشا رہتا ہے۔ جیل جانا ایک ہنسی کھیل ہو گیا ہے۔ پہلے جس کے نام سے لوگ تھرّاتے تھے، سہمے جاتے تھے، اب خود اس کا جھیل لے جانا ایک مذاق سا معلوم ہونے لگا ہے —— محمد علی جب کانگرس میں آئے تو قوم کی قوم کو ساتھ لے کر آئے۔ محمد علی جب جیل گئے تو یہی آگ قوم پر گلزار ہو گئی۔ سیکڑوں نہیں ہزاروں مسلمان، اچھے اچھے عالی خاندان و ذی مرتبہ، گریجویٹ اور وکیل، بیرسٹر اور ڈاکٹر، عالم و فاضل ہنسی خوشی خلافت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جیل بھرتے چلے گئے!

اسی ۱۹۲۲ء کے آخری فروری یا شروع مارچ کا ذکر ہے کہ خواجہ صاحب اجمیری کا سالانہ عرس پڑا (فاتحہ کی اصل تاریخ ۶ رجب ہے، عرس اور میلہ کئی دن قبل سے شروع ہو جاتا ہے) اب میں زندگی کے جس دور سے گزر رہا تھا، اس میں درگاہوں، آستانوں پر حاضری اور عرسوں میں شرکت لازمی تھی۔ اجمیر میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ خوش قسمتی سے ساتھ مولانا عبد الباری فرنگی محلی کا ہو گیا۔ مولانا باوجود عالم جید ہونے کے صاحب سماع تھے۔ ان کے قافلہ کے ساتھ اپنی بھی چھوٹی سی پارٹی کو لے اجمیر حاضر ہو گیا

ان ہی کے ساتھ ٹھہرا، اور سفر مین حضر کا سا آرام اور لطف ان ہی کے لطف و کرم سے اٹھایا اپنے قوال دریا باد سے ساتھ لایا تھا۔ ایک روز شام کو درگاہ مین گاندھی جی آئے، اور اصل مزار پر حاضری دینے کے بعد صحن مین قوالی سننے کے لیے بیٹھ گئے۔ مین نے اپنے قوالون کو اشارہ کیا، اور انھون نے کلام حضرت جوہر ہی کا شروع کر دیا۔ وہ مشہور غزل ؎

تم یون ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے

گاندھی جی سنتے جاتے تھے، اور ڈاکٹر سید محمود (جو اس وقت صوبہ بہار مین وزیر ہین، اور اس وقت تک غالباً مرکزی خلافت کمیٹی کے ایک سکریٹری تھے) انگریزی مین انھین مطلب سمجھاتے جاتے تھے ——— کلام جوہر سے اُس وقت بڑے بڑے آستانے گونج رہے تھے۔

عین اسی زمانہ مین محمد علی کراچی سے بیجاپور جیل منتقل کیے گئے تھے۔ کسی اسٹیشن پر کسی انگریزی اخبار کے ایک منچلے وقائع نگار نے انھین جا لیا، اور سوال تحریک ترک موالات کی موجودہ حالت کے متعلق کر دیا۔ محمد علی نے جواب مین کہا کہ "تحریک کا حال تو وہ لوگ جانین، جو باہر ہین، مین تو اتنا کہہ سکتا ہون کہ مین اپنے لیے بعد رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے گاندھی جی ہی کے احکام کی متابعت ضروری سمجھتا ہون"۔ لکھنؤ سے اجمیر جاتے وقت ایک بڑے اسٹیشن پر جو انگریزی اخبار مین نے خریدا، اتفاق سے اس مین یہی مکالمہ درج تھا مولانا عبد الباری ؒ نے اسے پڑھوا کر سنا۔ انکے ایک رفیق سفر و حضر جو اسوقت بھی ہمراہ تھے بول اٹھے کہ "بعد رسول کے نام اپنے مرشد کا لینا تھا، یہ گاندھی جی کیا معنی"؟ مولانا نے برجستہ جواب دیا "مرشد کوئی ذاتی ہستی تو رکھتا نہین، وہ تو رسول ہی کا نائب ہوتا ہے جب رسول کا نام لے دیا تو رسول کے نائب بھی اسی مین شامل ہو گئے، گاندھی جی سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ایک الگ و مستقل حیثیت رکھتے ہین، نام ان ہی کا لینا مناسب تھا"۔

باب (۱۶)

سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء

"تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں"

شعر سننے اور کہنے کا چسکا تو محمد علی کو شروع ہی سے تھا۔ اس "ڈائری" کا ایک پچھلا باب خود ان کے قلم سے ان کے بیان شاعری کے لیے وقف گزر چکا ہے۔ کچھ نہ کچھ شعر لڑکپن ہی سے نکالنے لگے تھے۔ حضرت داغ کی صحبت سونے پر سہاگہ ہوگئی۔ کالج پہنچتے پہنچتے خاصے شاعر بن چکے تھے۔ قومی، ملی، سیاسی زندگی میں بڑھے، تو فرصت عنقا۔ بقول شخصے بات کرنے کی بھی فرصت سے محروم۔ اب شعر گوئی کی مہلت قید یا نظربندی ہی کے زمانہ میں ملتی۔ اور جوہر کی شاعری کے جوہر اسی وقت چمکتے۔ سنہ ۱۶ء کے زمانۂ نظربندی کی شاعری کا نمونہ خاصی تفصیل سے اسی پچھلے باب (۸) میں درج ہو چکا ہے۔ اور سنہ ۲۱ء کے دو ایک شعر شہید ان کالکتہ کی شان میں پہلے بھی نقل ہو چکے ہیں۔ دسمبر سنہ ۱۹ء کے آخر میں تو چھوٹے ہی تھے کہ ستمبر سنہ ۲۱ء میں پھر گرفتار ہوگئے۔ اور اب کی نظربند نہیں، بلکہ باقاعدہ مقدمہ چلنے کے بعد جیل کے قیدی ہوئے۔ پورے دو برس بھی تو باہر نہیں رہنے پائے تھے۔ سنہ ۲۲ء کا غالباً وسط تھا کہ ان کی ایک نعتیہ غزل بیجاپور جیل کی چار دیواری اور پابندیاں توڑتی ہوئی، پاسبانوں اور پہرہ داروں کی آنکھوں میں خاک جھونکتی ہوئی، کسی طرح

فرنگی محل پہونچ گئی، اور وہین سے مجھے ہاتھ لگی ——— ایک مجھی پر موقوف نہین، خدا جانے دست بدست، نقل در نقل ہوتے کتنی پھیل گئی، کہاں کہاں پہنچ گئی، کن کن کی زبانون پر چڑھ گئی! ——— آخر دور طباعت سے قبل پوری پوری کتابین بھی تو اسی طرح ہاتھون ہاتھ پھیل جایا کرتی تھین!

غزل کیا تھی، شاعر کے جذبات قلب کی ہو بہو ترجمان۔ شیدائے رسولؐ کے چہرہ کا عکس ایک شفاف آئینہ مین! قوالون نے اسے گایا، شاعرون نے اس پر غزلین کہین، رسائل و اخبارات اسے مدتون شائع کرتے رہے۔ عجب نہین، جو آپ بھی سن چکے ہون۔ خیر آج قند مکرر کا لطف سہی۔ شعر پڑھنے سے قبل شاعر کا جیل کے اندر عالم تنہائی مستحضر کر لیجئے ؎

تنہائی کے سب دن ہین تنہائی کی سب راتین ۔۔۔ اب ہونے لگین ان سے خلوت مین ملاقاتین
ہر لحظہ تشفی ہے، ہر آن تسلی ہے ۔۔۔ ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہین مداراتین
کوثر کے تقاضے ہین، تسنیم کے وعدے ہین ۔۔۔ ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتین
معراج کی سی حاصل سجدون مین ہے کیفیت ۔۔۔ اک فاسق و فاجر مین اور ایسی کراماتین
بے مایہ ہین ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجین ۔۔۔ بھیجی ہین درودون کی کچھ ہم نے بھی سوغاتین

ایک بار پھر ذرا محمد علی کا سراپا آنکھون کے سامنے لے آیئے۔ علی گڈھ اور آکسفورڈ کا گریجویٹ تمامتر صاحبیت اور نیچریت کی فضا مین پلا ہوا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ سوٹ بوٹ کا خوگر۔ ہر وقت انگریزی بولنا چالنا لکھنا پڑھنا، انگریزی ہی مین سوچنا۔ "صاحبون" ہی سے سارے تعلقات۔ کہ اک دم سے کایا پلٹ ہوتی ہے۔ اب چہرہ پر پوری داڑھی ہے،

اور کتری ہوئی شرعی وضع کی لبین۔ جسم پر کھدر کا کرتا اور ڈھیلی ڈھالی عبا۔ وضع اور صورت ٹھیٹھ مولویانہ۔ ہفتون مین نہین مہینون سے اخبار کی صورت کو ترسا ہوا۔ آس پاس نہ کہین ٹائمس (لندن) کا پتہ نہ اسٹیٹسمن (کلکتہ) کا "دلجوئی" اور "مدارات" ایسے بے بس مظلوم استی کی بھی اگر نہ ہوتی رہتی، تو وہ غریب تو شاید سر پھوڑ کر اپنے کو ہلاک ہی کر ڈالتا!

یہ غزل خوب ہی چھپی۔ گھر گھر گائی گئی، سنائی گئی، گنگنائی گئی۔ دوسری غزلون کے بھی کوئی کوئی شعر کہنا چاہیے کہ الہامی ہی نکلے۔ یورپ کی جنگ عظیم مدت ہوئی ختم ہو چکی تھی، لیکن ترکون کی جنگ یونان سے ابھی جاری تھی، اور خلافت کا مقدس ادارہ بہرحال ابھی تک قائم تھا۔ اور اسی کے تحفظ و بقا کے لیے تو ہندوستان بھر مین محمد علی خلافت کمیٹیان قائم کرا چکے تھے۔ مہینوں کے صبر آزما اور شدید حالات امید و بیم کے بعد بالآخر ترکون کو یونان پر فتح حاصل ہوئی، اور مصطفٰے کمال پاشا کی تلوار ولایت سمرنا پر قابض ہو گئی۔ محمد علی، شہر کی آبادی سے دور، بیجاپور جیل کی بلند چار دیواری کے اندر مقید ہین، اور اخبار کے نام سے تو انھین کاغذ کا پرزہ بھی دیکھنے کو نصیب نہین۔ ایک روز دور سے اللہ اکبر کے نعرون کی آواز سنتے ہین، دل اندر سے گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو ترکون کی فتح کی خبر آئی ہے، اور مسلمان خوشی سے نعرے لگا رہے ہین:۔ اس شہادت قلب پر اعتبار کر کے جوش مین آ، معاً ایک پوری غزل کہہ ڈالتے ہین۔ مگر دل میں یہ دھڑکا بھی لگا ہوا ہے کہ کہین قیاس غلط نہ نکلے۔ فراستِ ایمانی کہیے، یا کشف، بہرحال بات سچ نکلی ـــــــ مطلع آپ بھی ملاحظہ کریں ؎

عالم میں آج دھوم ہے فتحِ مبین کی ‏ ‏ ‏ ‏ سن لی خدا نے قیدیِ گوشہ نشین کی

بیشک قیدی گوشہ نشین کی سن لی گئی تھی، اور دعا قبول ہو چکی تھی۔ مطلع کے بعد ہی فرماتے ہیں، اور اپنے متن کی خود ہی شرح و تفسیر کر جاتے ہیں ؂

شیطان جلد باز کا جادو نہ چل سکا — تفسیر آج ہو گئی کید متین کی[1]

آگے اور کھلتے جاتے ہیں۔ دل میں تو اصلی تڑپ جزیرۃ العرب کی آزادی و خود مختاری کی تھی۔ سمرنا کی فتح کو اس کا محض مقدمہ یا پیش خیمہ یقین کر کے یوں عرض نیاز کرتے ہیں ؂

ہے نام مصطفےٰ کی یہ برکت کہ پھر خدا — یوں جڑ جما رہا ہے محمدؐ کے دین کی

تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا — اک عرض اور ہے ابھی اس کمترین کی

اک گھر ترا یہاں بھی تو ہے اُسکے باب میں — کب ہو گی لامکاں سے مشیت مکین کی

اس آستان پاک پہ گھسنا ہے چل کے سر — سجدوں سے اور بڑھتی ہے رفعت جبین کی

تینوں حرم ہیں اسکے جو ہے لاشریک لہ — ترکیب ہے درست بھی ایک تین کی

طویل غزل ساری اسی رنگ میں ہے۔

اور اسی کے چند روز بعد یہ ولولہ انگیز غزل بھی ؂

آخر کو لے کے عرش سے فتح و ظفر گئی — مظلوم کی دعا بھی کہیں بے اثر گئی!

عالم کا رنگ اور سے کچھ اور ہو گیا — ہم بیکسوں کی آہ عجب کام کر گئی!

اب کی جیل تھا مع اپنی تمام سختیوں کے۔ نظر بندی کی سہولتیں کوئی بھی نہ تھیں۔ جسم کا وزن گھٹ گیا۔ جسمانی و روحانی شدائد کے علاوہ بڑے بھیا، شوکت سے جدائی سوہان روح۔ وہ الگ لے جا کر راجکوٹ جیل میں بند کیے گئے تھے شعر نہیں کہتے، آنسو پی پی کر آپ بیتی سناتے جاتے ہیں ؂

[1] اشارہ ہے آیۂ کریمہ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ کی جانب۔

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے — ہم نہ تھے ان کے آستانے کے [1]

ایک ایک کر کے سب کے سب تنکے — ہوئے برباد آشیانے کے [2]

کچھ دنوں گھومنا مقدر تھا — ساتھ ساتھ اپنے آب و دانے کے [3]

دیکھیے اب یہ گردشِ تقدیر — کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے [4]

پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال — ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

حسِ ظرافت نے اس غم و حزن، انقباض و افسردگی میں بھی ساتھ نہ چھوڑا، اور شوخ نگاری اب بھی رفیق رہی۔ شگفتہ کی ایک غزل ہے ؎

کم فہم ہیں تو کم ہیں پریشانیوں میں ہم — دانائیوں سے اچھے ہیں نادانیوں میں ہم

اس پر غزل کہتے ہیں، اور قدم قدم پر شوخی و زندہ دلی کی پچکاریوں سے رنگ کھیلتے جاتے ہیں ؎

کیوں شہر چھوڑ جا کے پھنسیں دہقانیوں میں ہم — مجنوں کے ساتھ ہوں گے بیابانیوں میں ہم

شوکت صاحب ماشاء اللہ بڑے قد آور، لحیم و شحیم تھے۔ جوہر نے کہیں سن گن پائی تھی، کہ راجکوٹ جیل میں ان کا وزن بہت گھٹ گیا، اور وہ دبلے ہو گئے ہیں۔ تو انکی زبان سے کہہ ڈالا ؎

شوکت یہ کہتے ہیں "وہ تن و توش جب نہیں — پھر کیوں گھٹیں نہ اپنی گورو جانیوں میں ہم"

---

۱ وطن (رام پور) میں قدم رکھنا ممنوع ہو چکا تھا۔ ۲ جب کوئی اپنا گھر ہی نہ رہا تھا تو خانہ داری کا سارا ساز و سامان کہاں رکھتے۔ قیمتی سا قیمتی فرنیچر برباد اور تتر بتر ہو چکا تھا۔ ۳ اپنی مسلسل دربدری کی جانب اشارہ ہے۔ ۴ مسلسل نظربندی اور اسیری کا بیان ہے۔

ضلع علی گڈھ کے رئیسوں کا ایک مشہور و شریف خاندان شروانیوں کا ہے۔ اس کے اکابر سے بڑی سیاسی چشمک رہتی تھی۔ لیکن اسی خاندان میں بیرسٹر تصدق احمد خان ان کے ایک بڑے مخلص بھی تھے، ان کا تصور جما کر فرماتے ہیں ؎

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں میں ہم

ترکوں کی امداد کے لیے بعض پرجوش مسلمانوں کی تجویز تھی کہ ایک جیش بھرتی کرکے انگورہ (انقرہ) روانہ کی جائے۔ اس پر ایک اینگلو انڈین کرنل گڈنی نے کہا کہ ہم لوگ ایک جیش یونان کی حمایت میں بھرتی کریںگے۔ اس پر وقت کے ایک معلوم و معروف "خان بہادر" کی زبان کو یوں حرکت میں لاتے ہیں ؎

شرط وفا یہی ہے تقاضائے دیں یہی
گڈنی کے ساتھ جا ملیں یونانیوں میں ہم

ظرافت و مطائبہ کے حمام میں جب مخلّی بالطبع ہو کر آتے تو نوبت کبھی کبھی عریانیوں کی بھی آجاتی، اور سعدی اور جامی جیسے ثقات کی ہزل گوئی کی یاد تازہ ہو جاتی۔ اسی غزل کے ایک شعر کے پہلے مصرعہ میں علی گڈھ کے مشہور خان بہادر کا نام ہے، جو نو مسلم ہیں اور اسلئے غیر مختون اور دوسرے مصرعہ کا خاتمہ ہے "مسلمانیوں میں ہم"۔ یہ شعر نہ اسوقت چھپ سکا تھا، اور نہ اب اس کے چھاپنے کی ہمت ہو رہی ہے۔

سردی کے موسم میں جیل میں جو کھانا ملتا، اسے بچا کر رکھ لیتے رات کے وقت لالٹین پر گرم کرکے کھاتے، اور اس کا نام حمیرہ رکھتے۔ جمے ہوئے اور ٹھنڈے حصہ کو "زمہریرہ" کہتے۔ کھانے کی مقدار ہوتی ہی کیا تھی لیکن فیاضی اور سیر چشمی کی شان یہ تھی کہ اس کھانے کو بھی تنہا نہ کھاتے، ساتھ کے قیدیوں کو شریک کرکے کھاتے۔

کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ، خوشنما چھوٹی تقطیع پر عرضِ جوہر کے نام سے پہلے ہی ۱۹۲۱ء کے آخیر مین شائع کر چکے تھے۔ اور وہ مجموعہ ہاتھون ہاتھ نکل بھی گیا تھا۔ اب جو یہ نیا ذخیرہ کلام کا اور اکٹھا ہو گیا تو ۱۹۲۲ء ہی مین مکتبہ جامعہ کو دوسرا اور مکمل اڈیشن شائع کرنے کی سوجھی۔ اور نیا اڈیشن، پہلے سے نسبتہً ضخیم، مجموعۂ کلامِ جوہر کے نام سے ۱۹۲۳ء مین قبل اس کے کہ مولانا جیل سے باہر آئیں، چھپ کر شائع ہو گیا۔ کلام پر مقدمہ لکھنے کی فرمایش اس قصبائی سے ہوئی۔ بڑے شوق کے ساتھ، لپک کر پوری کی گئی۔ "جوہر اور ان کی شاعری" کے عنوان سے جو چند صفحات لکھے گئے، وہ ماہنامہ جامعہ میں بھی بطورِ مضمون کے نکلے، اور اور جگہ بھی خوب نقل ہوئے ــــــ مولانا کی مقبولیت کے طفیل میں کچھ تھوڑی سی مقبولیت ان کے مقدمہ نگار کے نصیب مین بھی آ گئی ع

جان ڈالی ہے ترے نام نے افسانے میں!

ــــــــــــــ . ــــــــــــــ

باب (۱۷)

سنہ ۱۹۲۳ء (۱)

(داغ جگر ۔ رہائی ۔ "انبساط عید دیدن روے تو")

محمد علی کی زندگی ہی آزمایشون کے لیے وقف تھی ۔ ایکی بار ایک بڑی ہی کڑی آزمایش سے گزرنا پڑا ۔ اولاد میں لڑکا تو کوئی تھا نہین، لڑکیان چار تھین ۔ چارون بڑی دلاری، بڑی چہیتی ۔ اور کیسے نہ ہوتیں ۔ جو دوسرون کی اولاد کے لیے بیتاب ہو ہو جاتا تھا، وہ خود اپنے کلیجہ کے ٹکڑون کے پیچھے کیسا کچھ دیوانہ نہ رہتا! منجھلی صاحبزادی آمنہ ہی اور زیادہ عزیز تھین ۔ محمد علی کے تازہ امتحان کے لیے انتخاب ان ہی کا ہوا ۔ جو ان دنون ہی چار سال کی بیاہی ہوئی تھین ۔ ادھر باپ بیجاپور جیل مین بند ہوئے، اُدھر یہ بیمار پڑیں ۔ مرض بالآخر دق تجویز ہوا! خبر پہنچی، تو دل مسوس کر، کلیجہ تھام کر رہ گئے ۔ باہر ہوتے تو دوا علاج کی دوڑ دھوپ مین زمین آسمان ایک کر دیتے ۔ اس وقت اتنا بس بھی نہین، کہ ایک نظر آ کر دیکھ ہی لین ۔

ایک نالۂ موزون مین اپنے پروردگار سے فریاد کی ۔ پوری نظم اسی زمانہ مین، روزنامہ خلافت (اُس زمانہ کے خلافت) مین "پیامِ محبس" کے عنوان سے نکل بھی گئی تھی ۔ ملاحظت ۔ براہ راست خطاب بیٹی سے ہے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

امتحان سخت سہی پر دل مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال مین امید سے معمور نہین

ساتویں شعر مین کلیجہ پر پتھر رکھ کر لاڈلی اور نازون کی پالی بیٹی کو مخاطب کرتے ہین، لیکن نظرین شاید عرش والے مالک و مولیٰ ہی کی طرف اٹھی ہوئی ہین۔

تیری صحت ہمین مطلوب ہے لیکن اسکو
نہین منظور، تو پھر ہم کو بھی منظور نہین

دسوین شعر مین عبدیت پھر مقام تفویض و توکل پر غالب آگئی ہے ——— بندہ اپنے مالک کے قدمون پر گرا ہوا، گڑگڑا رہا ہے ؎

تیری قدرت سے خدایا تری رحمت نہین کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

آگے قصۂ یعقوب و یوسف علیہما السلام کی تلمیحات ہین اور اس کے بعد چودھوین شعر مین پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہین ؎

میری اولاد کو بھی مجھ سے ملا دے یارب
تو ہی کہہ دے تری رحمت کا یہ دستور نہین

اگست ۲۳ء کی آخری تاریخین تھین، جب قید فرنگ سے رہائی ہوئی۔ بیجاپور جیل سے چپ چپاتے جھانسی لائے گئے، اور یہان اسٹیشن پر چھوڑ دیے گئے۔ قوم کو سن گن مل ہی گئی تھی، اور حیات صاحب ——— وہی حسن محمد حیات صاحب (علیگ پنجابی جو مدتون مولانا کے سکریٹری رہے تھے، اور اس وقت جامعہ ملیہ کے رجسٹرار تھے ——— پہلے ہی سے جھانسی اسٹیشن جا پہنچے تھے۔ ملک بھر مین ایک جشن مسرت و شادمانی برپا ہو گیا۔ گویا رام چندر جی مدتون کے بن باس کے بعد اجودھیا پھر واپس آ گئے! ملک کی کیسی کایا پلٹ اس دو برس مین ہو گئی تھی۔ اور علی برادران کے بعد

گاندھی جی، مولانا ابوالکلام، ڈاکٹر محمود، اور بیسیون مخلص کارکنون کی گرفتاری اور اسیری کے بعد فضا مین کیسا سناٹا اس سرے سے اس سرے تک چھا گیا تھا، اس کا اندازہ خود مولانا کے ایک مضمون سے کیجئے، جو کئی سال بعد جنوری ۲۹ء مین ہمدرد مین ان کے قلم سے نکلا تھا:۔

"ہمارے قید ہوتے ہی ہندو مہاسبھائی مہاراشٹر نے مہاتما گاندھی اور عدم تعاون کے خلاف عَلَم بغاوت بلند کیا۔ خود مہاتما گاندھی نے حکومت کو الٹیمیٹم دے چکنے کے بعد باردولی مین وہ روش اختیار کی، جسے ملک نے ہتھیار ڈال دینے کے مرادف سمجھا اور وہ خود بھی ہماری طرح قید کر دیے گئے۔ ان کے قید ہونے کے بعد پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو داس آنجہانی آزاد ہوئے اور بجائے سول نافرمانی شروع کرنے کے جس کا یادش بخیر اب پھر کلکتہ مین نام لیا گیا ہے، گیا مین سوراج کے نام سے وہ علم بغاوت بلند کیا گیا، جس نے عدم تعاون کی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ پھر لطف یہ کہ ہندو مہاسبھائیون نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کین جنھون نے ان مذہبی تعصبات کی آگ کو بھڑکا دیا جنھین ہم ٹھنڈا کر چکے تھے۔ اور ان کے جواب مین مسلمانان پنجاب میں سے اسی عنصر نے تبلیغ و تنظیم کے نام سے وہ زبانی جمع خرچ دکھانا شروع کیا جو آج وطن پرستی اور ملت شکنی کا ڈھول بجا رہا ہے۔ اس طرح ہمارا کیا کرایا کام اکارت گیا، اور جب مجھے جیل خانہ ہی مین اس کا احساس ہوا تو مین نے اس طرح اس کا اظہار کیا ؎

یہ حالت ہو گئی ہی ایک ساقی کے نہ ہونے سے ۔۔۔ کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

یہ تھی وہ روداد چمن جو دوسری گرفتاری سے رہائی پر مین نے آکر سنی۔"

سیاسی دنیا مین مولانا کی شہرت کا شباب تھا۔ عین اسی وقت دہلی مین کانگرس کا ایک خصوصی (اسپشل) جلاس منعقد ہوا۔ مولانا ہی کی صدارت مین۔ ایک نئی زبردست پارٹی بنگال کے سی۔ آر۔ داس اور یوپی کے پنڈت موتی لال نہرو کی رہبری مین سوراج پارٹی کے نام سے وجود مین آچکی تھی، جس کا مقصد کونسلون سے بے تعلقی ختم کرکے کونسلون اسمبلیون وغیرہ پر قبضہ کر لینا تھا۔ اس کے مقابل دوسری جماعت "نو چینجرز" (تبدیلی نہ کرنے والون) کے نام سے موسوم تھی، یہ لوگ راج گوپال آچاریہ (موجودہ گورنر جنرل ہند)[1] وغیرہ کی رہبری مین گاندھی جی کے قدیم مسلک مقاطعہ کونسل پر قائم تھی۔ محمد علی تھے تو اسی آخری جماعت کے ہم خیال، لیکن بہ حیثیت صدر، فریقین کے درمیان مصالحت کو اہم و مقدم سمجھے۔ بہرحال جھانسی سے سیدھے دلی روانہ ہوگئے۔

دو دن، چار دن نہین، دو برس کی طویل مفارقت کے بعد گھر اور گھر والون سے ملاقات کا موقع نصیب ہو رہا تھا، اور پھر عزیز و محبوب جوان بیٹی دق کے مرض مہلک مین مبتلا۔ عین فطرت بشری (اور بشر بھی کون؟ محمد علی جیسا مہر و محبت کا پتلا) کا تقاضا تھا کہ تیر کی طرح سیدھے اس بیمار بچی کے پہلو تک پہنچتے، لیکن رخ بجائے ادھر کے دہلی کا کر دیا! ——— یہ کوئی معمولی مجاہدہ نہ تھا، لیکن ایسے ایسے مجاہدے تو اب محمد علی کی زندگی کا جزو بن چکے تھے۔ دور ملکی و ملی خدمات کی دھن نے اب خانگی زندگی کے تقاضون کے پورے ہونے کے لیے جگہ ہی کہان باقی رکھی تھی۔

جھانسی دہلی کے اس سفر مین حیات صاحب نے جہان اور بہت سی خبرین سنائین

[1] سنہ ۱۹۴۸ء مین۔

وہاں یہ بھی کہدیا کہ کلام جوہر کا نیا ایڈیشن اضافہ کے بعد نکلا ہے، اور اُنکی مقدمہ عبدالماجد دریابادی سے لکھوایا گیا ہے۔ مولانا کی زبان سے قدرۃً نکلا "مولانا عبدالماجد بدایونی ان ہی کا دیباچہ تو پہلے اڈیشن پر بھی تھا۔" "جی نہین" حیات صاحب پھر گویا ہوئے "بدایونی نہین، ان کے ہمنام مولانا دریابادی! ——— اچھا ماجد میان دریابادی" مولانا نے حیرت سے فرمایا، اور حیرت کچھ بیجا تھی بھی نہین۔

دل ملاقات، زیارت، دست بوسی، قدم بوسی، سب کیلیے بیتاب تھا، مہینون سے بیتاب ہو رہا تھا۔ محمد علی کی علمی عظمت، ان کی ادبی قابلیت کا اعتراف ان کے دماغی کمالات کا احترام، دل مین ہمیشہ سے تھا۔ ان سے دینی و روحانی عقیدت اب پیدا ہوئی تھی اور جب سے ان کی نعتیہ غزل "تنہائی کے سب دن ہین تنہائی کی سب راتین" کان مین پڑی تھی، اس وقت سے تو عقیدت کا ایک بے پناہ طوفان سینہ مین جوش مار رہا تھا۔ اور دل بار بار کہہ رہا تھا، کہ مرشد بنانے کے قابل کوئی ہے تو یہی، یہ شخص تو اس قابل ہے کہ بیعت اس کے ہاتھ پر کیجائے۔ دوست احباب سے ذکر آیا، تو کچھ نے تو ہان مین ہان ملائی۔ لیکن ایک گروہ نے اسے حیرت کے کانون سے سنا ——— رسمی مشائخ اور پیرزادون کے ہان جو لوازم سمجھے جاتے ہین، وہ محمد علی غریب کے ہاں کہان تھے، اور کہان سے ہو سکتے تھے۔ نہ ان کا قیام کسی "درگاہ" کے آستانہ پر، نہ وہ کوئی باضابطہ پیرزادہ، نہ کسی پیر فقیر کے سجادہ نشین، پھر آخر کیسے ان کے ہاتھ مین ہاتھ دیا جا سکتا تھا؟ ——— برسون کے بعد جب حضرت تھانویؒ کے فیضِ صحبت سے بیعت کی حقیقت اور مرشد کے حقیقی اوصاف سمجھ مین آئے، اور

مرشد کا ترجمہ "مصلح" ذہن نشین ہوا، جب بھی جہاں تک شخصی اخلاص، تدین اور اللہ کے سوا ہر شے سے بےخوفی کا تعلق ہے۔ محمد علی کی شخصیت پر نظر برابر اسی طرح جمی رہی۔

عین اسی اگست میں اپنی خانگی زندگی میں ایک واقعہ سخت قسم کا پیش آگیا۔ اپنے ایک حقیقی چچیرے بھائی اور سگے بہنوئی، جو برتاؤ میں بالکل مثل حقیقی بھائی کے تھے، اور پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے، مرض دق میں چند ہفتہ بیمار رہ کر لکھنؤ میں وفات پاگئے۔ گوناگون تعلقات کی بنا پر اس وفات کا صدمہ بہت ہی زاید ہوا۔ میری مالی کفالت بھی اس وقت تک ایک خاصی حد تک وہی مرحوم کرتے رہتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا، لیکن محمد علی کی رہائی کی خوشخبری ایسی نہ تھی جو دل کو باغ باغ نہ کر دیتی۔ اس مسرت نے اس صدمہ کو بھی ایک حد تک دبا دیا، اور دل بےچین رہنے لگا کہ کس طرح اڑ کر محمد علی تک پہنچوں ——— روایتیں معتبر اور پیہم پہنچ رہی تھیں کہ جیل سے نور مجسم ہو کر نکلے ہیں۔ سمند شوق کے حق میں یہ تازیانہ تھا۔

لیکن لوگوں نے یہ بھی کہا، اور سچ کہا کہ دہلی میں بھلا محمد علی کو بات کرنے کی بھی فرصت کہاں ہوگی؟ یوں ہی کیا کم مشغول رہتے تھے، اور اب تو گاندھی جی قید میں ہیں، ان کا بار بھی ان ہی پر آپڑا ہے۔ کانگریس کے اجلاس کے ابھی تین چار مہینے ہیں تو کیا ہوا، نام تو ان ہی کا صدارت کے لیے تجویز ہو رہا ہے۔ اس وقت تو بالکل ہی گھرے ہوئے ہوں گے۔ لڑکی کو دیکھنے بھوالی پہاڑ پر آخر جلدی ہی جائیں گے، اطمینان کی ملاقات پھر اگر کہیں ہو سکتی ہے تو وہیں۔ اس کے قبل اور کہیں اور نہیں رائے معقول تھی، ماننے ہی اور صبر کرتے ہی بنی۔ لیکن مراسلت کو کون روک سکتا تھا ——— جواب آنے کا تو کوئی امکان ہی نہ تھا۔ اور اس کا انتظار تھا ہی کس کو مقصود تو خط

لکھ کر اپنے ہی دل کو تسکین دے لیتا تھا۔ قیس عامری کو لوگون نے دیکھا کہ کاغذ، قلم، روشنائی کے بغیر بادیۂ عرب کی ریت پر انگلیون سے قلم کا کام لے رہا ہے۔ لوگوں نے کہا، یہ کیا؟ دیوانہ نے جواب دیا ؎

گفت مشقِ نامِ لیلیٰ می کنم ‏ ‏ خاطرِ خود را تسلی می دہم

ضمیمہ باب (۱۷)

(قوالی)

مولوی حاجی مسعود علی ندوی صاحب (منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ) میرے لڑکپن کے ساتھیوں مین ہین۔ تحریک خلافت کے ممتاز کارکنون مین رہ چکے ہین۔ اس وقت تک علی برادران کے مخصوص مخلصین مین تھے۔ ستمبر ۲۳ء مین مولانا کی رہائی پر دہلی ان سے ملنے گئے۔ وہان سے واپسی پر جو خط میرے نام لکھا، وہ اس قابل ہے کہ اس باب کے ضمیمہ کے طور پر تمام و کمال پڑھ لیا جائے:۔

اعظم گڈھ۔ ۲۶ ستمبر ۲۳ء

مکرمی۔ سلام مسنون

افسوس ہے کہ باوجود وعدے کے مین آپ کو دہلی سے خط نہ لکھ سکا۔ دوران قیام مین وقت ایسا نہیں ملا جس کو مین اطمینان سے خط لکھنے پر صرف کر سکتا۔ ایک معمولی بات تو یہی تھی کہ کم و بیش ۵۰ مہمان ڈاکٹر صاحب[1] کی کوٹھی مین مقیم تھے، بہر حال مین علی گڈھ سے حضرت جوہر کو دہلی تک پہنچا کر پرسون واپس آیا۔ مفصل کیفیت میرے لیے لکھنا ناممکن ہے۔ جیل سے مجسّم نور ہو کر وہ نکلے ہین، بات بات پر خوب رو دیتے ہین اور بہتون کو رلا

---

[1] یعنی ڈاکٹر انصاری صاحب۔

دیتے ہیں۔ امید سے بہت زیادہ مطمئن ملاقات ہوئی۔ قوال نہ لیجانے کا سخت افسوس ہوا۔
دہلی میں کافی کوشش کی گئی لیکن کوئی قوال نہ مل سکا حسن نظامی صاحب نے انتظام کیا
تھا لیکن عین وقت پر وہ سخت بیمار ہو گئے۔ میاں افضل کا میں نے کافی تذکرہ کیا۔ جدید
نظموں کا ایک تھیلا ساتھ آیا ہے۔ تین چار مرتبہ رات کو کھلا اور ایک بڑی تعداد سننے
کو ملی، جامعہ میں چھپنے کے لیے دی گئی ہیں۔ آپ کا خط دیا، پڑھکر بہت متاثر ہوئے۔
عرف ایک جملہ کہا کہ "ایسے مرید اگر ملے تو پیر بننا پڑیگا" [له] اس کے بعد مختلف اوقات میں میں نے
مفصل تذکرہ کیا۔ آپ کا خط برابر جیب میں رہا اور اکثر بوقت تذکرہ اس کا کچھ حصہ جیب سے
باہر نکل آتا تھا۔ بھوالی سے مفصل جواب دیں گے۔ اطمینان کی ملاقات سوا بھوالی کے اور کسی
دوسری جگہ دشوار ہے، وہاں البتہ پورا اطمینان وسکون ہے۔ وہ لکھنؤ ابھی نہیں آئیں گے۔
بھوالی سے جس وقت آئیں گے پھر ہنگاموں میں شریک ہو جائیں گے۔ یہی کہتے بھی تھے کہ کاش
بھوالی آتے تو بہت اطمینان سے ملاقات ہوتی۔

اب نہایت غیر معمولی حالت پیدا ہو گئی ہے، میں نے اس سے پورا لطف حاصل کیا۔ واپسی
میں زبردستی علی گڈھ ٹھہرایا۔ اس کے بعد باوجود کوشش کے مجھکو رہائی نہیں ملی اور بریلی کے قریب
تک ساتھ جانا پڑا بعض بعض نہایت دلچسپ واقعات پیش آئے۔ مثلاً ایک جگہ میں نے چپکے
بستر کھول کر بچھا دیا۔ جب یہ معلوم ہوا اس وقت جس محبت کا اظہار ہوا اسکا لطف ابھی تک
لے رہا ہوں۔ میں تو اب حضرت جوہر کی روحانیت و محبت کو سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں،
بس اور کیا لکھوں۔

له اپنی زندگی کے اس دور میں سماع کا دلدادہ تھا۔ افضل حسین میری خاص قوال کا نام تھا۔ انھیں میرے مولانا
کی غزلیں یاد کرا دی تھیں۔ اس وقت دل میں یہی ٹھن رہی تھی کہ بیعت حضرت جوہر کے ہاتھ پر کر لیجئے۔

باب (۱۸)

سنہ ۱۹۲۳ء (۲)

(صدرِ کانگریس ۔ میزبانی ۔ تیمارداری)

ہوتے ہوتے شروع نومبر کی کوئی تاریخ آگئی جب میں بھوالی روانہ ہوسکا۔ لکھنؤ سے بریلی اور بریلی سے چھوٹی لائن پر کاٹھ گودام۔ یہاں سے بھوالی کے لیے لاری ملی۔ وقت کوئی ۱۰، ۱۱ بجے دن کا۔ اتفاق سے جمعہ کا دن تھا۔ راستہ میں ایک چھوٹی سی مسجد دکھائی دی۔ جمعہ کی نماز کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شریک جماعت ہولیا۔ بھوالی مولانا کے قیام گاہ پر قریب ۲ بجے کے پہنچا —— راستہ کے شوق و اشتیاق کا کیا پوچھنا۔ کہنا چاہیے کہ مرید مرشد کی خدمت میں حاضر ہو رہا تھا۔ اس سے قبل کی ساری ملاقاتیں "دورِ جاہلیت" کی تھیں۔ پوری طرح پر تجدید اسلام کے بعد نیازیہ پہلی بار حاصل ہو رہا تھا اور خود محمد علی بھی مجاہدوں پر مجاہدے، اختیاری اور اضطراری، دونوں طرح کے کر کر کے، خوب ہی دل دہل چکے، نکھر چکے تھے۔ آمد کی اطلاع پہلے سے دے دی گئی۔

---

۲ بج چکے تھے، لیکن مولانا جمعہ پڑھ کر اب تک واپس نہیں آئے تھے۔ مسجد فاصلہ پر تھی، پھر پہاڑ کے راستے اور وہ بھی بالکل اجنبی۔ جانے کی ہمت نہ ہوئی، ورنہ جی بے اختیار

ہورہا تھا کہ مسجد ہی جا پہنچوں۔ ایک ایک منٹ بھاری گزر رہا تھا۔ مولانا کے اور عزیز موجود تھے، وہ بیچارے اپنی والی ہر طرح خاطر مدارات کرتے رہے —— ہوتے ہوتے ۹ بجنے کو آگئے، جب کہیں مولانا واپس آئے۔ اشتیاق مین دو ایک فرلانگ استقبال کے لیے بڑھ گیا تھا۔ دیکھا کہ تشریف لا رہے ہیں۔ چہرہ کی نورانیت کا اب کیا کہنا۔ لیکن تنہا نہیں ہین، مسجد کے امام صاحب بھی ساتھ ساتھ ہین۔ اور اُن سے مولانا کسی سرگرم مباحثہ مین منہمک ہین، میری طرف سرے سے دیکھ ہی نہین رہے ہین۔ مسجد کے سلسلہ مین کوئی انتظام درپیش تھا۔ اور اسی کے باب مین حسب عادت اتنا جوش و انہاک تھا۔

بھوالی کوئی بڑا شہر نہین، کوئی مرکزی حیثیت نہیں رکھتا۔ ایک دوُ افتادہ پہاڑی مقام ہے۔ مسلمانون کی آبادی بھی کچھ واجبی سی۔ مسلمان نہ صاحب اثر و وجاہت نہ تعداد ہی میں کسی شمار و قطار مین۔ لیکن محمد علی کے اخلاص کو ان چیزون کی پرواہی کب تھی۔ چھوٹا یا بڑا کوئی سا بھی کام مسلمانون کا ہو، بس ان کے جوش و انہاک کے لیے یہی کافی تھا کہ کام مسلمانون کا ہے۔ شہر اور گاؤن سب ان کی نظر مین ایک ——

جتنا مین ان کے ملنے کا مشتاق تھا، اُسی قدر وہ خود بھی میرے مشاق تھے۔ لیکن بحث کے انہاک مین کیسی دوستی اور کس کی ملاقات۔ دس منٹ، بیس منٹ، خدا جانے کتنی دیر ہو گئی۔ مین منتظر کھڑا ہون، اور وہ مجھے دیکھ چکنے کے بعد اسی سرگرمی کے ساتھ بحث مین جٹے ہوئے۔ جی بھر کر تقریر و استدلال سے فارغ ہو لیے جب جا کر میری طرف ملتفت ہوئے۔ اُس وقت کے التفات کا نقشہ کیا بیان ہو! معلوم ہوتا تھا کہ محبت و شفقت کے دریا کا بند ٹوٹ گیا ہے، اور چشمہ ہے کہ ابلا پڑتا ہے!

کئی دن کی یکجائی اور لطف صحبت کا موقع پہلی بار ملا۔ محمد علی اپنی اولاد کے حق مین محض باپ نہ تھے، ماں سے بھی بڑھ کر تھے۔ جان کے برابر عزیز بیٹی کی تیمارداری، دقت پر دوا پلانا، پرہیز، غذا کھلانا، سب کچھ خود ہی کرتے تھے۔ جیل سے باہر آتے ہی قوم کا حکم ملا تھا کہ سب سے بڑا قومی منصب یعنی کانگرس کی صدارت سال آیندہ کے لیے قبول کریں۔ گاندھی جی جیل مین تھے۔ محمد علی اپنی شخصیت کے لحاظ سے یون بھی اب سب سے بڑے سیاسی لیڈر کہے جاسکتے تھے، اور پھر اس صدارت نے تو انھین ضابطہ سے بھی ملک کا سب سے بڑا سردار بنا دیا۔ ملنے والون اور سیاسی کارکنون کی کمی بھلا کیا جیسے کور دیہہ مین بھی نہ تھی، پھر ڈاک کا انبار، تار برقیون کا ہجوم۔ ان سب مصروفیتون کے باوجود میزبانی اور مہمان نوازی کے جوش مین ذرا کمی نہین —— اصل کوٹھی بھی خاصی وسیع تھی۔ لیکن مکان کے مکینون کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ میرے ٹھہرنے کا انتظام اس سے ذرا الگ ایک دوسری کوٹھی مین کیا گیا۔ لیکن بجز اس کے کہ رات گئے وہاں جاکر سو رہوں، اور سارا وقت یہین گزرتا، اور مولانا کی زندگی کے سارے شعبے نظر کے سامنے آتے رہتے ——

لاڈلی اور چہیتی جوان لڑکی دق مین مبتلا اور صاحب فراش ہے۔ دیکھتے دیکھتے ہاتھ سے جا رہی ہے۔ غمزدہ باپ نے پورے دو برس کے بعد اس کی شکل دیکھی ہے۔ باہر مردانہ مین بیٹھے باتین کرتے کرتے بیقرار ہو کر دوا پلانے یا بیٹی کا دل بہلانے کو اندر اٹھ کر چلے جاتے ہین، پھر کچھ ہی دیر بعد باہر آجاتے ہیں، اور ملنے والون کو، آنے جانے والوں کو، مسلمانون ہی کو نہین، اُن مین سے ہندوون کو بھی کھانے کی دعوت دے رہے ہین۔ اور زبردستی کھینچ کھینچ کر دسترخوان پر بٹھا رہے ہین۔ ہندو ملنے والون مین ایک کانگرسی کارکن بابو شمبھو ناتھ سیتا پوری کا نام خاص طور پر یاد آرہا ہے۔ وہ خود بھی بالکل عزیزون کی طرح

بے تکلف تھے، اور ان کے ہاں کی عورتیں بھی۔ اور اور ہندو احباب بھی تھے۔ حد و اعتدال سے بڑھی ہوئی مسرفانہ مہمان نوازی کے منظر بعد کو تو اور بھی دیکھنے میں آئے، پہلا منظر یہیں دیکھا۔ مولانا اچھے کھانے کے خود بھی شوقین تھے۔ ہر لذیذ کھانا بڑی ہی رغبت سے کھاتے۔ کھانے پر ماش کی کھچڑی خوب گھی کے ساتھ اکثر ہوتی۔

مولانا کے سالے معظم علی صاحب (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا جنھوں نے برادران کی قید کے زمانہ میں، بمبئی میں رہ کر خلافت کمیٹی کے کام کو خوب سنبھالا تھا، اور عرصہ تک اس کے جنرل سکریٹری رہے تھے، اور بعد کو رامپور اور اندور کی ریاستی ہائی کورٹوں کے چیف جج ہو گئے تھے، وہ بھی یہیں مقیم تھے۔ اور مولانا کے دونوں داماد زاہد علی (بڑی لڑکی کے شوہر اور مولانا کے بھتیجے) اور محمود اللہ (اسی منجھلی بیمار لڑکی کے شوہر) بھی۔ کلام جوہر کا نیا ایڈیشن جو اسی قید کے زمانہ میں جامعہ کی طرف سے شائع ہوا تھا ابھی گزر چکا ہے کہ اس پر مقدمہ اسی نیازمند کا تھا۔ اس تقریب سے شعر و شاعری کے چرچے اکثر رہا کرتے۔ کبھی اپنا کلام اپنی زبان سے سناتے۔ اپنے اشعار کی "شانِ نزول" یا پس منظر بتاتے جاتے۔ اور کبھی مجھ سے فرمائش کر دیتے کہ میں اپنی خرافات سناؤں خیر، اس کو تو میں ہمیشہ ٹال لے جاتا، اور الٹا جھگڑ جھگڑ ان ہی سے ان کی "تنہائی کی راتوں میں" "خلوت کی ملاقاتوں" کا حال پوچھا کرتا۔ مسجد بہت فاصلہ پر تھی۔ نمازیں گھر ہی پر مختصر جماعت کے ساتھ ہوا کرتیں۔ امامت بڑے ردّ و انکار کے بعد مولانا کو اپنے لیے منظور کرنی پڑی تھی۔ نماز کے اوقات میں دیر سویر کے تو کچھ ایسے پابند نہ تھے۔ لیکن جب بھی پڑھتے، خوب جی لگا کر پڑھتے۔ بعض وقت دیکھنے والے بھی اس خشوع و خضوع سے متاثر ہو جاتے۔

سیاسی بحثیں قدرۃً سب سے زیادہ وقت لیتیں۔ وقت کا معرکۃ الآرا مسئلہ داخلۂ کونسل کا تھا۔ گاندھی جی یہ طے کر چکے تھے کہ اہل ملک کو سرکاری عدالتوں، اسکولوں کالجوں وغیرہ کی طرح کونسلوں سے بھی بالکل قطع تعلق کر لینا چاہیے (اور اسی لیے تحریک کا نام ہی ترک موالات تھا) علی برادران اس فیصلہ کے پرجوش داعی تھے۔ غالباً پانسو علماء کا متفقہ فتوی بھی اسی کی تائید میں تھا۔ لیکن دو تین سال کی زور از وری کے بعد جب کارکنوں کے قوی تھکنے لگے اور گاندھی جی ابھی جیل کے باہر ہی تھے، صرف علی برادران جیل میں تھے کہ خود اس مقاطعۂ کونسل کے خلاف ایک سخت ردعمل شروع ہوا۔ اور سوراج پارٹی کے نام سے ایک مستقل پارٹی حمایت داخلۂ کونسل کے حق میں بن گئی اچھے اچھوں کے پیر اس رو میں اکھڑ گئے، اور بڑے بڑے پختہ ترک موالاتی دھارے کے رخ پر بہنے لگے۔ علی گڈھ کے تصدق احمد خاں شروانی اور عبد المجید خواجہ، دونوں بڑے ہونہار اور کامیاب بیرسٹر علی برادران کے خاص مخلصین میں تھے۔ لیکن اب یہ بھی سوراج پارٹی کے ہم زبان تھے —— ایک دن یہیں بھوالی میں ایک لمبا سا تار محمد علی کے نام موصول ہوا کہ "آپ کے بیانات تصدق شروانی کے خلاف یہاں علی گڈھ کلب میں معاندین کے لیے بڑی مسرت کا باعث بن گئے۔ خدا کے لیے اس مفاہمت کا لحاظ رکھیے جو ابھی دہلی میں دونوں پارٹیوں کے درمیان ہو چکی ہے۔" محمد علی یہ تار پڑھ کر آگ ہو گئے۔ اور معاً جواب لکھا کہ

I have not compromised Islam

مطلب یہ تھا کہ مفاہمت احکام شریعت میں نہیں ہو سکتی، اور مقاطعۂ کونسل تو ایک حکم شرعی ہے۔ شام کو جب گفتگو اس موضوع پر (انگریزی میں) ہو رہی تھی تو مظفر صاحب

بولے "خواجہ کو یہ تار پڑھکر مزا آجائے گا"۔ محمد علی نے معاً جواب دیا "مزہ ابھی کیا آئے گا، مزہ تو شوکت کے چھوٹنے پر آئے گا"۔ مولانا شوکت علی ابھی تک نہین چھوٹے تھے، اور مولانا محمد علی کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ اس بارہ مین سخت ہین، ہرگز اپنے رفیقون مین سے کسی کی بغاوت پر صبر و تحمل سے کام نہ لین گے۔ اور ہر ایک کی پوری پوری خبر لین گے۔

باب (۱۹)

۱۹۲۳ء

سنہ (۳)

(ہم سفری۔ پہلے مسلمان اور پہلے ہندوستانی)

محمد علی کو بیسیوں کام پہاڑ سے اتر کر کرنے تھے۔ جلد ہی واپسی کی ٹھہری۔ بیمار اور زار و نزار بیٹی کے پاس اس کی ماں اور شوہر کو چھوڑ، خود لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے۔ ساتھ میں معظم صاحب اور بڑی لڑکی زہرہ اور ان کے شوہر زاہد علی خاں بھی ہیں۔ یہ سارا قافلہ رامپور جا رہا ہے۔ بریلی تک ساتھ رہے گا۔ میں خوش کہ مجھے تو لکھنؤ تک رفاقت کا موقع ملے گا۔ میں عام طور پر سفر انٹر کلاس میں کرتا تھا، اس روز معیت کی حرص میں ٹکٹ سکنڈ کلاس کا لیا، اور جب لے چکا تو مولانا کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "آپ معمولاً جس درجہ میں سفر کرتے ہوں، کیجئے۔ میری وجہ سے کوئی فرق نہ کیجئے۔ میں وہیں آجاؤں گا جہاں آپ ہوں گے۔"

بھوالی سے صبح ناشتہ کے بعد کاٹھ گودام اسٹیشن کے لیے روانہ ہوئے۔ لاری کرایہ پہ صبح سویرے ہی سے آگئی تھی۔ میں اگلی سیٹ پر محمد علی کے بازو میں بیٹھا تھا۔ راستہ بھر خوب باتیں رہیں۔ ایک بار میں نے کہا کہ "آپ کی تو مفصل لائف (سوانح عمری)

مرتب ہونی چاہیے۔ آپ اپنے حالات لکھ کر دیجئے، یا کسی کو بولتے جایئے۔" خوب ہنسے۔ اور بولے کہ "لکھوانے کے لیے وقت کہاں سے نکال سکتا ہوں، بس کوئی صاحب ساتھ لگے رہیں، جو کچھ دیکھیں یا سنیں، نوٹ کرتے جائیں۔" راستہ میں لوگ، یہانتک کہ پولیس کانسٹبل بھی اس سرکاری مجرم اور "باغی" کو عظمت و عقیدت کے ساتھ دیکھتے ہوئے ملے۔

دوپہر کو اسٹیشن پہنچے۔ زمانہ محمد علی کی مقبولیت و مرجعیت کے شباب کا تھا۔ مسلمان تو مسلمان، ہندو عوام بھی گرویدہ و فریفتہ۔ درشن یا زیارت کرنے والوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگ گیا۔ زیادہ تر عوام، جاہل اور ان پڑھ، محض دور سے نظر عقیدت واحترام سے دیکھتے رہنے والے قریب آنے کی جرأت نہ کرسکنے والے۔ اسباب ویٹنگ روم میں رکھ دیا گیا۔ ہم لوگ کبھی اندر، کبھی باہر، عین اس وقت معلوم ہوا کہ لاری والا جو کرایہ طلب کر رہا ہے، وہ بہت زائد ہے۔ لاری والے سے معاملہ طے زاہد صاحب نے کیا تھا۔ مولانا کو غصہ کہاں تو پہلے لاری والے پر آرہا تھا، کہاں اب اس کا رخ زاہد صاحب کی طرف پھر گیا۔ اور وہیں دن دوپہر کو بھرے مجمع کے سامنے مولانا نے اپنے اس جوان بھتیجے اور صاحب اولاد داماد کو اس بری طرح اور اس طرح گرج گرج کر ڈانٹنا شروع کیا ہے کہ یہ منظر بجائے خود ایک تماشہ بن گیا۔ اور جو آنکھیں شان جمالی کے شوق و اشتیاق میں کھلی ہوئی تھیں، ان کے سامنے یک بیک یہ نظارہ شان جلالی کا آگیا! ـــــ کوئی اسے عیب سمجھے یا ہنر، میں تو اسے محمد علی کا ہنر ہی سمجھتا ہوں۔ اگر ذرا سا بھی تصنع ہوتا، تو یقیناً اس مجمع عام کے سامنے یا تو اپنے غصہ کو پی جاتے، یا پھر تنہائی میں جو کچھ چاہتے کہہ سن ڈالتے۔ لیکن یہاں تو تصنع کا سایہ بھی نہیں پڑا تھا۔

زندگی کا ہر گوشہ آئینہ کی طرح واضح، شفاف اور روشن تھا۔ کبھی اس کی فکر ہی نہ کی، کہ معتقدین کیا خیال کریں گے۔ اور بہت سے عقیدتمند ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ جو کچھ دل میں آگئی، بے جھجھک کہہ اٹھے۔ جو کچھ سمجھ میں آگیا، بے دھڑک کر گزرے۔ مخلوق سے ڈرنا اور خلقت کے خیال کی پروا کرنا شاید کبھی جانا ہی نہیں۔

——— راستہ بھر کھاتے پیتے، اخبار خریدتے، ظہر، عصر، مغرب نمازیں پڑھتے پڑھاتے کچھ رات گئے بریلی اسٹیشن پہنچے۔ اور یہیں نماز عشا پڑھی گئی۔ چھوٹی لائن کا سفر ختم ہوا۔ اور یہاں سے بڑی لائن لکھنؤ کے لیے ملی۔ مرادآباد کے قاضی عبدالغفار جو ایک زمانہ میں ہمدرد کے سب ایڈیٹر رہ چکے تھے، اور اس وقت تک ان کا شمار مولانا کے مخلصین میں تھا، یہیں ملنے آگئے تھے، داخلۂ کونسل کے فتنہ میں وہ بھی مبتلا تھے۔ پلیٹ فارم پر مولانا انھیں خوب قائل کرتے رہے۔ مولانا کے سکریٹری حیات صاحب یہیں سے شریک سفر ہوئے۔ کھانے کے لیے پلیٹ فارم پر ایک وسیع دسترخوان بچھا۔ اور مولانا نے میرے ملازم کو یہی نہیں کہ بڑا اصرار کرکے کھانے میں شریک کیا، بلکہ بٹھایا بھی اپنے بالکل قریب ہی ——— میرے لیے یہ منظر نیا بھی تھا اور سبق آموز بھی۔ آقا اور غلام کی مساوات سے متعلق خلفائے راشدینؓ کے کارنامے جو کچھ بھی رہے ہوں، کتابوں میں خادم و مخدوم، خدمتگار و مالک کے باہمی حقوق کے متعلق جو کچھ بھی پڑھا ہو، ان مادّی آنکھوں سے، اس بیسویں صدی میں اس منظر کی توقع کس کو ہو سکتی تھی، اور وہ بھی کسی زاہد خلوت نشین کے ہاں نہیں، وقت کے نامور ترین سیاسی لیڈر کے ہاں!

لکھنؤ میں انکی دعوتوں، ضیافتوں، ایڈریسوں کا سلسلہ تھا کہ برابر پھیلتا ہی چلا جاتا تھا۔ سہ پہر کو مدرسہ نظامیہ فرنگی محل کی طرف سے "چائے" دی گئی اور ایڈریس پیش ہوا۔ جلسہ کی صدارت، مولانا عبد الباریؒ کی تحریک پر اس نا اہل کے حصہ میں آئی۔ محمد علی کے سامنے بولنے کی ہمت کیا ہوتی۔ اور کہتا بھی تو آخر کیا کہتا۔ صدارت اسی لیے بلا تکلف قبول کر لی، کہ ایک اور موقع محمد علی کے ساتھ انتساب کا ہاتھ آیا جا رہا تھا۔ تقریر صرف مولانا ہی کی ہوئی۔ صدر تو گونگا تھا ہی، حاضرین بھی سب کے سب گم سم بنے رہے۔ معاً بعد شہر کے دوسرے حصہ میں، فرنگی محل سے کئی میل دور، میونسپل بورڈ کی طرف سے ایڈریس پیش ہوا ——— محمد علی اب کانگریس کے صدر منتخب تھے، اور ہر طرف ہاتھوں ہاتھ لیے جا رہے تھے ——— شام کو بعد مغرب امین الدولہ پارک میں عظیم الشان پبلک جلسہ منعقد ہوا۔[1]

لکھنؤ کے لیڈر، اور لکھنؤ میونسپل بورڈ کے صدر، چودھری خلیق الزماں صدر جلسہ ہوئے۔ بی اماں مرحومہ بھی غالباً موجود تھیں۔ جلسہ میں ہندو بھی اچھی بڑی تعداد میں تھے۔ لیکن مسلمان تو اتنی بڑی تعداد میں عرصہ ہی کے بعد جمع ہوئے تھے۔ خلافت و ترک موالات کا جوش و خروش ۲۲ء میں ختم ہو چکا تھا، اور اب تو ۲۳ء قریب ختم تھا۔ سارے ملک میں شدھی اور سنگھٹن کی آگ بھڑک چکی تھی، اور مسلمان ان کے مقابلہ میں تبلیغ و تنظیم کی انجمنیں قائم کر چکے تھے۔ خاص شہر لکھنؤ اور گرد و نواح میں تلخ و ناگوار باہمی قضیے پیش آ چکے تھے۔ ایک شریر قسم کے ہندو نے ہینڈ بل تقسیم کرنے شروع کر دیے کہ یہ محمد علی وہی ہیں جنھوں نے جامع مسجد علی گڈھ میں ایک تازہ تقریر میں کہا ہے کہ میں ایک فاجر و فاسق مسلمان کو بھی گاندھی جی پر ترجیح دیتا ہوں۔ ایسا شخص بھلا کانگریس

[1] اب لکھنؤ میں بڑے اور اہم پبلک جلسے بجائے رفاہ عام وغیرہ کے امین الدولہ پارک میں ہونے لگے تھے۔

کا صدر کیسے مانا جا سکتا ہے؟ ——— اشتہار خاصہ اشتعال انگیز تھا عین جلسہ میں کسی نے صدر جلسہ کو مخاطب کر کے یہی سوال بھی کر دیا۔ مولانا کی پر زور تقریر جاری تھی۔ پنڈت موتی لال نہرو نے کوئی بیان داخلہ کونسل کی حمایت و وکالت میں دیا تھا۔ اسی بیان کی دھجیاں مولانا ایک ایک کر کے اڑا رہے تھے کہ اس شخص نے یہ سوال کر دیا

احباب و مخلصین کچھ پریشان سے ہو گئے۔ بہتوں نے کہا کہ سوال بالکل بے محل ہے۔ خود صدر جلسہ نے سائل کو خاموش ہو جانے اور بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ لیکن ہزاروں کے اس مجمع میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو سوال سے مطلق نہ گھبرایا، وہ دل میں پورا اطمینان رکھے ہوئے تھا، اور وہ شخص خود محمد علی تھا! ——— صدر نے سائل سے پکار کر کہا "آپ بیٹھ جائیے۔ میں سوال کی اجازت نہیں دیتا"۔ معاً محمد علی چمک کر بولے "مگر میں اجازت دیتا ہوں، آپ اپنے سوال کا جواب لیجیے"، اور اس کے بعد یوں گویا ہوئے:۔

"علی گڑھ میں میں نے جو کچھ کہا اسے دہرانے کے لیے یہاں بھی تیار ہوں اور ہر جگہ۔ گاندھی جی اس وقت آزادیٔ ملک کے لیے جو خدمات انجام دے رہے ہیں ان کے لحاظ سے وہ اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ اور جہاں تک ان کی بیش بہا خدماتِ وطن کا تعلق ہے میں مہاتما جی کو اپنے ہی سے افضل نہیں، بلکہ اپنی والدہ ماجدہ سے بھی زیادہ قابل تعظیم اور اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی سے بھی بڑھ کر قابلِ احترام سمجھتا ہوں۔ لیکن ایک دوسری حیثیت اعتقاد و ایمان کی ہے۔ میں عقیدۃً مسلمان ہوں اور اس کے معنی یہ ہیں کہ عقیدۂ اسلام کو اور تمام عقائد سے کہیں بہتر و اعلیٰ تر سمجھتا ہوں۔

اور اس لحاظ سے، یعنی جہان تک عقائد ایمانی کا تعلق ہے، مین اکیلے گاندھی جی ہی سے نہین تمام ہندوؤن، تمام عیسائیون، تمام مسلمون کے مجموعہ سے ہر ادنیٰ مسلمان، ہر بدعمل سے بدعمل کلمہ گو کو بہتر سمجھتا ہون۔ اسلام کی افضلیت میرا جزو ایمان ہے۔ اگر آج مین خدانخواستہ اس کا قائل نہ رہون تو پھر مسلمان رہنے کی بھی کوئی وجہ نہین رہتی۔ میری بات کوئی انوکھی بات نہین۔ جس طرح مین اپنے عقیدہ کی افضلیت کا قائل ہون، اسی طرح ہر مذہب والا اپنے عقیدہ کو افضل تسلیم کرتا ہے۔ کیا پنڈت مدن موہن مالوی جی اپنے عقیدہ کو سب سے افضل خیال نہین کرتے؟"

یہ الفاظ آج کاغذ پر چھپے ہوئے، وہ بھی اتنی مدت دراز کے بعد، ممکن ہے کہ کچھ زیادہ موثر نہ معلوم ہون، لیکن جس وقت ہزارون کے مجمع مین ایک زندہ شخصیت کی زبان سے، پورے جوش وخروش کے ساتھ، آواز کے مناسب حال اتار چڑھاؤ کے ساتھ ادا ہوئے ہین، تو معلوم ہوتا تھا، کہ بجلی کی ایک رو سی دوڑ گئی ہے۔ دشمن سناٹے مین آگئے۔ دوستون کے چہرے چمک اٹھے۔ خوب تالیان بجین، خوب تائید ومسرت کے نعرے بلند ہوئے ——— یہ جرأت وہمت اللہ نے بس محمد علی ہی کو دی تھی کہ عین اجلاس کانگرس کے قرب مین، اس کا صدر منتخب ہو چکنے پر ہزارہا کے مجمع عام مین، ہندوؤن، پارسیون، عیسائیون کے سامنے اپنے اسلام اور اپنی اسلام پرستی کا اعلان اس صفائی، اس دلیری کے ساتھ کر دیا۔ ورنہ یہان تو ایسے ایسے مسلمان بھی، اور عوام نہین اچھے اچھے اونچے اور چوٹی کے معززین، بلکہ طبقۂ علماء مین شامل دیکھنے مین آئے ہین، جنھون نے کانگرس پارٹی مین، کانگرس کے جلسون مین، اور کانگرسی سرکار مین اپنی بات رکھنے کے لیے اپنی اسلامیت کو ذلیل وخوار کرنے مین کوئی کسر اٹھا نہین رکھی!

باب (۲۰)

سنہ ۱۹۲۴ء (۱)

(خطبۂ صدارت ۔ جلاوطنی)

ابکی محمد علی کا قیام لکھنؤ مین کئی دن رہا۔ آئے بھی تو بہت عرصہ کے بعد تھے۔ اپنا مشغلہ اُس وقت سماع کا زوروں پر تھا۔ یہ زندگی کا وہ دور ہے کہ بحمد اللہ از سر نو مسلمان ہوئے تو مجھے مدت ہو چکی ہے، لیکن غلبہ دل و دماغ پر ابھی تک اہل حال صوفیہ و مشائخ کا ہے۔ ان ہی کی صحبتین اور مجلسین، اور ان ہی کی کتابیں، ملفوظات، وغیرہا۔ آج شرکت اس عرس میں ہو رہی ہے، کل حاضری اُس درگاہ پر ہو رہی ہے۔ محمد علی بھی ان مشغلوں سے محتاط نہ تھے، بلکہ اچھی قوالی کے تو عاشق تھے۔ ایک روز صبح میں نے اپنی قیامگاہ لکھنؤ (خاتون منزل، احاطہ فقیر محمد خان) پر ناشتہ کی دعوت دی، اور اچھے قوالوں کی ایک چوکی بھی بلا دی ــــــــ مولانا جب تشریف لائے ہیں، اور کمرہ مین داخل ہونے کو قدم رکھ رہے ہین تعمّا میرے اس ملازم پر نظر پڑی جسے کبھی بریلی اسٹیشن پر اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلا چکے تھے، پہچان کر بھرے مجمع مین اس سے بغلگیر ہو گیے۔ وہ بیچارہ باغ باغ اور دوسرے لوگ دنگ و حیران۔

مولانا حاضرین مین سے بڑے چھوٹے ایک ایک سے ملے۔ جن کو پہلے سے جانتے پہچانتے تھے اُن سے بھی، اور جو ان کے لیے اجنبی محض تھے، ان سے بھی۔ سب سے یکسان اخلاق اور تپاک۔ مسلمانوں کو محمد علی (اور شوکت علی) ہی کی زندگی دیکھ کر یہ پہلی بار معلوم ہوا کہ کوئی لیڈر صاحب (اور پھر چوٹی کے لیڈر) عوام سے اتنا بے تکلف ہو سکتے، اتنا خلا ملا رکھ سکتے ہین۔ ورنہ ابتک کسی لیڈر کے ہاں رسائی صرف خواص ہی کی ہو سکتی تھی۔ قوم کا کام تو صرف ان کی گاڑیان کھینچنا، اُن پر پھول برسانا، ان کے لیے جلوس نکالنا تھا۔

خیر قوالی کی محفل کچھ دیر خوب گرم رہی۔ اور محمد علی خوب روتے رلاتے رہے، خاص کر نعتیہ مضامین پر۔

ایک لطیفہ یہ ہوا کہ عین سماع شروع ہونے کے وقت میری بڑی بچی جو اُس وقت ۴ سال کی تھی، محمد علی کے قریب سلام کر کے آ بیٹھی۔ ان کو تو ہر بچہ بچی سے عشق ٹھہرا، چہ جائیکہ اپنے ایک نیازمند کی بچی سے۔ جھٹ اسے گود میں بٹھا، اُسے کھلانا شروع کر دیا، لگے اس کی دوپٹیا اتار اس کے سر پر پگڑی باندھنے لگے۔ مین سخت جز بز کہ عین سماع کے وقت یہ تفریح اور کھیل کیا معنی۔ یہ تو آداب محفل کے بالکل ہی خلاف ہے۔ اس وقت تو ساری توجہ والتفات ادب و احترام کے ساتھ کلام و نغمہ کی طرف دینی چاہیے۔ میں تو اسی ادھیڑبن اور انقباض خاطر میں، اُدھر دیکھتا کیا ہون کہ اُس وقت ساتھ ہی محمد علی سماع کی طرف بھی پوری طرح متوجہ و ملتفت، ہمہ تن متاثر بلکہ آنکھوں سے آنسو جاری! درد و گداز کے لیے ہمہ وقت اتنی حاضر طبیعت کمتر ہی دیکھنے میں آئی ہے۔

دار العلوم ندوہ کا کتبخانہ اُس وقت تک خانوادہ منزل کے گویا پڑوس ہی میں تھا

میرے عزیز جوانمرگ دوست مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی مرحوم (استاد دار العلوم) ایسے موقعون کی تاک میں رہتے تھے۔ طلبۂ ندوہ کی طرف سے ایک مختصر اور ہلکی دعوت چائے کی انھون نے بھی کتبخانہ کی عمارت مین مرتب کر دی۔ دیر بہت ہو چکی تھی، دوپہر ہونے کو تھی۔ اور چائے کا اب کوئی وقت رہا نہ تھا۔ پھر بھی میزبانون کے اصرار سے مولانا کو دعوت قبول کرنی ہی پڑی۔ ادھر چائے نوشی شروع ہوئی، ادھر نگرامی مرحوم نے ایک مختصر تقریر اس مضمون کی کر دی کہ سیاسی تقریرین تو اور بہت سے موقعوں پر ہم سن لین گے، اس وقت تو ہم طلبۂ ندوہ یہ چاہتے ہیں کہ "تنہائی کی راتون" میں "خلوت کی ملاقاتیں" جو آپ کے نصیب میں آئی ہیں، ان سے ہمین بھی مستفید فرمایا جائے۔ نگرامی مرحوم بڑے گہرے دیندار اور صالح نوجوان تھے۔ مولانا اُن کی تقریر سے متاثر بھی ہوئے اور محظوظ بھی۔ لیکن اس فرمایش کے جواب مین فرمایا "میرے عزیز بھائی، تم بھی ایک شاعر کی بات کا اعتبار کر بیٹھے۔ شاعر تو اپنی خیالی دنیا مین کیا کچھ کہہ جاتا ہے۔ اس سے ان چیزون کا ثبوت عملی دنیا میں طلب کرنا تو بڑی زیادتی ہے" —— اب اللہ جانے شاعری اس نعتیہ غزل میں زیادہ تھی یا اس نثری جواب میں!

خیر، یہ باتیں تو لطائف کے تحت میں بھی رکھی جا سکتی ہین، باقی اصل حقیقت مجھ سے راز کے طور پر (اور یہ راز شاید آج پہلی ہی بار ظاہر ہو رہا ہے) میرے اصرار پر ایک بار وہیں بھوالی کے قیام میں یہ ارشاد ہوئی تھی کہ خواب مین زیارتیں تو نصیب ہی نہ ہوئین، البتہ ایک بار بیجاپور جیل مین دوپہر کے وقت نیم بیداری کی حالت مین ایک ہلکا اور دھندلا سا پرتو جمالِ محمدیؐ آناً فاناً نظر آیا تھا —— اللہ اکبر! جس جمال کی زیارت خواب مین بھی، اچھے اچھے خوش نصیب اپنے لیے خوش نصیبی سمجھیں،

اس کے دیدار سے نیم بیداری ہی میں مشرف ہو جانا کوئی معمولی درجہ کی خوش بختی اور نصیبہ وری ہے!

قیدی جب جیل سے چھوٹتے ہیں، تو سیدھے اپنے گھر کی راہ لیتے ہیں۔ اور غریب سا غریب قیدی بھی کوئی نہ کوئی اپنی جھونپڑی کہیں رکھتا ہی ہے۔ محمد علی غریب کا گھر اب تھا کہاں ؟ رام پور وطن تھا، وہاں انکی پختہ حویلیاں تھیں، وہاں ان کا بچپن گزرا تھا، لڑکپن گذرا تھا، جوانی کا ایک حصہ گذرا تھا۔ گھر کے صحن میں یہ دونوں بھائی کھیلے کودے تھے۔ گھر کے مکتب میں یہ پڑھنے بیٹھے تھے۔ وہیں شادی بیاہ ہوا تھا۔ دعوتیں، ضیافتیں، جلسے سب ان ہی گھروں میں ہوئے تھے۔ رام پور کے چپہ چپہ سے، گلی گلی سے محمد علی کا دل اٹکا ہوا تھا۔ اب وہاں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ "اسلامی ریاست" کے فرماں روا ہز ہائینس نواب حامد علی خان بہادر والی رام پور کا فرمان قضا توام یہی تھا! ——— محمد علی ہی کے درد انگیز لفظوں میں ؎

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے ——— ہم نہ تھے ان کے آستانے کے

گھر والوں پر کچھ بھی گزر جائے، بیوی، بچیاں، ماں، بہن، کوئی بھی بستر مرض پر کیا معنی بستر مرگ پر بھی ہو، مجال نہ تھی کہ محمد علی اور شوکت علی رام پور اسٹیشن سے آگے شہر کی طرف قدم اٹھا سکیں۔ بیمار ہی کو جس طرح بن پڑتا لاد پھاند کر شہر سے اسٹیشن کے ویٹنگ روم تک لے آتے! ——— اللہ کے گھر کی خدمت کا عزم و حوصلہ رکھنے والے کو سزا اس دنیا میں یہ خوب ملی کہ خود اسی کو بے گھر بے در کر دیا گیا!

بیمار مدقوق لڑکی جب اسی نومبر ہی کے مہینہ میں پہاڑ سے حالت یاس میں واپس

لائی گئی، تو یہی سوال اپنی مہیب صورت کے ساتھ منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے، کھڑا تھا کہ اس دکھیارے قافلہ کو لے کر آخر کہاں جایا جائے ـــــ ناظرین آگے بڑھنے سے قبل، ذرا اس صورت حال کا تصور، وضاحت کے ساتھ اپنے ذہن کے سامنے لائیں کہ خدا نخواستہ اگر اس کا کوئی واقعہ ہم کو پیش آجائے تو کیا گزر رہی ہے! اللہ کی شان کہ، کروڑ مسلمانون کا مقبول ترین اور محبوب ترین لیڈر، اور خود ملک ہندوستان کا بھی نامور لیڈر۔ اور کانگرس کا صدر، اس کے اوپر وطن کی سرزمین یوں تنگ۔

خیر جوں توں علی گڑھ پہنچے۔ جامعہ ملیہ ابھی تک علی گڑھ ہی میں تھی، دہلی منتقل نہیں ہوئی تھی۔ اسی کے احاطہ میں ایک بنگلہ لے کر رہنے لگے۔ اس خانہ بدوشی میں یہی ان کا وطن تھا۔ معاش کا سہارا ابھی کہیں سے بھی نہ تھا۔ نورِ نظر کی ہلاکت علالت سب پر مستزاد۔ بیچارہ کو قومی وملی مصروفیتون سے مہلت اتنی بھی نہ ملتی کہ تیمارداری جی بھر کر سکیں۔ کہا کرتے تھے کہ قومی وملی مصائب نے میرے ذاتی مصائب کو اس طرح نگل لیا ہے جیسے حضرت موسیٰؑ کا عصا ساحروں کے سانپون کو نگل گیا تھا!

کانگرس کی صدارت سر پر آگئی تھی۔ اور انھیں سر اٹھانے کی مہلت نہ تھی۔ گاندھی جی کی اسیری کے باعث نگاہین سب کی ان ہی کی طرف لگی ہوئی، دوسرے صدرنشین حضرات کا طریقہ یہ رہا تھا کہ خطبۂ صدارت ہفتون نہیں، مہینون پیشتر سے لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ فرصت واطمینان کے ساتھ لکھتے۔ مسودہ مین بار بار کاٹ چھانٹ کرتے۔ دوستون رفیقون سے صلاح ومشورہ کرتے جاتے۔ یہان ان میں سے کوئی شے نصیب نہ تھی۔ کانگرس کا اجلاس جنوبی ہند کے شہر کوکناڈا مین۔ یہ

خود شمالی ہند کے شہر علی گڈھ مین۔ یہان سے وہان تک ریل کا راستہ بھی اس زمانہ مین چار دن کا! اڈیرلیس کا مسودہ وسط دسمبر تک قطعاً تیار ہو جانا چاہیے تھا کئی دن تو اس طویل و عریض ایڈرس کے چھپنے مین لگ جاتے۔ پھر اس انگریزی تقریر صدارت کا ترجمہ بھی اردو، ہندی، بنگلہ، کئی کئی زبانون مین ہونا تھا۔ دسمبر کے پہلے ہفتہ مین تو یہ خدا خدا کر کے اڈیرلیس لکھنے بیٹھے۔ ۶ر دسمبر کو صبح مجھے یہ ۵ر دسمبر کا حکم نامہ تار پر ملا کہ

"ایک ہفتہ کے لیے علی گڈھ فوراً آجایئے خطبۂ صدارت کے اردو ترجمہ کے کام کیلئے آپ کی ضرورت ہے"۔

میں باوجود مولانا کی اس عقیدت و احترام کے بہرحال اپنا بھی ایک پروگرام رکھتا تھا، فوراً نقل و حرکت ممکن نہ ہوئی۔ عذر و معذرت لکھ بھیجی، تار سے بھی اور خط سے بھی۔

۱۱ر دسمبر کو دوسرا تار موصول ہوا:۔

"کلام جوہر کا بھی جدید ایڈیشن زیر طبع ہے۔ اس کا مقدمہ ضروری ہے۔ مہربانی کر کے فوراً آیئے۔ کوئی حیلہ مسموع نہ ہوگا۔ میر محفوظ علی آگئے ہین۔ وہ بھی آپکو بلا رہے ہین۔ محمد علی"۔

میر محفوظ علی بی۔ اے (ملائے بدایونی) کا نام پہلے کئی بار آچکا ہے۔ مولانا کے خصوصی مخلصین مین تھے، ہمدرد کے دور اول کے منیجر رہ چکے تھے۔ کامریڈ کے اجرا مین ان کے مشورہ کو بھی بڑا دخل تھا۔ اردو کے ادیب، ظریف، انشا پرداز۔

———— . ————

باب (۲۱)

۱۹۲۳-۲۴ء

(میر محفوظ علی - خاتمۂ خلافت)

۲۳ر دسمبر کو شب میں لکھنؤ سے براہ بریلی علی گڈھ کے لیے روانہ ہوا۔ یہ گاڑی اتنی لیٹ گئی کہ بریلی جنکشن سے علی گڈھ کی گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ بصد خرابی ۲۴ر کو عشاء کے وقت علی گڈھ پہنچا۔ نورالرحمٰن جامعی اسٹیشن پر پیشوائی کو آگئے تھے۔ میر محفوظ علی صاحب کے لیے ایک وسیع خیمہ الگ نصب تھا۔ اسی میں جگہ ملی۔ یہ ملائے بدایونی بھی بڑے چھپے رستم نکلے۔ دیکھنے میں ٹھیٹھ دنیادار، علی گڈھ کے گریجویٹ۔ ادھر پچھلی رات ہوئی کہ آپ چوروں کی طرح اٹھے، دبے پاؤں چلے، اور وسط دسمبر کی شدید سردی میں باہر جاکر وضو کرکے آئے۔ تہجد پڑھ رہے ہیں، اپنی والی بڑی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ۔ چوری پھر بھی کھل ہی گئی۔ میری نیند کھٹکے کی ہے، آنکھ کھل جاتی، اور لحاف کے اندر سے لیٹے لیٹے اس جوان ہمت سفید ریش کی اخفائے عبادت کے تماشے دیکھا کرتا ——— خاطرداریوں کی محمد علی کے ہاں کیا کمی۔ زبردستی کی مہمانداریاں جب بن بلائے ہوؤں کی ہوا کرتیں، تو میں تو ناخواندہ نہیں، خواندہ تھا۔ چلئے اور ناشتے

اور لکھانے کا ایک چکر تھا کہ صبح سے شروع ہو کر بڑی رات گئے تک جاری رہتا۔

خطبۂ صدارت معلوم ہوا کہ ابھی تک صرف نصف ہو پایا ہے!

صورت حال اتنے فقرہ سے سمجھ میں نہ آئی ہو گی، سمجھ لیجئے۔ مولانا کو ۲۶ر کو کوکناڈا پہنچنا لازمی، اور اس کے لیے علی گڈھ سے ۲۰ر کو شب میں براہ دہلی روانہ ہو جانا لازمی۔ اور یہاں ۱۵ر کی صبح تک تصحیح و نظر ثانی ہونا الگ رہا، مسودہ کی تکمیل تک ابھی ۵۰ فیصدی باقی! طباعت اور پھر ترجموں کے مرحلوں کا ذکر ہی نہیں! ——— کبھی کوئی خطبۂ صدارت کانگرس کی ساری تاریخ میں اتنی پریشان خاطری اور ابتری کے عالم میں کیوں لکھا گیا ہو گا۔ "یک سر و ہزار سودا" کی مثل پوری طرح صادق آ رہی تھی۔ ابھی اندر سے لب مرگ محبوب و عزیز بیٹی کے بستر کے پاس سے اٹھ کر آئے ہیں آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں کہ ایڈرس لکھانا شروع کر دیا۔ اور جہاں سے چھوڑ کر گئے تھے، وہیں سے آگے بولنے لگے۔ چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ ایک مہمان صاحب وارد ہو گئے۔ آپ پنجاب کے صوبہ خلافت کمیٹی کے سکریٹری ہیں۔ ایڈرس روک اب ان سے بحث و مباحثہ اہل پنجاب کی خطاکاریوں اور قصورواریوں پر شروع ہو گیا۔ وہ اٹھے ہی تھے کہ کسی شامت کے مارے نے اقبال کی شاعری کا ذکر چھیڑ دیا، اور اب یہی مستقل موضوع گفتگو بن گیا۔ اتنے میں اسی محبوب بیٹی کے دوا پلانے کا پھر وقت آ گیا!

نشیب و فراز سے زندگی خالی کس کی ہو سکتی ہے۔ کچھ روز قبل کا ذکر ہے کہ مولانا کے مرشد مولانا فرنگی محلی کی زندگی میں ایک واقعہ ایسا پیش آ گیا، جس کا تعلق تمامتر ان کی خانگی زندگی سے تھا اور ان کی سیاسی و قومی زندگی سے متعلق نہ تھا، پھر اس کا

کوئی پہلو خلافِ شریعت بھی نہ تھا۔ البتہ رسم ورواج سے ہٹا ہوا تھا۔ مخالفین کو ایک موضوع ہاتھ آگیا۔ لے اڑے۔ اور مولانا ہی کے ایک عزیز قریب کی (جو فرنگی محلی : تھے) روایتوں سے میں خود بھی متاثر ہو گیا تھا۔ بعض منچلوں نے تو کمال ہی کیا۔ لمبے لمبے گمنام خط مولانا فرنگی محلی سے بدظن کرنے کے لیے محمد علی ہی کو نہیں، پنڈت موتی لال نہرو (اور خدا جانے اور کن کن سیاسی لیڈروں) کو لکھ بھیجے۔ پنڈت جی نے ذکر محمد علی سے کیا کہ آپ کے مرشد کی یہ کیا داستانیں لکھ لکھ کر آرہی ہیں۔ مولانا اس پر ان کے سامنے بھی بہت ناخوش ہوئے۔ اور خود میرے سامنے بھی گمنام خطوط نویس کی خوب خبر لیا کیے یاد نہیں پڑتا کہ یہ موضوع چھڑا کیسے۔ میں نے شروع کیا، یا خود مولانا نے۔ بہرحال مولانا کی ناخوشی خوب یاد ہے۔ اور یہ بھی خوب یاد ہے کہ میں نے بھی دبی زبان ان الزامات کی تائید کرنا چاہی تھی، تو خود مجھ پر بھی ڈانٹ پڑی تھی۔ ایسے چلے ہوئے طریقوں سے جو قومی کارکنوں کو خوامخواہ بدنام کرنے اور ان پر گندگی اچھالنے کے لیے استعمال ہوتے رہتے ہیں، محمد علی سخت بیزار رہتے تھے۔

بمبئی کی طرف کے ایک زود نویس نوجوان، قوم کے پارسی، مسٹر ماسٹر انگریزی میں ایم۔ اے۔ اس وقت مولانا کے گویا سکریٹری اور کاتب تھے۔ اصل میں جامعہ پریس کے منیجر تھے۔ اور بعد کو کامریڈ پریس کے بھی منیجر کچھ روز تک رہے۔ مولانا زبانی بولتے جاتے، یہ لکھتے جاتے۔ معاً بعد مسودہ ٹائپ ہو جاتا اور ہر ٹائپ شدہ صفحہ کی چار چار کاپیاں ہو کر مختلف مترجموں کو ترجمہ کے لیے دیدی جاتیں۔ دو ایک دن بعد یہ تجربہ بھی بہت زیادہ وقت لینے والا ثابت ہوا۔ اور مسودہ پہلے لکھ کر ٹائپ کرانے میں بڑی طوالت نکلی۔

اب تسوید کو درمیان سے ہٹا دیا گیا۔ اسٹینو گرافر اپنی مشین لیکر مولانا کے ہاں بیٹھ گئے! اور اب الفاظ ادھر مولانا کی زبان سے ادا ہوتے، ادھر براہ راست مشین پر ٹائپ ہوتے جاتے۔ اور ٹائپ شدہ ورق فوراً پریس میں چھپنے کو چلے جاتے۔ پھر چھپے ہوئے اڈریس کی ضخامت انگریزی میں، ۲۰ × ۲۲ کی تقطیع پر ۴۳ صفحہ کی! ـــــــ کتاب کی کتاب اتنی ضخیم، بہ طور خطبۂ صدارت کبھی کیوں تیار ہوئی ہوگی! اور وہ بھی اس بھاگ دوڑ کے عالم میں! ـــــــ محمد علی غریب اپنے لیے تقدیر میں کچھ یہی لکھوا کر لائے تھے۔

ہر ہر کام اسی مضطربانہ عجلت کے ساتھ کرنا پڑتا۔ سکون و اطمینان کے ساتھ پہلے مسودہ کریں، پھر اسے کاٹیں چھانٹیں، اس کی نظر ثانی و اصلاح کریں، احباب خصوصی سے اس کے متعلق مشورہ کریں، یہ باتیں شاید ان کی کسی ایک تحریر کے بھی حصہ میں کبھی نہ آئیں! محمد علی آخر عاشق تھے، عشق کی شوریدگی زندگی کے ایک ایک شعبہ میں نمایاں!

ادھر مشغولی کا یہ عالم، اور وقت کا ایک ایک منٹ قیمتی، ادھر یہ کیسے ممکن کہ مہمانوں کی خاطر داریوں میں کوئی ذرا سا فرق پڑ جائے۔ اور خیر جو واقعی مہمان ہوں ان تک ہی یہ حوصلۂ میزبانی محدود رہتا، جب بھی غنیمت تھا۔ یہاں تو یہ نظارہ بھی ان آنکھوں نے دیکھا کہ جامعہ کے استاد جو ماشاء اللہ اپنے اپنے گھر رکھتے ہیں، اپنی مستقل تنخواہیں رکھتے ہیں، وہ کہیں نماز میں یا ادھر ادھر دکھائی دیے اور اب مولانا انھیں پکار پکار کر بلا رہے ہیں اور زبردستی اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھا رہے ہیں! ـــــــ خدا جانے دوسروں کو کھلانے پلانے کے لیے اتنی وسعت دل میں کہاں سے آ گئی تھی۔ مہمان نواز اور سیر چشم مولانا شوکت علی بھی تھے۔ لیکن اپنے حدود کے اندر، یہ بے تکان مہمان نوازی محمد علی ہی کا حصہ تھی!

ـــــــ • ـــــــ

پریس کی مشینیں اب زور و شور سے حرکت میں آئیں۔ اور چھپائی کا کام دن ہی دن نہیں، آدھی آدھی رات تک ہوتا رہا، ایڈریس کی لکھائی اور ٹائپ کرائی تو کہیں جا کر ۲۰ کی شام کو ختم ہو پائی۔ اور مولانا اسی شب کو غالباً ایک بجے روانہ ہو گئے۔ ان کے لئے آخری ٹرین یہی تھی۔ ایڈریس چھپ کر اس وقت تک بھی نہ تیار ہو پایا۔ دوسرے دن ایک خاص قاصد کے ہاتھ اس کی کاپیاں روانہ ہوئیں۔ کانگریس کا عام اجلاس یہ غنیمت ہوا کہ ۲۴ کو نہیں، ۲۶ سے شروع ہونے والا تھا۔ اس لیے اتنا موقع بھی مل گیا یہ سرگزشت تو اصل ایڈریس کی ہوئی۔ باقی ترجمہ، ظاہر ہے کہ ہم لوگ اس برق رفتاری سے کیونکر کر سکتے تھے۔ ترجمہ یوں بھی آسان نہ تھا۔ ایک ایک فقرہ میں خدا معلوم کیسے کنائے، کتنی تلمیحیں ہوتی تھیں۔ اور پھر جا بجا مختلف علوم و فنون کی اصطلاحیں یہ عیب ہو یا ہنر۔ بہر حال محمد علی کی تحریروں کا ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا تھا بڑا دشوار کام۔ اور پھر وقت کی تنگی نے تو اس وقت سب کے ہاتھ پر پھلا رکھے اور آئے حواس گم کر رکھے تھے۔ یہ ٹھہری کہ جامعہ ہی کے چند ہونہار اور سینیر طلبہ کے درمیان ایڈریس کے مختلف اجزاء تقسیم کر دیے گئے۔ نظر ثانی اور اصلاح کا کام اس خاکسار اور میر محفوظ علی کے سر رہا۔ اصل ترجمہ ان ہی بچاروں نے کیا۔ ہم لوگ نظر ثانی تک رہے اور وہ بھی جی کھول کر نہ کر سکے ——— محمد علی نے بلایا ہم دونوں کو کس چاؤ کے ساتھ تھا۔ ہم لوگ ادائے خدمت میں کس قدر قاصر رہے، اس کا رنج دل کو آج تک ہے۔

لڑکی بیچاری کی حالت اس وقت بھلا اس قابل تھی کہ نازبردار اور عاشق زار باپ اسے چھوڑ اتنے دور دراز سفر پر روانہ ہو جائے۔ لیکن قومی فریضہ کی ادائی کے سامنے بہر حال

دل کو مارنا پڑا۔ اور محمد علی کی زندگی تو اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

سنہ ۲۴ء میں جس طرح محمد علی صدر کانگرس ہو کر سارے ملک کے سردار منتخب ہوئے، اسی طرح یہ سنہ ان کی زندگی میں عام الحزن یا سال غم کی حیثیت بھی رکھتا ہے بڑے سے بڑے صدمہ شاید اسی سال کے لیے اٹھ رہے تھے۔ جوان مدقوق بیٹی نے مارچ میں داغ مفارقت دیا۔ اور رونے والے باپ کے آنسو ابھی رواں ہی تھے بلکہ خبر آئی کہ مصطفےٰ کمال نے ادارۂ خلافت اسلامیہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا! محمد علی کے دل و دماغ پر گویا بجلی گر پڑی۔ جس خلافت کے تحفظ کی خاطر برسوں سے اپنے جان و مال کی بازی لگائے ہوئے تھے جس کی خاطر جیل کی سختیاں اٹھائیں۔ بے زر، بے گھر، بے در ہو کر رہے۔ تارک الوطن ہونا پڑا، جمع پونجی لٹا کر کنگال ہو گئے، دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا، اس کا انجام، دشمنوں اور یورپی قوموں کے ہاتھوں نہیں، ایک ترک اور اپنے کو مسلمان کہلانے والے کی ایک جنبش قلم سے دیکھ، محمد علی پر جو کچھ گزری، اسے بس عالم الغیب ہی جان سکتا ہے۔ دشمنوں، خصوصاً انگریزی اخباروں کے طعنہ اور زہر خند اصل صدمہ پر مستزاد! حیرت اسی پر ہے کہ دیوانگی کی نوبت کیوں نہ آگئی۔ اپریل میں محبوب و عزیز بھائی، مولانا شوکت علی دہلی میں علیل اور سخت علیل ہوئے۔ مہینوں صاحب فراش رہے۔ درمیان میں مایوسی ہو ہو گئی۔ گاندھی جی بھی اس اثنا میں جیل سے رہا ہو چکے تھے۔ (محمد علی ان کی رہائی کے لیے پورا زور لگا چکے تھے) اور صدر کانگرس کا ان سے بمبئی جا کر فوراً ملنا، اور تبادلۂ خیالات کرنا ازبس ضروری تھا۔ ادھر محمد علی بیچارہ فکروں میں مبتلا، اتنے ذاتی اور قومی حادثوں کے شکار۔ خلافت کمیٹیوں کا کام بدستور

جاری، اور کانگریس کے بھی سارے ملک کے کاروبار کی نگرانی محمد علی ہی کے ذمہ!
وسط اپریل کا، دہلی سے لکھا ہوا ایک خط محفوظ رہ گیا۔ اس سے ان کی اس وقت کی ذہنی اور دماغی الجھنوں پر کسی قلیل حد تک روشنی پڑے گی۔ آگے وہی ملاحظہ ہو۔

باب (۲۲)

سنہ ۱۹۲۴ء (۱)

سالِ غم

دہلی ۱۴ اپریل سنہ ۲۴ء
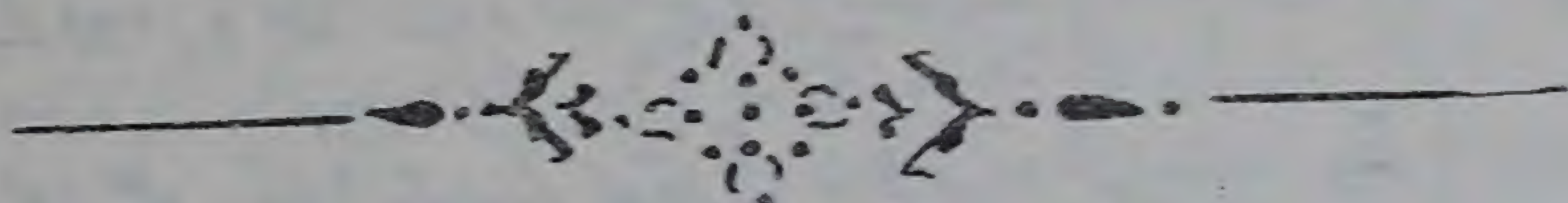
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَا غَالِبَ اِلَّا اللہ

برادرم - السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ - تعزیت نامہ ۶ر شعبان کا اسی زمانے مین ملا تھا، یا یوں کہیے کہ جب ایک ہفتہ بعد کلکتہ کی خلافت کانفرنس سے واپس ہوا تھا۔ آج ۱۰ر رمضان کو شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تاخیر کا سبب کیا لکھوں۔ قومی مصیبتوں نے ذاتی مصائب کو اس طرح نگل لیا، جس طرح حضرت موسیٰؑ کے عصا نے ساحروں کے سانپوں کو نگل لیا تھا۔ بقول غالب :-

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

۱۱ر مارچ کو آمنہ رخصت ہوگئین۔ ۱۵ر ہی کو مسلم لیگ کے قضیہ نے کھینچ بلایا۔ ۱۶ر کو ڈاکٹر شوکت صاحب والدہ کو بوجھ باتھ کرلے آئے۔ والدہ تو آمنہ کی رخصتی کے وقت بے ہوش تھین۔ شوکت صاحب کو حرارت تھی۔ اور اسی شب سے صاحب فراش ہوئے تو آج تک صاحب فراش ہین۔ مسلم لیگ کے احیاء کا بیڑا اٹھانے والے حضرات

کی ہمدردی کی یہ حالت تھی کہ میں نے چاہا کہ اس کی کونسل کا وہ جلسہ جو ایک روز ماقبل کورم پورا نہ ہونے کے باعث نہ ہو سکا تھا۔ سہ پہر کو منعقد کر دیا جائے نہ کہ دوپہر کو جب کہ حکیم صاحب[1] ڈاکٹر صاحب[2] اور ہم لوگ ان کو لینے اسٹیشن جا رہے تھے اور ڈاکٹر عبدالرحمن ان کو ہمراہ لا رہے تھے۔ مگر یہ درخواست نامنظور ہوئی۔ مجبور ہو کر سب نے یہی فیصلہ کیا کہ شوکت صاحب کو ڈاکٹر عبدالرحمن ہی پر چھوڑا جائے اور احیائے مسلم لیگ کا مسئلہ حل کیا جائے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کے ہاں سے ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ شوکت صاحب کی حرارت نارمل ہے۔ ہم سب خوش ہو گئے اور میں نے ٹیلیفون کر دیا کہ اب ان کے حسب فرمائش میں کلکتہ خلافت کانفرنس میں شرکت کے لیے چلا جاؤں گا۔ اور اپنے سکریٹری کو علی گڈھ بھیج دیا کہ میرا سامان لے کر ڈاک گاڑی میں مجھے مل جائیں لیکن بھوکا پیاسا چار بجے انصاری صاحب کے ہاں رائے سینا سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ حرارت حسب معمول (as usual) تھی کہ نارمل یعنی ۱۰۳۔ اب میں نے جانے سے انکار کر دیا مگر شوکت صاحب نے پھر بھی مجبور کیا اور بالآخر کلکتہ گیا۔ وہاں کے لوگوں کے خیالات کی یکسوئی کی۔ خلافت کمیٹی غریب مفلس ہو رہی تھی۔ ساڑھے نو ہزار روپیہ بڑی مشکل سے وصول کیا۔ اگر ایک دن اور رہ جاتا تو شاید ۳۔۴ ہزار اور مل جاتے۔ مگر دہلی کی خبروں سے شبہہ ہوا کہ شوکت صاحب کی طبیعت پھر بگڑی، دوڑا ہوا ایک دن کے لیے دہلی آیا، مگر مرض کے پھر عود کر آنے کا شبہہ صحیح نکلا۔ اور ایک ہفتہ دہلی رہنا پڑا۔ طبیعت تو پھر درست ہونے لگی تھی مگر پاسپورٹ نہ ملنے کے باعث تین چار دن خلافت کا کام کرنا پڑا۔ اس طرح ۱۵ مارچ کا نکلا نکلا کہیں ابتدائے اپریل میں پھر "گھر" یعنی علیگڈھ پہنچا۔ عزیزہ آمنہ مرحومہ کی قبر تیار کرائی (یعنی اس قدر پختہ کہ ڈھل نہ جائے) رخت سفر باندھا

[1] حکیم اجمل خاں مرحوم [2] ڈاکٹر انصاری مرحوم

اور اس نیت سے ریل میں سوار ہوئے کہ ۵ر اپریل کو آیا کہ ۶ر کی شام کو بمبئی کی طرف چل دوں گا۔ بال بچے ساتھ تھے۔ اگر شوکت صاحب علیل نہ ہو گئے ہوتے تو برہما جانے میں بھی ہمراہ جاتا۔[1] اپنی اہلیہ کو بمشکل تمام راضی کر لیا تھا کہ ہمارے ساتھ چلی چلیں۔ کام میں ان سے مدد ملتی کیونکہ وہ مستورات میں کامیابی سے کام کرتی ہیں۔ لیکن یہ بھی غرض تھی کہ ان کا غم غلط ہو گا۔ دس مہینہ وہ اور غریب محمود اللہ ہمارا داماد مرحومہ کی تیمارداری کرتے کرتے اب اس درجہ کو پہنچ گئے تھے کہ ان دونوں کا دھیان اس کی طرف سے ہٹانے کی سخت ضرورت تھی۔ خود غرضی بھی اس میں ضرور شامل تھی۔ میں بھی چاہتا تھا کہ کوئی تنہائی میں میرے پاس بیٹھ کر چپکے چپکے رونے والا مل جائے۔ اب جبکہ برہما کا سفر ناممکن تھا۔ ان دونوں کو اور لڑکیوں کو بھی شوکت صاحب کے ہمراہ ماتھران لے جانے کا ارادہ کیا۔ ان کے Relapse نے مجبور کر دیا تھا کہ معہ اہل و عیال کے پہلے خود ماتھران چلا جاؤں راستے میں مہاتما جی سے دو تین دن مسلسل تمام امور حاضرہ پر گفتگو کروں۔ جب شوکت صاحب کو افاقہ ہو جائے اور وہ اتنا لمبا سفر کرنے کے قابل ہوں تو ڈاکٹر انصاری صاحب اور ذاہد انھیں ماتھران لے آئیں۔ علی گڈھ سے چلنے میں دو روز کی دیر جامعہ کے کاموں کے باعث ہو گئی تھی۔ اس لیے دہلی سے کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ اسٹیشن پر معظم صاحب نے D.T J. خرید کر کھولا تو تار دیکھا کہ پھر شوکت صاحب کو Relapse ہوا ہے یہاں آکر بھی یہی ارادہ تھا کہ اسٹیشن پر سامان چھوڑ دوں اور دوسرے ہی دن بمبئی روانہ ہو جاؤں مگر انصاری صاحب کے مکان پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اب کا Relapse سخت تر ہے۔ بخار ۱۰۲ سے بڑھ گیا تھا۔ جاڑا جاڑ

---

[1] برما کا سفر خلافت کمیٹی کے لیے تحصیل زر کی غرض سے تھا۔

رہنا پڑا۔ ۱۰ ازنگ تو حالت اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ حرارت ۱۰۴ سے متجاوز تھی۔ ہزاروں خیالات برے سے برے دل میں آتے تھے، مگر میرے پروردگار نے رحم فرمایا۔ دوسرے ہی دن سے بخار کم ہونا شروع ہو گیا اور آج صبح کو حرارت نارمل تھی۔ وہاں تم جی میرا انتظار کر رہے ہیں، مگر میری مجبوریوں کے باعث مجھے معذور سمجھتے ہیں، تاہم شوکت صاحب کا تقاضا ہے کہ جاؤ، ابھی جاؤ۔ چنانچہ کل شب کو روانگی کی نیت ہے۔

یہ میری پریشانیوں کی کتھا ہے مگر "ولنبلونکم" نے پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا۔ سوائے صبر و شکر کے کیا چارہ ہے، مگر چار و ناچار نہیں۔ طوعاً صبر و شکر کرتا ہوں۔ اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃ بالکل صحیح ہے۔ مال تھا ہی نہیں اولاد تھی۔ کبھی کوئی لڑکا نہیں ہوا، مگر ان لڑکیوں نے زندگی کو اتنا پرلطف کر دیا تھا کہ مشکل ہی سے کبھی لڑکے کی خواہش دل میں آتی تھی اور اب تو خدا کا شکر ادا کیا کرتا تھا کہ گو لڑکا نہ دیا، مگر جتنی اولادیں ہوئیں سب کو زندہ رکھا بڑا کرم کیا۔ اس موت سے صبر نہیں تو شکر میں کمی ہو جانے کا بہت اندیشہ تھا۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ مرحومہ میں کچھ تو میری شکل کی شباہت تھی اور زیادہ تر میری خصلت کی یہاں تک کہ میری برائیاں بھی اس میں موجود تھیں، اسی لیے وہ اور بھی عزیز تھی۔ خداوند کریم نے چنا بھی تو اسی کو، مگر اس کے مرتے وقت سب روتے تھے اور میں سب کو سمجھاتا تھا۔ البتہ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ غم صرف اس دن کے لیے نہ تھا، بلکہ ساری عمر کا شریک ہو گیا ہے۔ کوئی چیز زندگی کو کھوکھلا کر گئی ہے۔ دعا کیجیے خداوند کریم رحم کرے والدہ کی علالت سخت نے جو اگر سخت نہ بھی ہو تب بھی اس عمر اور ضعیفی میں خطرناک ہوتی ہے، پریشان کر دیا تھا۔ شوکت صاحب کی خطرناک علالت نے ادھر پھر Relapse

نے اور خاص کر اس پچھلے نہایت خطرناک Relapse نے رہے سہے حواس گم کر دیے تھے لیکن خلافت کے اس قضیہ نے دل کی وہ حالت کر دی ہے کہ اگر خداوند کریم کا فضل شامل حال نہ ہوا تو نہ معلوم میری کیا کیفیت ہو جائے۔ نہیں کہہ سکتا کہ جا کر لیا کر لوں گا۔ مگر پاسپورٹ نہ ملنے سے اپنی بے کسی اور بے بسی اور بھی پریشان کرتی ہے۔ اس قید سے دیکھیے کب خلاصی ملتی ہے۔

قید ہے قید غلامی، دو برس کی قید کیا
دیکھو کب ہو خاتمہ، اس قید بے میعاد کا

اب رخصت ہوتا ہوں، مدتوں کے بعد آج خط لکھنے بیٹھا ہوں، مگر آپ کو دو حرفی خط لکھا نہیں جاتا۔ ابھی درجنوں خط پڑے ہیں، جن کا جواب خود اپنے قلم سے دینا ہے۔

والسلام
آپ کا محب صادق
محمد علی

لے مراد وہی مصطفیٰ کمال پاشا کی خلافت شکنی ہے۔

باب (۲۳)

سنہ ۱۹۲۴ء (۲)

(جنگل مین منگل ۔ "ہندو پرستی")

صدمے ہوں یا مصائب، دنیا کے کاروبار بہر حال چلتے ہی رہتے ہین۔ محمد علی صدر کانگرس کے لیے کیونکر ممکن تھا کہ غم منانے کو کسی گوشہ میں بیٹھ جاتے۔ نقل و حرکت مسلسل دورے، اور انتہائی مشغولی صدر کانگرس کے لیے لازمی ہین۔ محمد علی اس سے کیسے بچے رہ سکتے تھے۔ اکیلے خط و کتابت ہی کا کام وقت گھیرے رکھنے کے لیے کافی تھا۔ کانگرس کی طرف سے صدر کو سال بھر کے لیے ایک پرائیوٹ سکریٹری مل جانے کا دستور ہے۔ مولانا نے ایک رام پوری نوجوان محمد بشیر نامی کو اس کام پر رکھا تھا۔ پھر بھی ڈاک کا کام اتنا زاید تھا کہ نپٹائے نہ نپٹتا۔ ہندو مسلم فسادات کو سنہ ۲۱ء و سنہ ۲۲ء میں کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ سنہ ۲۴ء کے شروع مین ان کی وبا پوری طرح پھوٹ چکی تھی اور جیل جاتے وقت محمد علی ملک کی جو فضا چھوڑ گئے تھے، اب اس کے بالکل برعکس تھی۔ بات بات پر بدگمانی اور بے اعتمادی۔ ایک طرف شدھی اور سنگٹھن کا زور، دوسری طرف اس کے جواب مین تبلیغ و تنظیم۔ بات شروع ہوئی سیاسیات سے اور پہونچ گئی

دھرم اور ایمان تک۔ اب سب کو گاندھی جی کے چھوٹنے کا انتظار تھا، کہ دیکھیے مہاتما جی آکر اس زہر کا کیا تریاق پیش کرتے ہیں۔ گاندھی جی مارچ میں بالآخر چھوٹے۔ اور آخر مئی میں ان کا مفصل بیان ہندو مسلم اتحاد پر ان کے انگریزی ہفتہ وار ینگ انڈیا میں نکلا

محمد علی دورہ پر اس وقت لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور حسب معمول محلسرائے فرنگی محل میں مقیم تھے۔ دوپہر کا وقت تھا اور میں ان کی خدمت میں حاضر۔ دو ایک صاحب اور بھی تھے کہ کہیں سے ینگ انڈیا آیا اور مولانا اس کیلئے ہمہ انتظار و اشتیاق تھے۔ جلدی جلدی اسے سب پڑھ گئے۔ مگر پڑھ کر کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے تفصیل تو اب اتنے عرصہ کے بعد ذہن میں نہیں۔ اتنا یاد پڑتا ہے کہ گاندھی جی کے بعض ہندو مشیروں اور مقربان خاص پر مولانا بہت بگڑے۔ ان لوگوں سے یوں بھی کچھ زیادہ خوش نہیں رہا کرتے تھے۔ ہندو پبلک لیڈروں میں مولانا دل سے مداح و معترف صرف دو ہی شخصوں کے تھے۔ ایک پنڈت جواہر لال (نہ کہ ان کے والد ماجد پنڈت موتی لال) دوسرے مدراسی صدر کانگرس سری نواس آئنگر کے۔ باقی اکثر کو تو وہ کم فہم و کم عقل یا غالی و متشدد سمجھتے تھے۔ اور بعض کو تو کھلم کھلا بددیانت و غیر مخلص۔

جولائی کا مہینہ تھا کہ علی برادران پھر لکھنؤ آئے۔ اور اب کی لکھنؤ و نواح لکھنؤ میں گھومنے پھرنے کے لیے کئی دن کے لیے۔ اصلاً یہ دورہ مولانا شوکت علی کا تھا اور اس کا نام انھوں نے "آم کا دورہ" رکھا تھا۔ اور محمد علی کی حیثیت محض ذیلی و تبعی تھی۔ جوار میں قدیم شرفا کا ایک چھوٹا سا قصبہ بڑا گاؤں ہے۔ بارہ بنکی اسٹیشن سے کوئی ۲ میل کے فاصلہ پر۔ اور بانسہ، رسولی اور مسولی تو گویا اس کے بالکل پڑوسی ہی ہیں۔ زمینداری

قدوائی حضرات کے قصبہ میں۔ اور یہ لوگ بڑے خوش انتظام و خوش مذاق۔ کھانے اور کھلانے دونوں کا سلیقۂ خاص رکھنے والے، اور اپنی میزبانیوں کے لیے مشہور۔ خاندان کا ایک بڑا حصہ مولانا فرنگی محلی کا حلقہ بگوش اور نیازمند خصوصی۔ ایک رئیس زادہ حاجی شیخ الطاف الرحمٰن اس خصوص میں اور سب سے آگے بڑھے ہوئے۔ ان ہی نے مولانا شوکت علی کی آم کی دعوت اس موسم میں کر دی تھی۔ علی برادران پہلے لکھنؤ آئے اور وہاں سے موٹر پر بڑے گاؤں۔ میرا ساتھ رہنا دونوں جگہ لازمی ہی تھا۔ بڑی گانوان میں ۱۸، ۲۰ گھنٹہ کا وقت بڑے لطف اور دلچسپیوں کے ساتھ کٹا ــــــ چھوٹے سے قصبہ میں شہر کی سی چہل پہل پیدا ہو گئی تھی۔ "جنگل میں منگل" کا نمونہ نظر آگیا۔ بزرگ خاندان خان بہادر حاجی شیخ نثار الرحمٰن مرحوم (شیخ شفیق الرحمٰن قدوائی جامعی[۱] کے دادا) زندہ تھے، انھوں نے سیر چشمی اور اولوالعزمی، مہمانداری کا حق ادا کر دیا۔ یہ پرانے زمانے کے آدمی اپنے نوعمر پوتے شفیق کی سیاسی آزاد خیالیوں سے سخت ناخوش تھے۔ محمد علی نے صبح چلتے وقت ان سے خاص طور پر سفارش کر کے شفیق کے جرم معاف کرائے۔ علی برادران شام کے قریب پہنچ گئے تھے۔ رات کو پر تکلف دعوت اور قوالی رہی۔ صبح کو چائے اور پر تکلف ناشتہ کے بعد روانہ ہوئے۔ اور بجائے سیدھے لکھنؤ جانے کے مسولی اور باشنہ چلنے کی ٹھہری۔ سڑکیں اس وقت تک کچی تھیں۔ سواری بہلیوں کی تجویز ہوئی۔ اچھے سے اچھے بیل ان میں جتے۔ مسولی میں محمد علی کے عاشق صادق اور کامریڈ کے مشہور ظریف مضمون نگار، جوانمرگ شیخ ولایت علی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) معروف بہ بمبوق[۲] کا مکان تھا اور یہیں مزار بھی۔ محمد علی کے لیے کیسے ممکن تھا کہ اتنے قریب آکر انکی تربت پر

---

[۱] موجودہ وزیر تعلیمات صوبہ دہلی (۱۹۵۲ء) [۲] موجودہ حکومت ہند کے وزیر ڈاک و تار شیخ رفیع احمد قدوائی کے یہ مرحوم حقیقی چچا تھے۔ (۱۹۳۵ء)

فاتحہ پڑھنے نہ جاتے۔ وہ لوگ تو ادھر گئے، میں سیدھا بانسہ چلا آیا، جہاں اپنی قریب کی عزیزداری تھی۔ بانسہ میں سید شاہ عبدالرزاقؒ کی درگاہ بہت مشہور اور مرجع خلائق ہے، حضرات فرنگی محل وہاں کے خاص ارادت مندوں میں ہیں۔ علی برادران مسولی ہو کر وہاں بھی آئے۔ اور صاحب سجادہ ممتاز میاں صاحب مرحوم کی خدمت میں نذر بھی پیش کی ——— "نذر" یہ بیچارے کہاں سے پیش کر سکتے تھے۔ ان کے مرشد مولانا عبدالباریؒ نے یہ سمجھایا کہ درگاہوں کے آداب حاضری میں یہ نذرانہ کی پیشکش بھی داخل دستور ہے۔ اور خود ہی نقدی کی ایک ایک معقول رقم دونوں بھائیوں کے ہاتھ میں دے بھی دی۔

محمد علی اس سال صدر کانگرس تھے۔ لکھنؤ سال میں تین چار بار آئے اور ہر بار پذیرائی بھی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ ایک بار شاید آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جلسہ بھی لکھنؤ میں رکھ دیا۔ ہندو لیڈر بکثرت آئے۔ سب کی دعوت اسی محل سرائے فرنگی محل میں مولانائے فرنگی محلی کی طرف سے بڑے وسیع پیمانے پر ہوئی ——— میں ہر دفعہ خبر پاکر دریاآباد سے لکھنؤ آتا اور جب تک محمد علی رہتے موجود رہتا، دعوتیں ہوتیں جلسے ہوتے، قوالی کی محفلیں ہوتیں، اپنی خلوت پسندی اور اکل کھرے پن کو یہ چیزیں بہت بار معلوم ہوتیں، خاص کر قوالی کے ہو حق سے تو طبیعت بار بار جھنجھلا اٹھتی اور کبھی کبھی اتنا خستہ و زار ہو جاتا کہ اٹھ کر ان محفلوں سے اٹھ آتا۔ محمد علی کی شخصیت میں وہ جاذبیت اور جادو تھا کہ یہ بیزاری کبھی بھی دیر تک نہ قائم رہنے پاتی۔

لیکن دعوتیں ہوں یا جلسے، قوالی ہو یا آم خوری۔ خلافت اور کانگرس کا کام بھی

ساتھ ساتھ جاری ہی رہتا، اور تفریح محض تفریح نہ رہتی۔ گاندھی جی کا بڑا زور سوت کاتنے اور چرخہ چلانے پر تھا۔ محمد علی چرخہ برابر ساتھ رکھتے اور سوت ایک مقدار معین میں کاتتے جاتے۔ لوگوں سے باتیں کرتے رہتے اور چرخہ چلتا رہتا ——— کھانے پینے میں، ملنے ملانے میں، بات چیت میں بعض وقت بہت دیر ہو جاتی، اور نماز وقت سے بے وقت ہونے لگتی۔ لیکن نماز چھوٹنے کبھی نہ پاتی۔ عشا کی نماز بارہا آدھی آدھی رات گزر جانے پر پڑھتے، لیکن بہر حال پڑھ ضرور لیتے۔

ایک مرتبہ رات گئے نشست فرنگی محل ہی میں تھی، اور بالکل تخلیہ تھا۔ ذکر گاندھی جی کا نکلا اور میں نے ان کی روحانیت، تقدس اور مہاتمائیت سے متعلق اپنی عقیدتمندی کے تاثرات ظاہر کرنے شروع کیے۔ یقین تھا کہ مولانا ضرور اس کی تائید کرینگے۔ برعکس اس کے، اس کی تردید شروع ہو گئی، اور الٹی مجھ پر ڈانٹ پڑنے لگی۔ "میں گاندھی جی کی نہ روحانیت کا قائل ہوں نہ ان کے کشف و کرامات کا۔ نہ ان کا شمار اولیاء اللہ میں کرتا ہوں۔ ان کا مذہب الگ میرا مذہب الگ۔ ہاں انھیں اپنا سیاسی سردار تسلیم کرتا ہوں۔ وہ ملک کے اس وقت سب سے بڑے اور مخلص لیڈر ہیں۔ انگریزوں کی محکومی سے ہمیں نجات مل سکتی ہے تو ان ہی کے ذریعہ اور واسطہ سے۔ بس میری رفاقت و اطاعت ان کے ساتھ اسی حد تک محدود ہے۔ یہ آپ کا محض غلو ہے، جو آپ انھیں مرتبۂ ولایت پر رکھ رہے ہیں۔ جس طرح مذہب سے بیزاری میں آپ ایک سرے پر پہنچ گئے تھے اسی طرح مذہب کے ماننے میں آپ دوسرے سرے پر پہنچے جاتے ہیں۔" ——— اس قسم

کی تلقین، زجر و ملامت کے لہجہ مین کئی منٹ تک جاری رہی۔ اور یہ عین اس زمانہ مین جب کہ ایک اندھی اور بہری دنیا محمد علی کی ہندو نوازی کا ڈھول پیٹ رہی تھی اور محمد علی کی "گاندھی پرستی" کو اچھال رہی تھی! محمد علی مظلوم تو تھے ہی، لیکن ظالم ان کے حق میں سب سے بڑھ کر کوئی غیر نہیں، خود ان ہی کی قوم تھی!
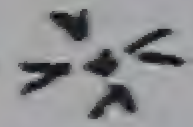
باب (۲۴)

۱۹۲۴ء (۳)

(ہمدرد اور کامریڈ۔ نقش ثانی)

قیام ابتک علی گڑھ میں تھا۔ گویا یہی گھر تھا۔ اب دہلی منتقل ہوئے، اور کامریڈ اور ہمدرد کے دوبارہ اجرار کا ارادہ پختہ ہوا۔ فضا کا حال دیکھ دیکھ کر کڑھ رہے تھے اور اخبارات نکالنے کا قصد اسی خیال سے کیا کہ ان کے ذریعہ فضا درست کریں گے۔ ہندو مسلمان بات بات پر لڑ رہے تھے۔ اور قوتوں کا رخ بجائے حکومت سے مقابلہ کے خانہ جنگیوں کی طرف پھرا ہوا تھا۔ اگست ستمبر کا زمانہ ہوگا، جب دہلی آ گئے، اور وہی مکان پھر کرایہ پر لیا، جس میں دس برس پہلے رہا کرتے تھے۔ کوچۂ چیلان کا اجڑا ہوا نشیمن مدت کے بعد پھر آباد ہوا۔ مکان تھا بہت بڑا اور وسیع۔ نیچے کے حصے میں برقی پریس کی مشینیں اور پریس کا سارا کاروبار۔ کوٹھے پر منیجر، خزانچی، اور عملہ کتابت وغیرہ کے دفتر۔ صیغۂ ادارت کے بھی چھوٹے چھوٹے لیکن الگ الگ کمرے، اور کامریڈ کے سب ایڈیٹر کا کمرہ تو بالکل ہی الگ مختصر صحن، پاخانہ، غسلخانہ۔ دوسری طرف خود مولانا کا بڑا سا آفس اور ڈرائنگ روم۔ اسی طرف سے نیچے زنانہ مکان کا بھی راستہ۔ اوپر اور نیچے دونوں منزلوں میں دو تین تا کمرے: اچھے خاصے وسیع، مولانا کے عزیزوں اور مہمانوں کے لیے۔ کبھی کبھی پھر بھی اتنا

ہجوم ہو جاتا کہ مکان کی وسعت ناکافی ہو جاتی۔ باہر ایک اوسط درجہ کا احاطہ مکان کا موقع بھی برا نہ تھا۔ دریا گنج کا ڈاکخانہ قریب ہی، اور جامع مسجد بھی دہلی کے فاصلوں کے معیار سے قریب ہی۔ اسٹیشن بھی کچھ ایسا دور نہیں۔ ملا واحدی صاحب اور مفتی کفایت اللہ صاحب اور راشد الخیری صاحب کے مکانات اسی محلہ میں۔

اخبار نکالتے وقت تجارتی پہلو نام کو بھی پیش نظر نہ تھا۔ مقصد تمام تر اصلاحی تھا۔ لیکن اب اخبار نکالنا آسان نہ تھا۔ سنہ ۱۲ء اور سنہ ۲۴ء میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس بارہ سال کی مدت میں، جنگ یورپ کے اثرات مابعد سے دنیا کی دنیا بدل چکی تھی۔

نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

پہلی چیز تو مصارف ہی کی زیادتی تھی۔ ہر شے پہلے سے کہیں زیادہ گراں ہو گئی تھی۔ کاغذ کی قیمت، کاتبوں کی اجرت، اسٹاف کی تنخواہ ہر شے کا معیار بلند ہو چکا تھا۔

پھر اس وقت محمد علی پوری طرح جوان تھے اور تندرست و تنومند۔ اکیلے سارا کام کر ڈالتے۔ جو کڑی پیش آتی جھیل ڈالتے۔ ہر طرح کی مشقت برداشت کرنے کو آمادہ۔ اب ایک تو سن کھسک آیا تھا۔ اور سن سے بھی کہیں بڑھ کر ضعف ۵، ۶ سال کی نظربندی اور دو برس کی اسیری، قومی مقاصد میں قدم قدم پر ناکامیاں اور مایوسیاں، خانگی اور ملی دونوں قسم کے صدمات ایک سے بڑھ کر ایک۔ سب پر مستزاد ذیابیطس کا مرض۔ ان سب نے مل ملا کر وقت سے کہیں قبل بوڑھا کر دیا تھا، کہا کرتے تھے کہ مردانہ قویٰ کے لحاظ سے ۴۵ سال کی عمر میں ۷۰ سال کا ہو چکا ہوں۔ محمد علی کے خلاف بغاوت و سرکشی کی ہوا آگے چل کر تو اور بہت زائد تیز ہوئی۔ لیکن پھیلنا اور بھڑکنا

اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جنھیں ۱۲ء مین اس پہ فخر تھا کہ محمد علی نے آج ان سے چوکی پر لوٹا رکھوایا، اور اپنی اس چاکری کو دوستون کے مجمع مین فخر سے بیان کرتے تھے، وہی ۲۴ء میں اب مدمقابل کی حیثیت سے سامنے خم ٹھونک کر آرہے تھے۔ اور گستاخیوں، دریدہ دہنیون اور دلآزاریون مین کوئی کسر اٹھا نہین رکھتے تھے۔ کامریڈ کے سب اڈیٹر راجہ غلام حسین اور کامریڈ کے صفحات کی رونق "بمبوق" دونون مدت ہوئی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ کامریڈ کے سابق مینجر بلکہ عقلِ کل، عبدالرحمٰن صدیقی روٹھ کر کلکتہ جا چکے اور اپنا الگ کاروبار جما چکے تھے۔ ہمدرد کے سابق مینجر میر محفوظ علی بدایونی گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے۔ ہمدرد کے سب اڈیٹر قاضی عبدالغفار مرادآبادی کی زندگی ایک نیا قالب بدل چکی تھی۔ اور دوسرے سب اڈیٹر سید جالب، دہلوی ہونے کے باوجود اب لکھنوی ہو چکے تھے اور ہمدم چھوڑ کر اب ہمدرد سے دوبارہ رشتہ جوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ تھے۔ ان سب اسباب نے مل جل کر ایک عجیب خلا کی سی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔

اور ان سب سے بھی بڑھ کر خود محمد علی کی لیڈرانہ عدیم الفرصتی۔ اور ہر کمی کی تلافی تو کچھ نہ کچھ ممکن تھی، لیکن اس کمی کی تلافی کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ لیڈری اور اڈیٹری دونون کا ساتھ نبھنا ہے دشوار رہی ـــــــــــ ۱۲ء مین محمد علی محض اڈیٹر تھے، لیڈری حاصل کر لی۔ ۲۴ء مین لیڈر محمد علی نے اڈیٹری کی کرسی پر از سرِ نو جمنا چاہا۔ ناکامی مقدر ہو چکی تھی۔

غرض جہان تک ظاہری مصلحت سنجیون کا تعلق ہے، اس وقت محمد علی کے اخبار

نکالنے کے کوئی معنی نہ تھے۔ لیکن اس جوش و اخلاص کے پتلے کو ان ظاہری مصلحت شناسیوں کے ہوش و حواس تھے ہی کب؟ وہاں تو ہر شے "مشنری اسپرٹ" (تبلیغی روح) کے ساتھ اور عبادت کے رنگ میں بنی۔ ایک ایک نقل و حرکت میں رنگ عبادت کا ہوتا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ کوشش اس کے نقشِ قدم پہ چلنے کی ہوتی تھی جس کو حکم یہ ملا تھا، اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ غرض نفع و نقصان، سود و زیان سے بالکل قطع نظر کر کے اخبارات کی اسکیم طے پا گئی ——— دوسرے مالکان اخبارات اتنے غیر کاروباری منصوبہ کو سمجھ ہی مشکل سے سکیں گے ———

اور مجھے حکم ملا کہ ستمبر میں دہلی پہنچ جاؤں اور ہمدرد کا پہلا پرچہ اپنے سامنے نکلوانے کے بعد وطن واپس ہوں۔

اب پہلی بار سوال سرمایہ کا پیدا ہوا۔ ٹائپ پریس کی مشینیں پہلے کی موجود تھیں اور کچھ اب منگالی گئی تھیں لیکن ظاہر ہے کہ مشین ہی تو سب کچھ نہیں، کاغذ کی قیمت، اسٹاف کی تنخواہوں کے لیے ہزاروں روپیہ ماہوار، مکان کا کرایہ وغیرہ وغیرہ، آخر ان سب کے لیے کیا سبیل تھی؟ ——— اکبر الہ آبادی کا مشہور شعر رہ رہ کر یاد آ رہا تھا ؎

کھلا دیوان میرا تو شور تحسین بزم سے اٹھا ۔۔۔ مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

اور اسی شعر سے قریبی رشتہ رکھنے والا ایک اور شعر بھی تو اسی حکیم شاعر کا ہے ؎

اٹھا تو تھا ولولہ دل میں کہ حسرت یا وفا کریں گے ۔۔۔ مگر یہ خیال آیا ٹل نہ روٹی تو کیا کریں گے

اب اللہ جانے محمد علی نے کن کن دوستوں مخلصوں سے، کن کن طریقوں سے، جوڑ بٹور کر کچھ روپیہ فراہم کیا۔ کراچی کے سیٹھ آنریبل حاجی عبد اللہ ہارون کا نام اچھی طرح یاد ہے۔ اس وقت یہ مولانا کے خاص مخلصوں میں تھے۔ رقم آج ۱۹۴۵ء کے معیار سے تو کچھ بڑی

نہ تھی۔ ہزار ہی دو ہزار کی تھی۔ لیکن اس وقت اچھی خاصی تھی۔ کچھ دھندلا سا خیال بمبئی کے جوانمرگ سیٹھ عمر توبانی کے نام کا بھی آرہا ہے۔ بڑی توقعات والی محمود آباد سے (جو راجہ سے اب مہاراجہ ہو چکے تھے) تھیں، پوری نہ ہوئیں۔ علی برادران کے پیر و مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی اکثر کاموں میں مالی امداد دیتے رہتے تھے۔ خیال نہیں آتا کہ اس میں بھی شریک ہوئے یا نہیں۔

میرے پاس حکم نامے شروع ستمبر ہی سے پہنچنے شروع ہو گئے تھے کہ دہلی اڑکر پہنچوں اور اسٹاف وغیرہ کے انتخاب میں مدد دوں۔ اپنے حسن ظن کی بنا پر محمد علی کامریڈ تک میں میرے مشورہ کو ضروری سمجھ رہے تھے، اور ہمدرد کے اسٹاف کا تقرر تو گویا موقوف ہی میرے مشورہ پر تھا ——— ادھر سے بھی دونوں اخباروں کے لیے خریداروں کی چھوٹی موٹی فہرستیں ستمبر بلکہ شاید اگست ہی سے روانہ ہونی شروع ہو گئی تھیں۔

بشیر صاحب رامپوری (صدر کانگرس مولانا کے پرائیوٹ سکریٹری) کا مکتوب مورخہ ۱۸ ستمبر ۲۴ء مضمون ذیل لیکر موصول ہوا:۔

"السلام علیکم۔ آپ کا پوسٹ کارڈ کل مولانا صاحب کے نام موصول ہوا۔ ہر دو اصحاب کے نام ہمدرد و کامریڈ کی خریداری کے لیے درج کر لیے گئے ہیں۔ شکریہ۔ اس سے قبل کے ناموں کا بھی اندراج کیا جا چکا ہے

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ آپ یہ تو پوچھ رہے ہیں کہ پرچوں کا اجرا کب ہوگا مگر خود تشریف نہیں لاتے۔ آپ جس قدر جلد یہاں تشریف لے آئیں اسی قدر جلد پرچے بھی نکلنا شروع ہو جائیں گے۔ آپ کی موجودگی یہاں دو خاص ضرورتیں ہیں۔ اولاً"

مولانا صاحب نے ابتک ہر دو اخبارون کے عملون کے تقرر کی نسبت قطعی فیصلہ نہین کیا ہے۔ گو در خواستون کا ایک دفتر ہے جو روزانہ چلا آتا ہے۔ مولانا صاحب آخری تقرر سے پیشتر آپ سے اس کے متعلق صلاح و مشورہ کرنا چاہتے ہین۔ دویم یہ کہ ابتک مولانا صاحب کو ہر دو اخبارون کے لیے کوئی بھی ایسا آدمی نہیں مل سکا ہے جو ان کی قلمی امداد کر سکے۔ بالکل تن تنہا ہین۔ اخبار چونکہ عنقریب نکلنے والے ہین اس لیے مولانا صاحب کی خواہش ہے کہ آپ سے گفتگو کر کے کوئی دلچسپ سلسلۂ مضامین شروع کیا جائے۔ آپ مولانا صاحب سے وعدہ فرما چکے ہیں اور یہ ان کے ہاتھ بٹانے کا خاص وقت ہے۔ اس کام کے لیے ممکن ہو تو میر محفوظ علی صاحب کو بھی ساتھ لیتے آیئے۔

احمد آباد سے تو کل مشینین آگئی ہین۔ کلکتہ سے لیتھو کی مشینین بھی روانہ ہو چکی ہین، ایک دو دوم مین وہ بھی یہان پہنچ جائین گی۔ صرف مشینون کا لگانا باقی ہے، دوسرے ہفتہ میں نہیں تو تیسرے ہفتہ ستمبر میں اخبار کے نکلنے مین کوئی شبہہ ہی نہیں۔"

باب (۴۵)

۱۹۲۴ء (۴)

(گاندھی جی کی مہمانی)

ایڈیٹوریل اسٹاف (عملۂ ادارت) کا سوال سرمایہ کے مسئلہ سے کچھ کم اہم نہ تھا۔ مولانا اس پر تلے ہوئے تھے کہ ان کی جیب پر بار جتنا بھی پڑ جائے، اسٹاف بہر حال بہتر سے بہتر ہی منتخب ہو۔ لیکن آہ کہ محمد علی کی بیسیوں دوسری آرزوؤں کی طرح اس آرزو کا بھی بالکل کیا معنی تھوڑا بہت حصہ بھی پورا ہونا مقدر میں نہ تھا۔ کامریڈ کے لیے تو کہنا چاہیے کہ آخر تک بھی کوئی مددگار نہ ملا۔ درخواستیں جتنوں کی آئیں، وہ مولانا کی نظر میں نہ جچے۔ اور مولانا جنھیں لینا چاہتے، وہ خود کسی نہ کسی معذوری سے آ نہ سکتے۔ مولانا کی نظر پنجاب کے ملک عبدالقیوم بیرسٹر ایٹ لا پر تھی، جو لندن سے "مسلم آؤٹ لک" نکال چکے تھے۔ مولانا ان کے مضامین سے بہت خوش تھے، لیکن ان کا ارادہ کبھی اس سے آگے نہ بڑھا کہ بس کبھی کبھی کامریڈ کے لیے کوئی مضمون بھیج دیتے۔ صوبہ بہار کے مبین الرحمن بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی کے مضامین مولانا نے بمبئی کرانیکل میں پڑھے اور انھیں بہت پسند کیا۔ مدتوں ان سے مراسلت رہی اور برابر ان کی آمد کا انتظار رہا۔ بالآخر نہ آئے، اور اپنے صوبہ کی کونسل کے ممبر ہو گئے۔ بہت زیادہ

انتظار شعیب قریشی صاحب کا رہا (جن کی قسمت میں ۶ سال کے بعد مولانا کا داماد ہونا لکھا تھا) علی گڈھ کے ایم۔ اے۔ ال۔ ال بی تھے لندن میں بیرسٹری پڑھے ہوئے۔ بڑے مخلص اور پرجوش تھے۔ نیو ایرا (لکھنؤ) کو مدت تک سنبھالے رہے۔ پھر گاندھی جی کی گرفتاری پر ان کے انگریزی ہفتہ وار ینگ انڈیا کے اڈیٹر رہ چکے تھے۔ کامریڈ کی سب اڈیٹری کے ہر طرح اہل تھے۔ ان کے لیے سب کوششیں ہوئیں۔ ان کا دل نہ پسیجنا تھا نہ پسیجا۔ بمبئی سے ایک صاحب کی درخواست آئی، بڑے ہی نیازمندانہ اور معتقدانہ لب و لہجہ میں (اس سلسلہ کی مراسلت اور درخواستیں میری نظر سے گزرنا لازمی تھی) مولانا نے ان ہی کو غنیمت سمجھا، بہت خوشی سے تو نہیں لیکن بہرحال انھیں بلا لیا۔ کچھ روز تو انھوں نے بھی اپنی درخواست کے انداز تحریر کو خوب نباہا۔ اس کے بعد کامریڈ ہی سے علیحدہ نہیں ہوئے، بلکہ مولانا کے بھی شدید ترین دشمن ہو گئے۔ اور انھیں اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اللہ انھیں معاف فرمائے۔ مولانا کے انتقال کے چند ہی روز بعد یہ بھی عالم آخرت میں پہنچ گئے۔

ہمدرد کے لیے امیدواروں کی کمی نہ تھی۔ مگر وہی وقت یہاں بھی تھی۔ جنھیں ہمدرد چاہتا تھا وہ عنقا تھے۔ اور جو خود آنے کو تلے رہتے تھے ان کی میزبانی میں ہمدرد کو تامل تھا۔ مولانا کو اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ ہر درخواست کو پڑھ سکیں، ساری ذمہ داری اسی نیازمند کے سر تھی۔ جالب صاحب سے میں نے زبانی گفتگو کی۔ وہ حضرت اب لکھنؤ

ۓ بعد کو بھوپال میں وزیر ہو گئے۔ اس وقت (۱۹۶۱ء میں) پاکستان کی طرف سے روس میں سفیر ہیں۔

اور مسعود کی نظر ثانی کے وقت (مارچ ۱۹۶۵ء میں) میں معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ہائی کمشنر ہیں کراچی میں

کے قطب بن چکے تھے۔ وطن کی کشش بھی ہٹنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ زمیندار (لاہور) کے سالک صاحب سے بھی مراسلت رہی مگر بے نتیجہ۔ آخری قرعۂ انتخاب ان چھ صاحبوں کے نام پڑا:۔

(۱) محمد فاروق صاحب دیوانہ گورکھپوری، ایم اے (علیگ)، ہمدرد کے دور اول میں بھی رہ چکے تھے۔ (بعد کے مشہور مسلم لیگی ایم۔ ال۔ اے)

(۲) احتشام الدین صاحب دہلوی۔ ایم۔ اے (علیگ) بعد کے ممتاز لغت نویس)[1]

(۳) عارف ہسوی صاحب۔ پرانے نیشنلسٹ اور کانگرسی پرچوں میں کام کیے ہوئے[2]

(۴) قاری عباس حسین صاحب دہلوی[3]، ہمدم وغیرہ میں کام کیے ہوئے۔ ایک ماہنامہ تمدن بھی نکال چکے تھے)

(۵) محمد جعفری صاحب جامعی مچھلی شہری، جامعہ کے ہونہار نوجوان۔ ہمدرد میں شروع سے آخر تک رہے۔ بعد کو اپنا روزنامہ ملت نکالا)

(۶) حسن ریاض صاحب بلند شہری۔ (اپنا ایک ہفتہ وار نکال چکے تھے۔ مدت کے بعد لکھنؤ سے روزنامہ ہمت اور پھر دہلی سے لیگی روزنامہ منشور نکالا)[4]۔

ان میں سے دو صاحبوں کا تقرر مولانا نے بالکل اپنی پسند سے فرمایا تھا — اردو کے کسی روزنامہ میں اس وقت تک نہ سب ایڈیٹروں اور مترجموں کی اتنی تعداد تھی، اور نہ قابلیت کے اعتبار سے اتنا بہتر اسٹاف کہیں اور جمع تھا۔ غرض کچھ نہ ہونے پر بھی ہمدرد کا اسٹاف کیفیت اور کمیت دونوں حیثیتوں سے اپنی نظیر آپ تھا۔

یہ بھی ٹھہری کہ مختلف مرکزی مقامات میں ہمدرد کے "وقائع نگار خصوصی" مقرر ہوں،

---

[1] اور اب مرحوم (۱۹۵۱ء) [2] مدت ہوئی انتقال کر چکے (۱۹۵۱ء) [3][4] اب دونوں صاحب پاکستان میں ہیں (۱۹۵۱ء)

چنانچہ لکھنؤ، بمبئی، علی گڑھ وغیرہ میں وقائع نگاروں کا تقرر ہوا۔ اور مشاہیر اہل قلم سے درخواست کی گئی کہ سیاسی، علمی ادبی، مذہبی عنوانات پر اپنے ماہرانہ و فاضلانہ مقالات سے وقتاً فوقتاً ناظرین ہمدرد کو مستفید کرتے رہیں ــــــــــ یہ ساری خدمات مولانا کی نیابت میں ان کا یہ نیاز مند ہی انجام دیتا رہا۔

آہ انسانی دماغ کی خام خیالیاں، اور بشری آرزوؤں اور تمناؤں کی خام کاریاں کیا کیا امنگیں اور حوصلے اس وقت تھے! بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ سارا ہندوستان خصوصاً اسلامی ہندوستان اپنی مٹھی میں آیا جا رہا ہے۔ نیشنلزم اور اسلامیت کے جس رخ گھمانا چاہیں گے گھما دیں گے، جو بولی بلوانا چاہیں گے بلوا دیں گے!

حاضری کا حکم مجھے وسط ستمبر کیلئے ملا تھا، پہنچا گاڑی اسٹیشن پر بعد مغرب پہنچی تھی۔ گھر پہنچتے کچھ اور دیر لگی تو دیکھتا کیا ہوں کہ دروازہ پر کانگریسی والنٹیروں کا پہرہ! زینہ پر چڑھنا چاہا تو فوراً مجھ سے پوچھ گچھ، سوال و جواب شروع ہو گئے! آپ کون ہیں؟ کس کے پاس آئے ہیں؟ کیا کام ہے؟ ــــــــــ یا اللہ! یہ کیا! معلوم ہوا کہ گاندھی جی آئے ہوئے ہیں اور اب کی مولانا ہی کے مہمان ہیں۔ گاندھی جی باوجود اپنی مشہور عالم سادگی کے سفر مع حشم و خدم کے کرتے تھے۔ ساتھ ہی پرائیوٹ سکریٹری (اس وقت مہادیو ڈیسائی تھے) اور فلاں فلاں، پھر مہمانی کے بھی خاص خاص شرائط۔ اتنے بڑے قافلہ کا ٹھہرانا آسان نہ تھا۔ پھر مولانا کے مکان اور دفتر میں اتنی گنجائش ہی کہاں تھی۔ لیکن مولانا تو جہاں تک کسی کی بھی میزبانی اور مہمانداری کا تعلق ہے، ایثار اور بے نفسی کے پتلے تھے، چہ جائے کہ گاندھی جی کے لیے! وہ دہرا بڑا اگرا جو ان کا آفس بھی تھا اور

ڈرائنگ روم بھی۔ اس میں انھوں نے گاندھی جی کو جگہ دے دی۔ اور ان کے اسٹاف والوں کے لیے اپنا مہمانوں کا وسیع کمرہ بالکل خالی کر دیا۔ ڈرائنگ روم کی عمارت اب بھی وہی تھی جسے دس سال قبل ۱۹۱۴ء میں دیکھ گیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اس وقت کمرا مخملی کوچ، صوفے وغیرہ "صاحبانہ" فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اب اس سب کے بجائے فرش زمین پر صرف ایک سبز رنگ کی دبیز دری کا فرش تھا۔ اسی پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ آفس کے حصہ میں ایک بڑی سی میز، چند کرسیاں اور کتابوں کی دو تین الماریاں۔ غرض جس طرح بھی بن پڑا مولانا نے ان سب معزز مہمانوں کے لیے گنجایش نکالی۔ اب میں جو پہنچا، تو مولانا مجھے اپنے ذاتی کمرے میں لے گئے۔ اور وہیں بسلایا ——— ہجوم کی کمی یوں بھی کب رہتی تھی، اور اب تو گاندھی جی کی ذات ہے، ہیکہ میلا سا لگا ہوا۔ مولانا ہر وقت مہمانداری میں مصروف، کام ڈیڈ اور ہمدرد کے لیے بات کرنے کی فرصت ہی اب کسے، جس غرض کے لیے میری طلبی ہوئی تھی، وہ مقصد ہی فوت! خیر دنیا بہ امید قائم۔ آس یہ بندھی کہ دو چار دن میں یہ ریل پیل ختم ہو جائے گی، اور جب مولانا سے بہ اطمینان گفتگو کا موقع نکل سکے گا۔

مولانا کھانا عام طور سے وہی کھاتے تھے جو خوشحال شریف مسلمان گھرانوں میں کھایا جاتا تھا۔ قورمہ، اور کبھی قلیہ کبھی کباب، کبھی دو پیازہ۔ غرض گوشت کے کھانے دو ایک قسم کے تو ضرور ہی ہوتے تھے۔ ابکی کیا دیکھتا ہوں کہ گوشت کی ہر قسم یکسر غائب، ہند و سبزی خور مہمانوں کی خاطر دسترخوان پر صرف سبزی ہی سبزی! گاندھی جی کے معمولات تو سب سے الگ اور نرالے ہی تھے، ان کے ساتھ کھانے کی شرکت کسی کو کیوں

نصیب ہونے لگی تھی۔ لیکن ان کے سکریٹری مہادیو ڈیسائی وغیرہ مولانا کے دسترخوان پر ہم لوگوں کے ساتھ ہی ہوتے۔ انہی کی رعایت سے مولانا نے خود بھی اتنے دنوں کے لیے گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا۔ ایک آدھ وقت تو خیر نبھ گیا، لیکن اس کے بعد تو مسلمان مہمانوں کی (اور ان میں مولانا کے اعزہ عظیم صاحب وغیرہ سب شامل تھے) بری حالت ہو گئی۔ دسترخوان پر بیٹھتے ہی طبیعتوں پر جھنجھلاہٹ غالب آجاتی اور عجب نہیں جو دل ہی دل میں گاندھی جی پر کوسنے بھی پڑ جاتے ہوں! ——— محمد علیؒ کھانے اور اچھے کھانے کے بڑے ہی شوقین تھے۔ ان کے لیے یہ قورمہ اور قلیہ اور پلاؤ اور کباب سے پرہیز ایک شدید مجاہدہ سے کم نہ تھا لیکن بہرحال وہ مجاہدوں کے خوگر ہو گئے تھے اور اس طعامی مجاہدہ کو ہنسی خوشی برداشت کر رہے تھے

دو دن گزرے، اور تین دن گزرے، گاندھی جی کو اتنا قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے اور کبھی کیوں نصیب ہوتا۔ اس وقت مولانا کے طفیلیوں میں مفت مل رہا تھا لیکن مولانا سے کام پڑا اور ہمارا دیر گفتگو کا موقع نہ آج ملتا ہے نہ کل۔ نہ صبح کو نہ شام کو۔ مولانا وقت کے نظم و انضباط پر کہیں بھی قادر نہ تھے۔ اور اس باب میں گاندھی جی کے بالکل برعکس واقع ہوئے تھے، وہاں تو جیسے ایک ایک منٹ نپا تلا ہوا رہتا تھا کھانے پینے، سونے جاگنے، غسل، ہوا خوری، ملاقات ہر ہر چیز کے وقت بندھے ہوئے تھے۔ ویسے ہی یہاں ہر چیز میں بدنظمی تھی۔ کھانا نکل کر آ گیا، دسترخوان پر لگ گیا، پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے، اور مولانا ہیں کہ کسی ملاقاتی سے گرماگرم مباحثہ میں مشغول ہیں۔ اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ ساتھیوں کی آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ راتوں کو بلا ضرورت شدید گیارہ گیارہ، بارہ بارہ بجے تک جاگ رہے ہیں۔ کام کرنے پر جٹ گئے تو اب کھانا اور سونا سب غائب۔ روزمرہ یہی رہتا۔ اور اصل مشغولیت کے ساتھ یہ بدنظمی بھی ہر کام میں شامل رہتی ——— دن ٹلتے چلے گئے اور مفصل گفتگو کا موقع نہ نکلنا تھا نہ نکلا۔

تو اب کھانا اور سونا سب غائب - روز مرہ یہی رہتا۔ اور اصل مشغولیت کے ساتھ یہ بدنظمی بھی ہر کام میں شامل رہتی

باب (۲۶)

۱۹۲۴ء (۵)

(۲۱ روزہ "برت" - بی اماں کی وفات)

فرقہ وارانہ کشمکش زوروں پر تھی - ہر روز ملک کے مختلف حصوں سے خبریں ہندو مسلم فسادات اور خونریز لڑائیوں کی آرہی تھیں (حالانکہ اس وقت کی خوں ریزیوں کو کوئی نسبت نہ رہی۔ ان ہولناک سفاکیوں سے جو ۱۹۴۷ء میں اسی سرزمین ہند پر اسی کے فرزندوں کے ہاتھوں واقع ہوئیں)۔ کوہاٹ (صوبۂ سرحد) کا بلوہ خصوصیت کیساتھ گشت و خون میں بڑھا ہوا رہا ۔۔۔۔۔۔ ۱۸ ستمبر دوشنبہ کے سہ پہر کو حکیم اجمل خان صاحب کے مکان پر جامعہ ملیہ کی انتظامی کمیٹی کا جلسہ ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں تھا ہم سب لوگ وہیں تھے اور بعد مغرب وہاں سے چل ہی رہے تھے کہ ہمدرد پریس کے منیجر عبدالعلی خان رامپوری بھاگے ہوئے وہاں پہنچے۔ اور چپکے سے مولانا کے کان میں یہ خبر پہنچائی کہ "گاندھی جی نے یک بیک ۲۱ دن کے برت رکھنے (فاقہ کرنے) کا عزم کرلیا ہے" دوشنبہ ان کی ہفتہ وار خاموشی کا دن تھا، اس لیے اپنا یہ عزم ایک پرچہ پر لکھ کر انھوں نے دے دیا تھا۔ خبر سنتے ہی سب سناٹے میں آگئے۔ اور مولانا پر تو جیسے بجلی ہی گر پڑی جلدی جلدی ہم لوگ گھر واپس پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب اور حکیم صاحب بھی ساتھ۔ کمرہ

مدیر کا مرتب وہمدرد کے ڈرائنگ روم) کا منظر اب دیکھنے کے قابل تھا۔ گاندھی جی کے بابعد کے برتوں نے تو بعد کو اس (۲۱ روزہ برت کی کوئی خاص اہمیت باقی نہ رکھی لیکن اس وقت تک یہی برت سب سے زیادہ عجیب وغریب تھا، اور اقدام خودکشی کے مرادف۔ دوشنبہ کا دن تو اب ختم ہوچکا تھا۔ لیکن گاندھی جی کی خاموشی کے پورے ۲۴ گھنٹوں کے ختم ہونے میں ابھی کوئی گھنٹہ دو گھنٹہ کا وقت باقی تھا۔ گاندھی جی نے چار مختصر تحریریں انگریزی میں الگ الگ لکھ رکھی تھیں۔ ایک اپنی بیوی کے نام، دوسری انگریزوں کے نام، تیسری ہندو مسلمانوں کے نام، اور چوتھی اپنے میزبان کے نام۔ اور وہ تحریریں ایک ایک کے ہاتھ میں گشت کر رہی تھیں۔

کمرہ کے صدر میں دیوار سے تکیہ لگائے، گاندھی جی بت بنے چپ چاپ بیٹھے ہوئے ان کے داہنے پر حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری۔ بائیں پر بانیکر (ایڈیٹر "ہندستان ٹائمس"[1] دہلی) جارج جوزف[2] (ایڈیٹر "انڈپنڈنٹ" الہ آباد) سی۔ ایس۔ رنگا آیر[3] (ایم۔ ایل۔ اے) اور سامنے حسرت موہانی[4]، آصف علی بیرسٹر[5]، اور خود مولانا، اور اور لوگ مغموم ومتاثر ہر شخص شاید بجز مولانا حسرت موہانی کے۔ حکیم صاحب تو بڑے سنجیدہ آدمی، ٹھنڈے دماغ کے تھے۔ دوسرے کمرے میں لے جاکر مجھ سے اور آصف علی صاحب سے گاندھی جی کے بیانات کا اردو ترجمہ سنا، اور سن کر آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ پھر وہیں واپس آکر انھوں نے اور ڈاکٹر صاحب نے اور آصف علی صاحب سب ہی نے تو اپنی والی

---

[1] اس وقت ہندوستان کے سفیر چین میں ہیں (سنہ ۱۹۵۱ء) [2] مدراسی عیسائی۔ عیسائیوں میں بڑے زبردست نیشنلسٹ تھے۔ اب مدت ہوئی آنجہانی ہو چکے ہیں۔ ان کے بھائی پوتھن جوزف انگریزی کے بڑے نامور صحافی ہیں

[3] مدراسی الاصل لیکن مدت سے لکھنؤ اور دہلی کے ہو گئے تھے۔ لکھنؤ کے انگریزی سہ روزہ "ایڈوکیٹ" کے ایڈیٹر مدت تک رہے۔ اب آنجہانی۔ [4] سنہ ۱۹۵۱ء میں مرحوم ہو چکے [5] موجودہ گورنر صوبۂ اڑیسہ (سنہ ۱۹۵۱ء)

کوشش گاندھی جی کو اس رائے و عزم سے پھیرنے کی کی۔ وہاں تبدیلی کی گنجایش کہاں
——— سب سے زیادہ مضطرب اور پریشان، حیران اور صدمہ زدہ خود مولانا تھے۔
پہلے روئے، پھر بگڑے۔ گاندھی جی سے اس طرح لڑتے اور ڈانٹتے ہوئے انھیں اس کے
قبل مین نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ جس شخص کا وہ انتہائی ادب
واحترام کرتے تھے، اس پر وہ یوں گرج اور برس بھی سکتے ہین! بار بار کہہ رہے تھے کہ
"بغیر ہم سے صلاح و مشورہ کیے اتنا اہم قدم آپ نے اٹھایا کیسے؟ دنیا کے سامنے تو یہ مشہور ہے
کہ علی برادران سے مشورہ کے بغیر شاید سانس بھی نہیں لیتے۔ پھر ہم لوگوں سے بالکل راز رکھکر
اتنی سخت کارروائی کر گزرنا یہ ہمارے ساتھ بدعہدی اور دغابازی ہوئی یا نہیں؟ یہ تو
دھوکا دینا ہوا، ہمین بدنام کرنا ہوا، پھر اگر اتنا سخت مجاہدہ آپ نہ جھیل سکے، اور آپ کی
جان چلی گئی، تو ساری ہندو قوم کا غصہ مسلمانون ہی پر اترے گا کہ ایک مسلمان میزبان
نے اپنے مہمان کو مر جانے دیا۔ اور اس طرح ہندو مسلم منافرت کی آگ بجھنے کے بجائے
اور بھڑکے گی۔" گاندھی جی کی خاموشی کا وقت اس درمیان مین ختم ہو چکا تھا، اور اب
وہ مسکرا مسکرا کر ٹھنڈے اور مختصر جوابات دے رہے تھے۔ بولے کہ "بہرحال اب تو خدا
کے سامنے عہد کر چکا ہوں"۔ مولانا نے تڑپ کر جواب دیا کہ "جو عہد ہمارے مشورہ کے
بغیر کیا جائے وہ عہد ہی کب ہے؟ قسمیں تک جو ایسی جلد بازی میں اور بے سوچے سمجھے
کھالی جاتی ہین، قرآن نے جسے آپ بھی سچا اور خدائی کلام سمجھتے ہیں، ان کو "لغو" یا لا یعنی
قرار دیا ہے۔ اور ان کی پابندی لازمی نہیں رکھی ہے"۔ یہ کہہ کر قرآن مجید کی آیت سنائی
لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِىٓ اَيْمَانِكُمْ الخ۔ گاندھی جی اس پر بھی مسکرا لیکے جب
دیکھا کہ یہ نشانہ بھی خالی گیا، تو بی امان جو اس وقت تک زندہ تھین، مگر آخری علالت مین

بستر مرض پر پڑی ہوئی تھیں، ان کے پاس سے گاندھی جی کو پیام بھجوایا کہ "تم مجھے اپنی ماں کے برابر سمجھتے ہو، میرا حکم مانو، اور اپنے اس ارادہ سے باز آجاؤ۔ میں آنے کے ذرا بھی قابل ہوتی تو زنانہ مکان سے خود تمھارے پاس کوٹھے پر آتی"۔ گاندھی جی نے جواب کہلوایا "اگر میں اپنی سگی ماں کی اطاعت اس باب میں کر سکتا تو آپ کی بات بھی ضرور مان لیتا"

ـــــ مولانا سے گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ اس کا ایک آخری اور پُر زور ٹکڑا:۔ "کم از کم شوکت علی کا انتظار تو آپ کو کر ہی لینا تھا۔ آپ پبلک میں تو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی کام آپ بغیر ان کے مشورہ کے نہیں کرتے، اور عمل یہ ہے"! گاندھی جی اپنی اسی متین مسکراہٹ کے ساتھ:۔ "لیکن شوکت علی یقیناً میری رائے کی تائید کریں گے۔ وہ سپاہی آدمی ہیں"۔ مولانا کے ترکش کا آخری تیر:۔ "سپاہی!! یہ کہیے کہ آپ ان کو اپنا غلام سمجھ رہے ہیں"۔

ایک بجے شب کو میں تو پڑ کر سو رہا۔ سنا مولانا ۳½ پر سوئے! اور یہ ان کیلئے کوئی نئی بات تھی ہی نہیں۔ مولانا کی مصروفیت گاندھی جی کے آجانے سے یوں ہی کیا کم تھی، اب اس تازہ واقعہ سے تو کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ دن رات گاندھی جی ہی کی دیکھ بھال اور ان کے لیے ہر قسم کے انتظامات۔ ٹرنک کال کر کے مولانا شوکت علی کو ٹیلیفون پر اطلاع بمبئی راتوں رات پہنچا دی گئی، اور دوسرے تیسرے دن وہ بھی آگئے۔ میرا قیام اب بیکار تھا۔ اخباری اسکیمیں کچھ روز کے لیے اب بالکل غتربود۔ مولانا کو اب کسی وقت بات کرنے کی بھی فرصت نہیں۔ دو چار روز اور راستہ دیکھ کر میں نے تو وطن کا راستہ لیا۔ منتظم حسب عماد ادراور لوگ بہت کچھ روکتے رہے۔ کہ مہاتما کی برت شکنی کا منظر بھی دیکھ کر جانا۔ یہاں اتنی

فرصت کہاں تھی۔ دریاباد آگیا، اور یہیں سے جو خدمت ہمدرد کی بن پڑی، کرتا رہا۔ چلتے وقت مولانا نے پوچھا کہ "اب کب آؤ گے؟" یہاں تو طبیعت جلی ہوئی تھی۔ جواب میں عرض کیا کہ "اب درمیان میں ہرگز نہیں آنے کا، آپ کے ہاں تو روز ایک نہ ایک مسئلہ نکلتا ہی رہتا ہے۔ اب جب آپ کے پرچے نکل لینگے، اور انھیں وہاں پڑھ لونگا، جب ہی ادھر کا رخ کرونگا"

۳۱ اکتوبر کو خدا خدا کر کے کامریڈ کا پہلا پرچہ نکلا، اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ آٹھ دن کے بعد ۸ نومبر کی شام کو ۹ کا پہلا پرچہ ہمدرد کا شائع ہوا۔ ۱۲ سو پرچے خاص دہلی میں نکل گئے۔ اور مانگ برابر جاری رہی۔ محمد علی کے نام کا سکہ اب دونوں پر بیٹھا ہوا تھا۔

عین اسی زمانہ میں بی اماں بیچاری کی علالت نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ محمد علی غریب سے تو نہ جی بھر کر تیمارداری ہی بن پڑتی اور نہ اطمینان و یکسوئی سے اخبارات ہی پر توجہ ہو سکتی۔ ہمدرد تو خیر اسٹاف والوں کے بھروسہ پر جوں توں نکلے جاتا۔ اصلی مصیبت کامریڈ کی تھی۔ اس میں کوئی بھی ہاتھ بٹانے والا نہ تھا۔ وسط نومبر میں شب جمعہ کو بی اماں رخصت ہو گئیں، اور دنیا ایک ایسی متقی خاتون کے وجود سے محروم ہو گئی، جس کی نماز فجر، سفروں کی کثرت اور رات کی تقریروں اور جلسوں کے باوجود، کہا جاتا ہے کہ پچاس سال کی مدت میں کبھی قضا نہیں ہوئی تھی! یہ وہی بیوہ تھی، جس نے اپنی جوانی کے زمانہ میں حج کے موقع پر غلاف کعبہ پکڑ کر اپنی اولاد کے حق میں یہ دعا نہیں کی تھی، کہ اسے بڑی بڑی دنیوی عزتیں اور مرتبے حاصل ہوں، بلکہ رب کعبہ سے عرض کیا تھا کہ "اے پروردگار میری اولاد کو دین کا سچا خادم اور پختہ مومن بنا دے"۔

جنازہ ابھی گھر میں رکھا ہوا تھا، اور چہیتا اور ماں کا دلدادہ بیٹا کامریڈ کے لیے مضمون ہی لکھنے میں نہیں، بلکہ پروف درست کرنے میں بھی مشغول تھا!

باب (۲۷)

سنہ ۱۹۲۴ء (۶)

(صدرِ خلافت "ہو رہے ہین چور سفت افلاک کے")

پرچے نکلنے شروع ہو گئے۔ اور مجھے متواتر حکم نامے دہلی فوراً پہنچنے کے ملنے لگے۔ ایک خط تو اسٹاف کے کسی صاحب کا (جنکے دستخط آج پڑھے نہین جا سکے) لکھا ہوا ۱۱ راکتوبر ہی کو چلا تھا:۔

"حسب ہدایت مولانا محمد علی صاحب ۸ ر اکتوبر کے والانامہ کی رسید عرض ہے سید ہاشمی صاحب اور صدیق الزمان صاحب کا پتہ نوٹ کر لیا گیا۔ نمونہ کا پرچہ بھیجا جائے گا، اور کامریڈ کا وی پی ارسال ہو گا۔

انتظامات روزانہ مکمل ہوتے جاتے ہین۔ مشینری تمام لگ گئی ہے۔ مشینون کا درست ہو کر روان ہونا باقی ہے۔ مولانا فرماتے ہین کہ براہ کرم چند مضامین ابتدائی اشاعتون کے لیے جس قدر جلد ممکن ہو تیار کر دین۔ پہلا پرچہ مشینری کے عنقریب روان ہوتے ہی شائع ہو گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ"

کام کی تو اپنے دل سے لگی ہوئی تھی۔ خریدار بنانے مضمون لکھنے اور دوسرون سے لکھوانے، حیدرآباد وغیرہ مین وقائع نگار مقرر کرانے مین برابر خط و کتابت میں لگا ہوا تھا

اوپر کے خط میں سید ہاشمی کا ذکر ہے۔ یہ ہاشمی فریدآبادی ہیں۔ انجمن ترقی اردو اور جامعہ عثمانیہ دونوں کے لیے تاریخ وسیرت وغیرہ کے عنوانات پر بہت کچھ لکھ ڈالنے والے، اس وقت حیدرآباد میں کسی عہدہ پر تھے۔[۱]

جب نومبر بھی آگیا اور میں نہ پہنچا، بلکہ بجائے اپنے صرف خطوط بھیجتا رہا۔ تو ۱۱ نومبر کو ذیل کا مکتوب محمد جعفری صاحب کے قلم سے ملا۔ یہ جعفری جامعی نئے بھرتی ہو کر آئے تو تھے ہمدرد کے اسٹاف میں ایک جونیر ممبر کی حیثیت سے، ترجمہ وغیرہ کے کام کے لیے، لیکن اس وقت کام مولانا کے پرائیوٹ سکریٹری کا کر رہے تھے:۔

"آپ کا مرسلہ لفافہ مولانا صاحب نے پڑھا، مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ میں جناب کی خدمت میں اس کا جواب لکھ دوں۔

مولانا آج کل بے انتہا مشغول ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ کا دو دن کا آیا ہوا خط آج انھوں نے پڑھا۔ کامریڈ کا سارا کام خود کرتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک رات تو لازمی جاگتے ہیں۔.............. اور کم سے کم ڈیڑھ دن برابر لکھتے رہتے ہیں۔ الحمدللہ ہمدرد جاری ہو گیا۔ آپ کی خدمت میں بھی پہنچا ہو گا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "اب آپ براہ عنایت فوراً تشریف لایئے۔ آپ کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ چند دن ہمدرد میں کام کرنے والوں کو راہ پر لگا کر کامریڈ کا کام دیکھئے گا۔ اور پھر سارے "بزی نس"[۲] (ان ہی کا لفظ ہے) کے آپ مالک و ذمہ دار ہوں گے۔" ہمدرد کے علاوہ ہم ۱ ۵ اسسٹنٹوں کے فاروق صاحب بھی گورکھپور سے آگئے ہیں۔ وہ بھی آپ کے بلانے پر اصرار

[۱] اس وقت (۱۹۵۲ء میں) کراچی میں کل پاکستان انجمن ترقی اردو کے روح رواں ہیں۔

[۲] Business یعنی کارخانہ یا کاروبار۔

کر رہے ہیں۔ مولانا صاحب تو تار آپ کے یہاں بلانے کیلیے بھیجنے کو لکھا چکے تھے۔ مگر فاروقی صاحب نے منع کیا۔ اور آخر میں پھر مجھے ہدایت کی گئی کہ ذریعہ تحریر آپ کو بلانے کو لکھوں۔ مولانا نے فرمایا ہے کہ اگر آپ اب چلے آدیں گے تو آپ کے خطوط کے جواب دینے کے لیے کسی کو متعین کرنے کی ضرورت ہی نہ ہو گی۔[1] آپ ایک دفعہ آجائیے اور تمام ولائتی ڈاک کو دیکھ لیجیے۔ جو جرائد و رسائل آپ کو پسند ہوں گے، ان کی فہرست دے دیجیے گا۔ اس کے بعد ہمیشہ آپ کی خدمت میں بھیج جایا کریں گے"۔

میں نے اپنے خط میں عرض کیا تھا کہ ولایتی اخبارات اور رسالوں کا منگانا ازبس ضروری ہے۔ کامریڈ کے لیے تو وہ بہرحال آئیں گے۔ میرے پاس چلے آیا کریں، تو میں ہمدرد میں بھی ان سے کام لوں۔ بعض مضامین ترجمہ کے قابل ہوں گے، بعض تلخیص کے اور بعض نقد و تبصرہ کے قابل۔

چیف سب اڈیٹر فاروقی صاحب قرار پائے، اور منیجر قرار پائے۔ ہمدرد کا دور اول دیکھے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں بھی خط لکھا۔ اور اپنے متعدد مضامین بھی اشاعت کے لیے روانہ کر دیے۔ کچھ اپنے نام سے، کچھ فرضی ناموں سے (اس وقت تک فرضی ناموں سے لکھنے کا مذاق طبیعت میں قائم تھا) مضامین میں مذہبی رنگ غالب تھا، اور اس میں نہ صرف اپنے بلکہ مولانا کے بھی مذاق طبیعت کی رعایت تھی۔ فاروقی صاحب ابھی تک "علی گڑھیت" اور "نیچریت" کے اثر سے بالکل آزاد نہیں ہوئے تھے۔ بہرحال ان کا خط ۲۰ نومبر کو حسب ذیل ملا۔

---

[1] میں نے مولانا کو لکھا تھا کہ آپ کو خود اتنی کہاں فرصت، آپ میرے خطوط کے جواب کے لیے اسٹاف کے کسی صاحب کی ڈیوٹی لگا دیجیے۔

"برادر محترم، سلام علیک۔

خط ملا۔ آمد کی خوشخبری جانفزا ہے۔ خود میں جن حالات کے ہوتے ہوئے یہاں چلا آیا، انھیں سنکر غالباً آپ بھی تھوڑا بار اپنے اوپر اٹھانا گوارا کریں گے۔ ہمدرد کی ادارتی ذمہ داریوں کو خیال کر کے گھبرا اٹھتا ہوں۔ یہاں جو لوگ میرے ساتھ شریک ادارت ہیں۔ وہ اگرچہ عام صحافت کا خاصہ تجربہ رکھتے ہیں۔ مولانا محمد علی کے ادبی معیار اور ہمدرد کے گزشتہ روایات سے بیشتر بیخبر ہیں۔ آپ کا عارضی طور پر آنا کم سے کم میرے لیے تو بے انتہا باعث تسکین ہوگا۔

آپ کی تحریروں میں آیندہ انشاء اللہ حسب ہدایت احتیاط کیجائے گی۔[1]

ایک عرض گستاخانہ بھی سن لیجئے۔ برائے خدا مشغولیت میں اتنا بھی غلو نہ فرمائیں کہ ہمدرد کے صفحے صرف مدرسوں اور خانقاہوں کی درسیات میں شامل ہونے کے لائق رہ جائیں۔ یہی شکایت مجھے مولانا محمد علی صاحب سے بھی ہے۔ یہ نہ خیال فرمائیے گا کہ آپ لوگوں کے مولانا ہو جانے اور اپنے صرف حاجی رہ جانے پر رشک ہے۔

"خدا کے لیے آیئے اور جلد آیئے" یہ مولانا محمد علی صاحب کے الفاظ ہیں۔ جن کا اعادہ کر رہا ہوں۔

محمد فاروق۔"

"صرف حاجی رہ جانے" میں تلمیح یہ ہے کہ ہمدرد میں ایک مستقل ظریفانہ کالم ملفوظات حاجی بغلول کے عنوان سے ہوتا تھا۔ اور یہ کالم عموماً فاروق صاحب ہی کے قلم سے نکلتا رہتا تھا۔ ہوتے ہوتے ہم لوگوں میں خود ان ہی کا نام "حاجی صاحب" پڑ گیا تھا۔

---

[1] اب بالکل خیال نہیں آتا کہ یہ احتیاط کس چیز کے متعلق تھی (۱۹۵۲ء)

عارف ہنسوی کے بھی ایک آدھ مد خط مولانا کی طرف سے اسی درمیان مین آتے رہے۔
ہوتے ہوتے دسمبر کی شروع کی تاریخین آگئین، جب مین دہلی پہنچ پایا، کئی دن کے
قیام کے ارادہ سے۔

وسط دسمبر کا زمانہ ہے۔ تاریخ غالباً ۱۵۔ سردی اور پھر دہلی کی سردی۔ کامریڈ کو
۱۹ ارکو نکلنا ہے۔ اور محمد علی کو بیلگام (علاقہ بمبئی) دیر سے دیر کر کے ۱۸ ارکو روانہ ہو جانا ہے،
اپنی صدارتِ کانگرس کا چارج گاندھی جی کو دینے، اور خود خلافت کانفرنس کا چارج
لینے۔ ہوائی جہاز اس وقت کہان تھے، تیز سے تیز ممکن سواری میل ٹرین تھی۔ کامریڈ
کے لیے ایک سطر بھی ابھی تیار نہین! ـــــ یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہ تھی۔
مدیر کامریڈ کی مصروفیتون کا روزانہ یہی نقشہ رہتا تھا ـــــ لیجئے ۱۵ ر کا دن بھی
تمام ہو گیا اور شام ہو گئی۔ کمپوزیٹر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہین اور پریس کے منیجر صاحب
اور ہیڈ پروف ریڈر دونون بھنائے ہوئے ہین کہ پرچہ وقت پر آخر کیسے نکل سکے گا
کمپوزیٹرون کو اجرت مفت کی مل رہی ہے، اور آخر وقت مین جب راتون رات
ان سے کام لیا جائے گا، تو Over Time یا زائد اجرت خواہ مخواہ
ہی دینی پڑے گی ـــــ یہ قصے بھی روز ہی رہتے تھے ـــــ شام ہوئی۔ رات
کے ۹ بج گئے، ۹½ ہو گئے۔ دسمبر کی رات، معلوم ہوتا تھا آدھی رات ہو گئی۔
میں تو ادھر آرام سے سونے لیٹا، ادھر دیکھا کہ ذیابیطس کے مریض اور کمزور محمد علی
خوب گرم اونی جسٹر پہن پہنا دفتر کے کمرہ مین آ بیٹھے۔ اور سکریٹری کی پکار ہوئی کہ ٹائپ رائیٹر
لے کر حاضر ہون۔ اب محمد علی تھے، اور اس غریب رامپوری ٹائپسٹ سکریٹری کی جان!

مضامین زبانی بولنے شروع کیے۔ دس بجے، گیارہ بج گئے، بارہ ہو گئے۔ شب بیدار اڈیٹر پر آمد مضامین کی ہو رہی تھی، اور غریب سکریٹری پر نیند کی۔ بیچارہ کب تک جاگتا، کہیں اونگھ گیا۔ بس پھر کیا تھا، لگی غضب کی ڈانٹ پڑنے کہ "شرم نہیں آتی۔ مجھے دیکھو کر بیمار ہوں، سن میں تم سے دوگنا ہوں، اتنی محنت کر رہا ہوں، تم تندرست ہو، جوان ہو، چند گھنٹے بھی نہیں جاگ سکتے، چلو ہٹو، میں خود اپنے ہاتھ سے کر لوں گا، تمھاری مدد کا محتاج نہیں ہوں"۔ غرض وہ صاحب بیچارہ نکالے گئے۔ اسٹاف کے ایک دوسرے صاحب جو اتفاق سے دفتر ہی کے ایک حصہ میں سو رہے تھے، یہ آواز سنکر جاگ پڑے تھے، وہ از راہ انسانیت خود اٹھ کر آئے، اور انھوں نے کام پورا کیا۔ صبح ۵۔۱/۲ ۵ بجے میری آنکھ کھلی۔ نماز فجر میں ابھی دیر تھی۔ آسمان پر بالکل اندھیرا چھایا ہوا تھا، دیکھتا کیا ہوں کہ اڈیٹر کا مریدہ کا کمرہ بجلی کے قمقمہ سے روشن اور عین اسی وقت مولانا آفس کے کمرہ سے اٹھ کر اپنی خوابگاہ کی طرف جاتے دکھائی دیے۔ راستہ میرے ہی کمرہ میں ہو کر تھا۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ "خیریت؟ ایسے ناوقت آفس کی طرف سے کہاں؟" معلوم ہوا کہ ساری رات کام کر کے اب یہ اللہ کا بندہ اٹھا ہے! ——— یہ شب بیداریاں، بدپرہیزیاں، بے اعتدالیاں، اچھے تندرست جوانوں کی صحت غارت کر دینے کو کافی تھیں، چہ جائے کہ ادھیڑ سن کا آدمی، فکر دل، پریشانیوں سے دبا ہوا، صدموں سے کچلا ہوا، بیماریوں سے لدا ہوا!

واقعہ کوئی استثنائی نہیں۔ مثال محض نمونہ کے طور پر بیان ہوئی ——— ہند اسلامی کا یہ محبوب لیڈر آہستہ آہستہ لیکن قطعی طور پر خودکشی کی طرف قدم بڑھائے جا رہا تھا!

باب (۲۸)

۱۹۲۵ء

(۱)

"امتحان ہیں ایک مشتِ خاک کے"

دسمبر کی سولھویں رات تو یوں گزری ہی تھی، سترہویں رات اور پھر اٹھارہویں رات بھی کچھ اسی طرح محمد علی کے حق میں دن بن کر گزری۔ انیسویں رات تھی، جب اول شب میں محمد علی بلگام کے لیے روانہ ہوئے ہیں۔ آخری پروف خود دیکھا کرتے تھے۔ موٹر اپنے پاس کہاں تھا، کسی کے ہاں سے منگوا لیا تھا۔ ریل کا وقت آگیا، اور پروف ریڈری ختم نہ ہو پائی، موٹر پر بیٹھے، تو اسٹیشن تک دیکھتے گئے۔ ریل پر بیٹھے ہیں، جب بھی اس میں مصروف! لیجیے اسیٹی ہوگئی۔ اور گاڑی چلی! اب چلتی ہوئی گاڑی سے مولانا کاغذات پھینک رہے ہیں، اور ان کے دفتر والے ریل کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے انھیں لے رہے ہیں! ——— یہ تھی کامریڈ کے کام کی نوعیت، اور یہ ایڈیٹر کامریڈ کے طریق کار کا ایک نمونہ!

کامریڈ کا کام تھا اتنا کہ ایک اچھے قابل اور جید استعداد کے نائب ایڈیٹر کا پورا وقت مانگ رہا تھا۔ ملک بھر کی لیڈری، کانگرسوں میں شرکت، کانفرنسوں کی صدارت جلسوں میں تقریریں، کمیٹیوں میں مباحثہ، یہ چیزیں تو خیر پھر بہت زاید اور بالکل الگ تھیں ہی۔ ہمدرد کی چیف اڈیٹری تک، جو اس سے ملتی جلتی ہی چیز تھی، وہ بھی کامریڈ کی

اڈیٹری کے ساتھ ملکر چلنا دشوار تھی۔ جتنی ولایتی ڈاک آتی، خصوصاً اسلامی ممالک اور اسلامی مسائل سے متعلق ہر ہفتہ ولایت سے حسب تعداد مین تراشے ہی مختلف ولایتی اخبارات اور رسالون کے آتے رہتے تھے، ان ہی کو پڑھنا، ان مین چھانٹ کر کامریڈ مین نقل یا نقد کیلیے انتخاب کرنا یہی ایک کام ایسا تھا، جو ہفتہ مین پورے دو دن کا وقت لے لیتا۔ پھر نوٹ لکھنا، مقالہ تیار کرنا، مراسلون کی دیکھ بھال رکھنا، مراسلہ نگارون سے مراسلت کرنا، پرچہ کے آخری پروف دیکھنا، یہ سارا کام اتنے پھیلاوے کا تھا کہ ایک کیا معنی، اگر دو اچھے قابل مددگار ہوتے، جب جاکر انجام پا سکتا تھا ——— مسلمانون کی قسمت میں یہ کہان تھا؟

محنت کا نمونہ آپ دیکھ چکے۔ اب ایک سرسری اندازہ مصارف کا لگاتے چلیے۔ ۱۹ر کا پرچہ تو جون تون نکل گیا۔ اب ۲۶ر کے پرچہ کے لیے کیا ہو؟ اس کے لیے منقولات و اقتباسات کا ذخیرہ تو خیر چھوڑ گئے تھے، کچھ جگہ "مکتوب لندن" سے بھر ہی گئی، اور کچھ گاندھی جی کے خطبۂ صدارت سے۔ لیکن ایڈیٹوریل کے نام سے ایک آدھ کالم کیا معنی، ایک سطر بھی موجود نہین! محمد علی کو بلگام پہنچ کر کانگرس اور خلافت دونون کی سبجکٹس کمیٹی، ورکنگ کمیٹی، اُس کمیٹی، اِس کمیٹی سے مہلت بھلا کہان مل سکتی تھی۔ اب اسے ان کی کرامت کہیے یا اعجاز کہ ۲۴ر دسمبر کو خدا معلوم کہان بیٹھ کر اور دن رات کے ۲۴ گھنٹون مین سے کونسا وقت نکال کر، عین ہنگامون کے شباب مین، ایک زبردست مقالہ سوا سات، ساڑھے سات کالم کا لکھ ڈالا ——— لیکن اب اسے بھیجین تو کیسے بھیجین؟ کہان بلگام کہان دہلی! حیرت کے کانون سے سنیے اور ماننے کا دل چاہے یا نہ چاہے، بہرحال یقین بھی فرما لیجے کہ کامریڈ کے اسی مفلس و قلاش ایڈیٹر نے (جو "قوم" ہی

کے بقول قومی چندہ کھاتا رہتا اور ہضم کرتا رہتا تھا!) اتنا طویل و عریض مضمون سارے کا سارا تار پر اپنے پرچہ کے لیے روانہ کیا! ——— ستم پر ستم یہ کہ ۲، ۲ ½ کالم کے قریب مضمون ۲۴ کو روانگی سے رہ گیا، وہ ۲۵ کو روانہ ہوا۔ ۲۵ دسمبر کو بڑے دن (کرسمس) کی تعطیل تار گھر، ڈاکخانہ، سب ہی کہین ہوتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۵ کو ان دو ڈھائی کالمون کے مضمون کی فیس اکسپرس تار کی شرح سے دوگنی دینی پڑی!

ان شاہ خرچیون کی ہمت اچھے اچھے سرمایہ دار اور روپیہ والے اخبار بھی مشکل ہی سے کر پاتے۔ لیکن اس دیوانۂ ملت کو، جوش و اخلاص کے پتلے کو، کام کی دھن مین خدمتِ ملی کے جنون مین جس طرح نہ اپنی صحت کی پروا تھی نہ اپنے آرام کی نہ اپنے وقت کی، اسی طرح اپنے پیسہ کی پروا بھی کب تھی ؟ ——— اس کی قوم کا کام تو صرف اعتراض کرنا، دل خراش، دل آزار، دل شکن نکتہ چینی کرنا، طنز و تعریض کرنا تھا۔ بجز آس پاس رہنے والون کے اور کسی کو کیا علم، کہ یہ مخلص خادم قوم و ملت کے لیے روزانہ کس کس طرح اپنا جگر خون کرتا رہتا!

یہی زمانہ یعنی شروع جنوری ۲۵ء کا تھا، جب لکھنؤ مین بعض قدیم دوستون کی صلاح و مشورہ سے ایک اپنا مستقل ہفتہ وار نکالنے کی ٹھہری۔ نام عام فہم سچ قرار پایا۔ اڈیٹری پر نام تین آدمیون کے رہے۔ مولوی ظفر الملک علوی اڈیٹر الناظر (جو سچ کے مینجر اور گویا "مالک" بھی تھے) اور مولانا عبد الرحمٰن ندوی نگرامی اور تیسرا یہ خاکسار۔ شروع شروع مولوی عبد الرزاق خان ندوی ملیح آبادی بھی (جو بعد کو کلکتہ جا کر کچھ سے کچھ ہو گئے) ہر مشورہ مین شریک بلکہ پیش پیش رہے۔

مولوی ظفرالملک تو چھ مہینہ کے بعد اڈیٹری سے الگ ہو کر صرف منیجر رہ گئے، اور بگرامی مرحوم کوئی ۱۳ مہینہ کے بعد عین جوانمرگی میں رحلت فرما گئے۔ اور پرچہ کی باگ تمامتر میرے ہی ہاتھ میں آگئی۔ بہرحال شروع میں یہی پرچہ بڑی حد تک میرا تھا۔ سچ اس وقت گاندھی جی اور علی برادران کے مسلک کی تقلید میں ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار اور برطانیہ کے خلاف ہر قسم کی ترکِ موالات کا نقیب تھا۔ مضامین کا بڑا حصہ ہمیشہ مذہبی رنگ کا ہوتا تھا۔ اخلاقی اور دینی اصلاح اس کے خاص مقاصد میں داخل تھی اور طرزِ تحریر میں شروع شروع ایک عرصہ تک کوشش اس کی رہی کہ گاندھی جی کے ینگ انڈیا کی تحریروں کی سادگی وسلاست کا نقشِ ثانی اردو میں پیش ہوتا رہے ——— "اردوئے معلی" کی مشق کچھ روز تک اس "اردوئے ہند" (کانگرسی اردو یا ہندیائی ہوئی اردو) کے آگے ملتوی رہی!

اپنا وقت جتنا سچ کے لیے صرف کرتا، اس سے کچھ زائد ہی ہمدرد کے لیے بھی نکالتا۔ اور دریاباد کے گوشہ تنہائی میں بیٹھے بیٹھے جتنی بھی خدمت ممکن ہوتی، اپنی بساط کے لائق دونوں کی کرتا رہتا۔ ہمدرد کے لیے مستقل مضامین الگ لکھکر بھیجتا رہتا، ہر پرچہ کے لیے قرآن مجید کی ایک آیت مع تشریحی ترجمہ کے دیتا۔ اور سچ کے متعدد مضامین ہمدرد خود بھی اپنے ہاں نقل کرتا رہتا۔ فاروق صاحب عرصہ تک جمنے والے نہ تھے۔ ایک طویل مدت کے لیے وطن جا چکے تھے، اور اب ہمدرد کے شعبۂ ادارت میں سب سے سینیر اور با اختیار عارف ہنسوی تھے۔ انہی کے خط کبھی اپنی طرف سے اور کبھی مولانا کی طرف سے بکثرت موصول ہوتے رہتے۔ ہفتہ وار تو بہرحال اور کبھی اس سے بھی جلد جلد ——— دو ایک خط ان کے ملاحظہ ہوں۔ ان سے ہمدرد اور "ہمدردیات" پر اچھی خاصی روشنی پڑے گی۔

۲۰ رجنوری ۳۵ء کا مکتوب:

"مضامین پہنچے۔ فاروق صاحب پھر آج کل گورکھپور گئے ہیں۔ جوش[1] صاحب کا مضمون ان ہی نے دیکھ کر دیا تھا اور انھیں افسوس ہے کہ ایک ایسا فقرہ رہ گیا جو نامناسب تھا، آیندہ ایسی غلطی نہ ہوگی۔

ہیچ سے ہندو مسلم اتحاد والا مضمون آج نقل ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ آج کل کام بہت کرنا پڑتا ہے اس لیے کہ صرف[2] چار آدمی ہیں"۔

افغانستان سے عین اسی زمانہ میں خبر آئی کہ دو "احمدی" (قادیانی) بہ الزام ارتداد سنگسار کر دیے گئے۔ ہندوستان کے بیشتر بلکہ تقریباً سب ہی علماء نے اس کی پرزور موافقت کی، اور حکومت افغانی کے اس طرزِ عمل کی تحسین و تصویب سے اردو کا سارا مسلم پریس گویا گونج اٹھا۔ مولانا محمد علی وجوب قتل مرتد کے قائل نہ تھے۔ اور ان کے دونوں اخبارات نے سب سے ہٹ کر کابل گورنمنٹ پر نکتہ چینی کی روش اختیار کی۔ اور مذہبی دلائل بھی قتل مرتد کے خلاف دینے شروع کیے ——— میں خود اس وقت اس مسئلہ میں متردد و مذبذب تھا اور کوئی قطعی بات اپنے قلم سے لکھنا نہیں چاہتا تھا، اصلی سوال اس وقت نہیں، بہت بعد کو خیال آیا کہ نفس قتل مرتد کے بجائے یہ رکھنا تھا کہ قادیانی اسی معنی میں مرتد ہیں بھی جس معنی میں مرتد واجب القتل ٹھہر جاتا ہے۔ بہر حال اس وقت تو ۱۲ر فروری کو

---

[1] مراد جوش ملیح آبادی نہیں، بلکہ سلطان حید رجوش (علیگ) بدایونی ہیں، جو اس زمانہ میں مجھ سے ناخوش تھے،

[2] یہ "صرف" کا لفظ عارف صاحب کی زیادتی تھی، عام معمول اس زمانہ میں ادو روزناموں میں صرف تین شخصوں کا تھا" ایک اڈیٹر، ایک مددگار، ایک مترجم یا ایک اڈیٹر اور دو مترجم۔ ہمدرد میں تو اس حال میں بھی علاوہ مولانا کے چار آدمی تھے

عارف صاحب نے یہ لکھا :۔

"مکتوب گرامی موصول ہوا۔ مضامین کی رسید عرض ہی، فاروق صاحب ابتک نہین آئے اور نہ آخر مارچ تک آئین گے۔ آج کل صرف چار آدمی ہین۔ فاروقی صاحب کی عدم موجودگی تکلیف دہ ہے۔

کابل مین پھر دو احمدی سنگسار کر دیے گئے۔ قتل مرتد کے وجوب یا عدم وجوب کے متعلق ایک مدلل مضمون کی ضرورت ہے۔ اور آپ ہی سے درخواست کی جاسکتی ہے۔ ہمدرد اس کے خلاف آواز بلند کر رہا ہے۔ خدا معلوم آپ کی کیا رائے ہے۔ آپ قتل مرتد کے قائل اور احمدیوں کو مرتد اور واجب القتل سمجھتے ہین یا نہین۔ اگر آپ کتاب و سنت کی بصیرت سے قتل مرتد کے خلاف نتیجہ پر پہنچین، اور قادیانیون کو بھی مرتد نہ تصور کرتے ہون تو ضرور ایک مدلل مضمون ارقام فرمایئے۔ ہمدرد تو اس کے خلاف آواز اٹھا رہا ہے۔ باقی حالات بدستور۔ اشاعت نہین بڑھ رہی ہے"۔

یہ سب سے آخر کا ذرا سا فقرہ بہت پر معنی تھا۔ "چٹپٹے" مضامین ہمدرد مین بھلا کہان، جن کی ہر طرف مانگ تھی نہ "دلپسند" خبریں، نہ بھڑکا دینے والی سرخیان، نہ گرما گرم نوٹ۔ خود یہ قتلِ مرتد کے مسئلہ مین مخالفانہ پہلو لینا مسلمانون مین کب مقبول ہو سکتا تھا۔ یہی غنیمت ہے کہ اس کی سزا مین ہمدرد کا بائیکاٹ (مقاطعہ) ہی فوراً شروع نہین ہو گیا۔

دوسرا خط اسی سے متصل، ۱۹ر فروری کا لکھا ہوا :۔

"جن صاحب کا خط آپ نے بھیجا تھا، ان کی نسبت مولانا فرماتے ہین کہ وہ کام نہ دے سکین گے اور سکھانا میرے لیے سخت دشوار ہے۔ اس وقت بھی دو ایسے آدمی ہین جن سے بجائے مدد ملنے کے وقت ضائع ہوتا ہے۔

ارتداد کے متعلق مضامین[1] آپ نے دیکھے ہوں گے۔ یہ میرے لکھے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ
میں ٹھیک طور پر نہیں لکھ سکتا۔ ادھر ادھر سے لیکر کچھ لکھ دیا گیا ہے۔ مولانا عبدالحیٔ صاحب[2]
کو میں بھی لکھ رہا ہوں۔ متعصب مولویوں کی پرواہ اس معاملہ میں نہیں کی جا سکتی۔

"اخبار نویسی" والا لیڈنگ آرٹکل میرا ہی تھا۔ اور قریب قریب تمام ایڈیٹوریل
میرا ہی ہوتا ہے۔ غلطیاں بہت رہ جاتی ہیں۔ اس کا سخت افسوس ہے۔ خطبہ والا مضمون
لیڈر بنا دیا گیا[3]۔ غالباً کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔"

---

[1] مراد وہی قتل مرتد کے سلسلہ کے مضامین ہیں۔ [2] مراد مولوی خواجہ عبدالحیٔ صاحب فاضل دیوبند،
استاد جامعہ ملیہ ہیں، ان سے توقع کی تھی کہ مسلک جمہور کے خلاف قتل مرتد کے مسئلہ میں ہمدرد کے ہمنوا ہو جائیں گے۔
[3] سچ میں "خطبۂ جمعہ کی زبان" پر میرا مقالہ نکلا تھا۔ اسی کو ہمدرد کا بھی لیڈر بنا دیا گیا ہے۔

باب (۲۹)

۱۹۲۵ء (۲)

"دریا یاد کی دریا دلی"

اب بڑی آسانی تھی۔ بڑے ہندوؤں یا انگریزوں کے لیے جو کچھ لکھوانا چاہتا، محمد علی کو ایک کارڈ میں لکھ دیتا یا جب دہلی جاتا تو زبانی کہہ آتا، اور کامریڈ میں بہترین انداز کے ساتھ، اس پر نکل جاتا۔ دہلی اب جلد جلد آنا جانا رہتا ہی تھا، کوئی ہر تیسرے چوتھے مہینے۔ اور مولانا سے ان وقفوں کے درمیان لکھنؤ میں جو ملاقاتیں ہو جاتیں وہ ان کے علاوہ۔ سچ اور مدیر سچ دونوں کا ہمدرد سے گہرا تعلق بدستور قائم تھا، بلکہ تعلق روزافزوں۔

عارف صاحب شروع مارچ کے خط میں لکھتے ہیں:۔

"آپ کا کارڈ مولانا کو دیدیا گیا۔ وہ کامریڈ میں اس کے متعلق لکھیں گے۔ اس کے بعد ہمدرد میں اس کو دیکھ کر لکھا جائے گا۔ غالباً گاندھی جی کو غلط فہمی ہوئی۔ وہ قرآن کے متعلق یہ سمجھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ رسول اللہ کی تصنیف ہے، اور اس میں غلطی کا امکان نہیں ہے؛ یا قرآن کا حرف حرف واجب التعمیل نہیں۔ خیر اس کے متعلق لکھا جائیگا۔[۱]"

[۱] اب مطلق یاد نہیں پڑتا کہ مولانا کو توجہ کس مسئلہ پر دلائی گئی تھی۔ باقی اتنا تو ظاہر ہے کہ اس کا تعلق گاندھی جی کی کسی مذہبی غلط فہمی سے تھا۔ (۱۹۵۲ء)

میری ایک گذارش ہے جو یہ ہے کہ آج کل اسٹاف بہت کم ہے۔ صرف چار آدمی ہیں، اور سارا اڈیٹوریل مجھی کو لکھنا پڑتا ہے۔ اور کسی کسی دن لکھا لکھایا اڈیٹوریل ضائع کر دینا اور فوراً دوسرا لکھنا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے اخبار میں دیر ہونے کے علاوہ مجھ کو بھی سخت اذیت ہوتی ہے، کیونکہ فوراً لکھنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اس لیے گذارش ہے کہ تین چار ایسے مضامین جناب لکھ کر بھیج دیں جو غیر موقت ہوں، اور اگر سال بھر بھی وہ شائع نہ کیے جائیں تو کوئی حرج نہ ہو۔ جیسا کہ آپ نے سچ میں ابھی ایک مضمون لکھا تھا جس کو ہمدرد میں بھی نقل کیا گیا تھا۔ غالباً مسلمان اور خدا کی غلامی پر تھا۔ اگر اسی قسم کے دو چار مضمون محفوظ رہیں تو بہت اطمینان نصیب ہو جائے۔ جناب نے بہت دنوں سے ہمدرد کے لیے کچھ نہیں تحریر فرمایا"۔

قتلِ مرتد پر سلسلۂ بحث گرم تھا اور فرنگی محل، دیوبند، وغیرہ سارے طبقاتِ علماء کے مقابلہ میں ہمدرد ابھی تک جما ہوا تھا۔ ہمدرد کے مضمون تو خیر اوسط درجہ کے ہوتے تھے، لیکن خود مولانا کے قلم سے کا مرید میں مضمون خوب نکلا تھا۔ مولانا کا نقطۂ نظریہ تھا کہ احادیث میں جس ارتداد کی سزا قتل آئی ہے، وہاں مجرد بدعقیدگی مقصود نہیں، بلکہ بدعقیدگی سے بغاوت مراد ہے، اور اس ضمن میں خود حدیث کے مرتبہ و مقام سے بحث بڑی دلچسپ تھی۔ بحث کے دوسرے جزو، یعنی آیا قادیانی (احمدی)، مرتد ہیں یا نہیں۔ اس سے مولانا نے تعرض ہی نہیں کیا تھا۔ بہرحال اس انگریزی مقالہ کے حسنِ انشاء، زورِ استدلال اور حدیث فہمی کی داد میں نے مولانا کو بے اختیار لکھ بھیجی تھی۔ اس کے جواب میں عارف صاحب کا مکتوب مورخہ ۱۹ مارچ :-

"مولانا فرماتے ہیں کہ جو تعریف جناب نے فرمائی ہے میں اس کا مستحق نہیں ہوں بلکہ

مین نے تو جو مواد مجھ کو دوسرون سے ملا، بس اس کو ترتیب دیدیا۔ مجھے تو زیادہ تر امداد اپنے ہمنام مولوی محمد علی صاحب لاہوری سے ملی ہے[1]۔ مولانا صاحب یہ بھی فرماتے ہین کہ آپ براہ کرم قتلِ مرتد کے متعلق جس قدر احادیث و اقوالِ ائمہ[2] ہین وہ سب بھیجدین۔ وہ اس مسئلہ کو ادھورا چھوڑنا نہین چاہتے۔ مگر فی الحال ہمدرد مین اس پر بحث کا ارادہ ملتوی ہے۔ اس لیے آپ کا مضمون اور دوسرے بزرگون کے مضامین بھی روک لیے ہین کہ جب پوری طرح اظہار خیال دوسرے لوگ کرلین اس کے بعد ہمدرد اس کو شروع کرے۔

فاروق صاحب کا کوئی پتہ نہین۔

مین نے کسی سابق عریضہ مین گزارش کی تھی کہ چند ایسے مضامین جو موقت نہ ہون اور بلا قید زمانہ و موسم ہر ایک وقت کام دے سکین مرحمت فرمایئے تاکہ وہ محفوظ صیغہ مین رکھے رہین۔ اور اگر ضرورت اچانک پیش آجائے تو ان سے کام لیا جاسکے۔ سچ کا گزشتہ پرچہ جس مین ہندو مسلم اتحاد کے متعلق دوسرا مضمون شائع ہوا ہے وہ مولانا کے پاس سے گم گیا ہے، اس لیے براہ کرم بھجوا دیجیے۔"

عین یہی زمانہ تھا یعنی مارچ کا آخری ہفتہ (اور ماہ مبارک رمضان کی کوئی شروع کی تاریخ) کہ مجھے محسوس ایسا ہوا کہ قلب کے مرض کا دورہ کسی سخت قسم کا پڑا ہے۔ اور ایک صبح کو تو یہ معلوم ہوا کہ جیسے اب دل کی حرکت رکی سی جارہی ہے۔ محمد علی یہ خبر پاکر قدرۃً بہت متاثر ہوئے۔ اور انھین گمان یہ گزرا کہ مین بعض مشائخ اور اہل طریق کی صحبت مین رہ کر، اور ان کے ملفوظات وغیرہ سے متاثر ہوکر تقلیلِ غذا وغیرہ کچھ

---

[1] یہ اشارہ مولانا محمد علی لاہوری کی کتاب مقام حدیث کی طرف ہے، جس مین حجیتِ حدیث پر بڑی سلجھی ہوئی گفتگو موجود ہے۔ [2] "ائمہ" سے مراد اہل سنت کے ائمۂ فقہ ہین۔

بہت زائد کرنے لگا ہوں اور یہ اسی کا اثر ہے ——— عارف صاحب کا خط حسب ذیل آیا:-

"آپ کی ناسازیٔ طبع کا حال معلوم کر کے سخت افسوس ہوا۔ واقعی قلبی امراض میں اس قدر طوالت باعثِ تشویش ہے۔ مگر خدا کے لیے دوا علاج کی جانب توجہ فرمائیے دعا کے ساتھ دوا بھی ضروری ہے۔ مسلمان پر کچھ حق اس کے جسم کا بھی ہے، کل ہی میں نے بخاری شریف کتاب الصوم میں دیکھا ہے کہ اپنے بدن کا حق بھی مسلمان کو ادا کرنا چاہیے میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ محنت اور شب بیداری کی کثرت و تطویل زیادتی مرض کا باعث ہے۔ مجھے تو جب سے جناب سے نیازمندی کا شرف حاصل ہوا ہے میں ایک قسم کا فخر و غرور محسوس کرتا ہوں، اور اس حالت کو سن کر سخت تشویش پیدا ہو گئی ہے۔ خدائے تعالیٰ جلد صحت عطا فرمائے۔

جناب کا خط پڑھ کر مولانا سخت متاثر ہوئے۔ اور جواب لکھنے کے لیے انھوں نے خط رکھ لیا ہے۔ ان کی بھی یہی رائے ہے کہ اپنے جسم کا حق آپ کو ادا کرنا چاہیے۔ خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ جناب کو صحتِ کلی عطا فرمائے۔"

ایک لطیفہ بھی اسی سلسلہ میں سن لیجئے۔ حالانکہ اس کے درج کرنے کا اصل موقع کئی ورق قبل تھا ——— ۲۳ء کے آخر میں مولانا کا مہمان ہو کر علی گڈھ پہنچا تو اگرچہ تقلیلِ غذا وغیرہ کے بعض معمولات کچھ تھوڑے بہت اس وقت جاری تھے لیکن چائے کا غیر معمولی شوق بھی اس زمانہ میں تھا۔ پیالیوں پر پیالیاں، بلکہ چائے دان پر چائے دان خالی کر دیا کرتا تھا۔ سفر میں ایک مستقل سماور ساتھ رکھے ہوئے تھا۔ صبح کے ناشتہ پر مولانا کی نظر اس سفری سماور پر جو چائے سے لبالب تھا، پڑی۔ معاً ہنس کر بولے

"دیکھیے، شیطان بھی بڑا اوپّین ہے، آخر اپنے لیے راستہ ڈھونڈھ ہی لیا نہ۔ اب آپ تک اسی سماور کی ٹونٹی کے راستہ سے پہنچے گا۔"

محمد علی سے تعلقات تو اتنے تھے، اور لکھنؤ وہ بار بار آتے ہی رہتے۔ پر دریاباد تشریف لانے کی نوبت کبھی نہ آتی۔ میں ہی ہمیشہ چل کر لکھنؤ آجایا کرتا تھا، اور ایک خادم کو مخدوم کے لیے یہی کرنا چاہیے بھی تھا۔ لیکن محمد علی تو اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ چاکروں کا بھی لحاظ رکھتے تھے۔ خود ہی لکھنؤ آکر کئی بار فرمایا کہ "دریاباد اب چلتا ہوں" اور "اب کی ضرور چلونگا" میں بھی ہر مرتبہ معذرت کر دیتا، اور یہ واقعہ عرض کر دیتا کہ "جی نہیں، میرا غریب خانہ آپ کے چلنے کے قابل نہیں۔ جب خود ہی بلاؤں گا، آیئے گا۔" ——— واقعی ہر بار شرم ہی آکر دامنگیر ہو جاتی تھی۔

جون میں خیال آیا کہ آخر پار سال علی برادران بڑے گاؤں کو مشرف کر چکے ہیں، اب کی برسات میں "آموں کی دعوت" پھر رہے ہے، اور ابکی باری دریاباد کی آئے، کچھ نذرانہ پیش کرنے کا بھی تہیہ کر لیا۔ خط و کتابت شروع کی۔ بڑے بھائی مولانا شوکت علی تو چندہ کی چاٹ میں چٹ سے راضی ہو گئے، اور نیم وعدہ محمد علی نے بھی کر لیا۔ مقصود تو ان ہی کو بلانا تھا، بڑے بھائی کو تو کچھ شرما شرمی ہی شریک کر لیا گیا تھا۔ لیکن کامریڈ واقعی محمد علی کے لیے زنجیر پا بنا ہوا تھا۔ عارف صاحب کے ۲۲ جون کے خط میں ہے:-

مضامین کا شکریہ۔ مولانا صاحب نے آموں کی دعوت کے متعلق صرف یہ جواب دیا ہے کہ کامریڈ کو کیا کروں۔ مولانا شوکت علی صاحب کب آرہے ہیں۔ ان کی تاریخ آمد معلوم ہو تو پھر یاد دہانی کروں گا۔ مگر آثار ایسے نظر آتے ہیں کہ بقر عید سے پہلے یہاں سے نکلنا

ناممکن ہوگا۔ کیونکہ یہاں ان کا اس موقع پر رہنا ضروری ہوگا۔"

جولائی کا شاید دوسرا ہفتہ تھا جب مولانا شوکت علی تنہا وارد دریاباد ہوئے۔ قصبہ مین استقبال خوب دھوم دھام سے ہوا۔ اور مجمع یہاں کی تاریخ میں بے نظیر رہا۔ جلوس، جلسہ، تقریرین سارے ہی لوازم پورے ہوئے۔ چندہ بھی قصبہ نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر دیا، ساڑھے سات سو کی رقم پیش کر دی تھا۔ جو ۲۲ء کے گرمجوشی کے نہین، ۲۵ء کی ٹھنڈک کے موسم مین غیر معمولی رقم سمجھی گئی۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن دل کی خوشی ادھوری ہی رہی۔ اس لیے کہ بالآخر آمادہ ہو جانے کے باوجود محمد علی عین وقت پر اپنی علالت کے باعث قابلِ سفر نہ ہو سکے۔ ——— آہ! اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اصلی خوشی تو ان ہی کے خیر مقدم کرنے کی تھی۔

ہمدرد میں "دریاباد کی دریادلی" کے عنوان سے ایک دلچسپ نوٹ بھی نکلا کہ دریاباد[1] کے مسلمانون نے تو یہ نذرانہ مولانا محمد علی کی خدمت کے لیے فراہم کیا تھا۔ مولانا شوکت علی خواہ مخواہ پہنچ گئے اور ساری تھیلی پر بلا تقسیم و شرکت خود قابض ہو گئے شوکت صاحب نے اپنے اخبار خلافت مین اس کا جواب اسی انداز مین دیا ——— دونوں بھائیون کے اخبارون میں یہ نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔

عارف صاحب کے ۱۲ر جولائی والے خط مین ہے:۔

"دریاباد کی دریا دلی کا جواب بھی مولانا شوکت علی کا لکھا ہوا نظر سے گزرا ہوگا۔ محرم والا مضمون ۸ر و ۹ر محرم کے ہمدرد مین لیڈنگ آرٹیکل کی صورت مین نکلے گا۔"

[1] ہمدرد مین میرے بکثرت مضامین بغیر میرے نام کے نکلے ہین، کبھی لیڈنگ آرٹیکل بن کر، کبھی مراسلات وغیرہ مین کسی فرضی نام سے۔

اس مضمون نے مجھ کو زحمت سے بچا لیا۔ شوکت صاحب سے تھیلی کا تقاضا کیا گیا مگر آپ جانتے ہین کہ روپیہ پر بڑے بڑون کے پاؤن ڈگمگا جاتے ہین۔ ایک نوٹ اس چھین جھپٹ پر بھی لکھا جائے گا۔

کل علی برادران امرتسر گئے۔ مولانا محمد علی کا باوجود ضعف و نقاہت کے یہ سفر کرنا اچھا نہین مگر وہ نہ مانے"۔

کیسے مانتے۔ اطلاع انھین یہ مل چکی تھی کہ ڈاکٹر کچلو وغیرہ اکابر پنجاب سب خلافت کمیٹی کے مقابلہ مین صف آرا ہو گئے ہین۔ اب صحت وغیرہ کا خیال کب مانع راہ بن سکتا تھا۔

باب (۳۰)

سنہ ۱۹۲۵ء (۳)

(ملّت کی طرف سے "قدر دانی")

اگست کا آخری ہفتہ تھا اور میں مولانا کے یہاں مقیم۔ خبر ملی کہ مولانا کی بڑی صاحبزادی (زہرہ بی صاحبہ زاہد علی خان) کا بچہ عارف رامپور میں سخت علیل ہے۔ مولانا کو اپنے بچوں بچیوں میں نہیں کون محبوب تھا، لیکن یہ پیارا نواسہ تو شاید سب ہی سے بڑھ کر عزیز و محبوب تھا۔ رامپور میں داخلہ ممنوع تھا۔ جاتے تو کیسے جاتے۔ تڑپ کر رہ گئے۔ معلوم ہوا "ہز ہائینس نواب صاحب فرزند دلپذیر سلطنت انگلشیہ" بمبئی میں ہیں۔ ان کی خدمت میں داخلہ کی اجازت کے لیے، ایک لمبا اور موثر تار بمبئی لکھا۔ ابھی یہ تار جانے بھی نہیں پایا تھا کہ رامپور سے بچہ کی وفات کا تار آگیا! اب محمد علی سارا کام کاج چھوڑ پہلی ٹرین سے رامپور روانہ ہوئے کہ اسٹیشن ہی پر بیٹھے بیٹھے دفن سے قبل لخت جگر کا ایک بار دیدار کر لیں گے اور گھر کہلا بھیجیں گے کہ معصوم کی میت کو کئی میل کا چکر دے کر پہلے اسٹیشن لائیں۔ پہنچے تو معلوم ہوا کہ تدفین ہو چکی ہے! اناللہ۔ اسٹیشن پر چند گھنٹے ٹھہر، اور رو دھو کر پہلی ٹرین سے

دہلی واپس آگئے ـــــ مولانا کی روئداد زندگی ہیں یہ ناکامی در ناکامی، حسرت در حسرت کی کوئی انوکھی اور نرالی مثال نہیں!

آتے ہی دوسرے دن پانی پت چلنے کی ٹھہری ـــــ ان مسلسل سفروں کے بعد کامریڈ کا بس خدا ہی حافظ تھا ـــــ بلووں ہنگاموں کی ہوا تو چلی ہوئی تھی ہی، پانی پت میں (جو دہلی سے کوئی ۵۰، ۵۵ میل کے فاصلہ پر ہوگا) یکم اگست کو قربانی گاؤ کے سلسلہ میں شدید ہنگامہ ہو چکا تھا، اور پانی پت کے مسلمان مصر ہوئے کہ مولانا اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ ایسے ایسے ہنگامے خدا معلوم کتنے مقامات پر ہو چکے تھے، اور روزانہ ہوتے ہی رہتے تھے۔ کسی آل انڈیا لیڈر کے پاس اتنا وقت کہاں سے آسکتا تھا کہ ہر شہر اور قصبہ کے مقامی فساد اور بلووں سے اتنی دلچسپی لے۔ لیکن محمد علی کے ہاں مسلمانوں کا کوئی معاملہ چھوٹا معاملہ تھا ہی نہیں۔ کسی ادنیٰ سے مسلمان کو دنیا کے کسی گوشہ میں تکلیف پہنچ جائے، اور محمد علی اس کے لیے بےچین ہو رہے ہیں، مضطرب پھر رہے ہیں۔ ہر ہر واقعہ کی تحقیق کا اہتمام اس پر مستزاد۔ جب روئداد کے ایک ایک جزئیہ کی خود پوری تنقیح نہ کرلیں، دم نہ لیں۔ اور بغیر ان سارے مراتب کو طے کیے اس موضوع پر لکھنا لکھانا حرام سمجھیں ع

معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے!

رات دن اگر ۲۴ گھنٹہ کے بجائے ۴۸ گھنٹے کے ہونے لگتے۔ جب بھی اتنی فرصت کہاں سے ہاتھ آسکتی تھی۔ بات موٹی سی تھی۔ لیکن محمد علی کے ہاں مسلمان کی تکلیف کے بعد عقل مصلحت سنج کیا ہر دور اندیشی غائب! پانی پت چلنے کے لیے بےقرار۔ کامریڈ کا

ایک ہفتہ یوں ہی پچھڑا ہوا تھا، یہ رامپور سے آتے ہی دوسرے دن کامریڈ کے اسسٹنٹ[۱]
ایڈیٹر کو ہمراہ لے پانی پت روانہ ہو گئے۔ رفاقت سفر کی سعادت مجھے بھی حاصل۔ چلنے
لگے تو جیب میں دام نہیں۔ پانی پت کا فاصلہ ہی کیا۔ لیکن کرایہ وہاں تک کے لیے
بھی سکنڈ کلاس کا تو خیر کیا نکلتا۔ تھرڈ کلاس کا بھی بس جوں توں ہی نکل پایا!
—— یہ تھا، ۸ کروڑ مسلمانوں کا سب سے بڑا لیڈر "چندہ کا لاکھوں روپیہ
اڑا جانے والا" لیڈر!

برسات کی گرمی اور امس، دوپہر کا وقت، تیسرے درجہ کی ایک کھچا کھچ
بھری ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر عبدالمجید خواجہ مل گئے۔ دل نے
کہا کہ شاید یہ ٹکٹ تھرڈ سے سکنڈ کا تبدیل کرا دیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے خواجہ خود
بھی اس وقت تہی دست ہو رہے تھے۔ "ترک موالات" کے ماتحت بیرسٹری تو بہرحال
چھوڑے ہی ہوئے تھے۔ خیر کوئی دو گھنٹہ میں پانی پت پہنچ گئے۔ ایک شکستہ حال سا
تانگہ اسٹیشن پر ملا۔ اسی پر تینوں آدمی سوار ہو چلے —— لیڈر کا استقبال ہمیشہ جلوسوں
اور نعروں، موٹروں اور جوڑیوں ہی سے نہیں ہوتا —— بازاروں سے ہوتے
ہوئے پہلے شاہ بوعلی قلندر کے مزار پر حاضر ہوئے، اور پھر مولوی حافظ لقاء اللہ صاحب
عثمانی کے ہاں آکر ٹھہرے۔ عصر کے وقت سے مولانا کا گشت پیدل شروع ہوا۔ مسلمانوں
کا ایک جم غفیر ساتھ، ہندو بھی جابجا شریک ہوتے گئے۔ پکے اور کچے راستوں کی خاک

---

[۱] اس وقت تک میں انھیں ایک عام ملی خادم و کارکن سمجھتا تھا۔ ان کے بے پناہ اخلاص اور
جوش دینی کا اندازہ کئی سال بعد ہوا۔

چھانتے اور خاک پھانکتے۔ پسینہ میں ہم سب لت پت۔ آگے آگے مولانا، قصبہ کی وہ تمام سڑکیں، گلیاں، پگڈنڈیاں دیکھ رہے ہیں، جنکی بابت نزاع ہو چکی، یا آیندہ احتمال نزاع تھا۔ اور سوالات کی بھرمار کرتے جاتے ہیں، میں قلم گھسنے کا عادی، اور فلسفۂ مشائی سے ناآشنا، مولانا سے سن میں ۱۴ سال چھوٹا ہونے کے باوجود اس فوجی مارچ میں ان کا ساتھ دینے کی ہمت مردانہ کہاں سے لاسکتا تھا میل آدھ میل کا معاملہ ہوتا تو نباہ بھی لے جاتا۔ غرض میں تو گھنٹہ بھر کے بعد شل ہو کر، راستہ سے کٹ گیا۔ اور ذیابطس کے اس مریض کو، جسے صاحب فراش رہے ہوئے بھی ابھی چند روز گزرے تھے، گھنٹوں اسی طرح مسلسل گشت کرتے رہنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا!

خاصی رات گئے جب وہ واپس آئے ہیں، تو قصبہ کے سربرآوردہ ہندو بھی ساتھ ساتھ۔ اور ان ہی میں روزنامۂ تیج (دہلی) کے ڈائرکٹر شریجیت دیش بندھو گپتا بھی[1]، اور فلاں اور فلاں۔ یہ اب اگر مولانا کو چھوڑنا چاہتے بھی تو مولانا انھیں نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ جرح ایک ایک سے کر رہے ہیں۔ یہاں بھوک سے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ اُدھر میزبان صاحب ہیں کہ دعوت وضیافت کے انتظامات ہی سے چھٹی نہیں پا چکتے! $10\frac{1}{2}$ پہ خدا خدا کر کے کھانا نصیب ہوا ــــــــ

آپ کہتے ہوں گے کہ خیر ۱۱ بجے رات کو تو محمد علی غریب کو دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد لیٹنے کو ملا ہو گا۔ جی یہ کہاں! لیٹ کر تو میں سویا۔ محمد علی اس وقت، جی ہاں اتنے ناوقت، کسی حاکم سے (شاید ڈپٹی مجسٹریٹ تھے) ملنے اور اسی معاملہ پر بحث و گفتگو کرنے پیدل روانہ ہوئے! کوئی $\frac{1}{2}$ ۱ بجے کا وقت ہو گا، جب مجھے نیند میں کچھ آہٹ سی

[1] ان کی وفات عین ان سطور کی نظر ثانی کے وقت کلکتہ میں ایک ہوائی حادثہ میں ہوئی (نومبر ۱۹۵۱ء)

محسوس ہوئی۔ معلوم ہوا اب واپس تشریف لائے ہیں! ۲½ بجے گاڑی دہلی کے لیے ملتی تھی اس کے لیے اسٹیشن روانہ ہوگئے اور مجھے سوتا چھوڑ گئے کہ اسے ایسے ناوقت اٹھنے میں تکلیف ہوگی! سبحان اللہ۔

"پانی پت کی جنگ چہارم" کے عنوان سے کامریڈ میں جو مسلسل دلچسپ مضمون کئی نمبروں میں نکلا، وہ اسی سفر کا ماحصل تھا۔ ادنیٰ لیڈروں اور پیشہ ور اخبار نویسوں کو چھوڑیے، یہ ارشاد ہو کہ جواہر لال نہرو اور "مہاتماجی" تک کو ادنیٰ "جہتی" اور مقامی معاملات میں اتنی محنتِ شاقہ برداشت کرتے، اتنا تعب اٹھاتے، اور اپنی صحت کی طرف سے یوں بے تکان بے پروائی برتتے کسی نے دیکھا ہے؟

مستقل ولایتی اخبارات تو دفتر کامریڈ میں صرف چند ہی آتے۔ ڈیلی ہیرلڈ، آئرش انڈپنڈنٹ وغیرہ۔ لیکن مسلم ملکوں اور مسلم مسئلوں سے متعلق تراشوں کا انبار مختلف رسالوں اور اخبارات سے ہر ہفتہ اتنا آجاتا کہ اسے تقسیم کیا جاتا، تو کئی کئی اخبارون کے لیے کافی ہو جاتا۔ یہ تراشے انتخاب کے بعد کامریڈ میں بالالتزام شائع ہوتے رہتے۔ ایک مفصل "مکتوب ٹرکی" قسطنطنیہ سے، اور ایک "مکتوب لندن" لندن سے بھی ہر ہفتہ ہونے لگا۔ پھر جہاد ورلیف، مسائلِ مصر اور سیاسیاتِ سوڈان، موصل عراق، شام، مراقش اور بغاوت کردستان وغیرہ سے متعلق پُرمغز و شگفتہ اور مفصل و مدلل اڈیٹوریل مقالات، ہر ہفتہ کا کامریڈ گویا عالمِ اسلامی اور اسلامیات کی ایک ننھی سی انسائیکلوپیڈیا ہوتا! مرتد کی سزائے قتل کے ضمن میں ایک بحث مقام حدیث کی آگئی۔[1] یعنی شریعت میں

---

[1] اس کا ذکر ابھی چند صفحے اوپر گزر چکا ہے۔

احادیث کا کیا درجہ ہے۔ اس پر کامریڈ نے اتنی شستہ و مدلل بحث کی کہ پڑھ کر بے اختیار دل سے داد نکلی۔ اور اسی بے اختیاری کے عالم میں یہ خط شوق لکھ بھیجا کہ "جی میں آتا ہے، دہلی فوراً پہنچ اور جن انگلیوں سے اتنا نفیس مقالہ نکلا ہے، انھیں آنکھوں اور ہونٹوں سے لگاؤں" ـــــ

سفر دہلی کے لیے ہمیشہ اسی طرح کے بہانے ملتے ہی رہتے تھے ـــــ لالہ لاجپت رائے، پنڈت موتی لال نہرو، بپن چندر پال، یہ اس وقت کانگریس کے چوٹی کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ کامریڈ نے ان میں سے ایک ایک کی اس طرح خبر لی کہ کچھ ان غریبوں کا دل ہی جانتا ہوگا۔

گاندھی جی کے خلاف بغاوت اس وقت تک ان کے کیمپ میں اچھی خاصی پھیل چکی تھی، اور بعض ہندو لیڈروں میں سے سیاسی مرتد اکثر ہو چکے تھے، کوئی دل اور زبان دونوں سے اور کوئی محض دل سے۔ لیکن حالت یہ تھی کہ ادھر کسی نے گاندھی جی پر حملہ کیا، اُدھر کامریڈ پوری بے جگری سے لڑنے اور جواب دینے کو آڑے آتا۔ ہندو کہتے تھے کہ مہاتما جی علی برادران کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو گئے ہیں۔ یہ تو خیر، البتہ یہ ضرور صحیح تھا کہ محمد علی نے اپنے کو مسلمانوں میں بدنام کر کے اپنے کو جس طرح مدتوں گاندھی جی کی ذات میں فنا رکھا، اسکی نظیر آسان نہیں ـــــ اور تماشہ یہ کہ اصول دین اور عقائد مذہبی تو خیر بڑی چیز ہیں، اصولِ اخلاق اور فلسفۂ عمل کی حد تک بھی محمد علی کبھی گاندھی جی کے معتقد نہ ہوئے۔ گاندھی جی کے محض خلوصِ نیت پر یقین اور انکی سیاسی اصابتِ رائے پر اعتماد یہ سب کچھ اُن سے کراتا رہا۔

ـــــــــ . ـــــــــ

باب (۳۱)

۲۶-۱۹۲۴ء

سنہ (۱)

(کامریڈ۔ کامریڈ کا خاتمہ۔ تلاوتِ قرآن)

سیاسی مضامین جو کامریڈ مین حکومت ہند کے خلاف نکلتے رہتے، سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک ہوتے۔ اپنے مذاق کو سب سے زیادہ پسند وہ مقالہ آیا جو سنہ ۲۵ء کے آخری پرچہ (۱۸ دسمبر) مین An Undelivered letter ("ایک مکتوب جو مکتوب الیہ کو نہ ملا") کے عنوان سے دس ضخیم کالمون مین نکلا ہے، یہ ایک انگریز آئی۔ سی۔ ایس افسر کی طرف سے خط ہندوستان سے ولایت مین اپنے کسی دوست کے نام ہے۔ اور اس کے اندر بے تکلفانہ انداز بیان مین وہ ساری چالین اور گھاتیں کھول کر بیان کر دی ہین، جن سے کام لیکر تحریک ترک موالات و خلافت کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا گیا تھا۔ مکتوب بڑا ہی دلچسپ ہے، اور ٹھیک اسی لب و لہجہ مین جو ایک انگریز سویلین کا دوسرے سویلین کے نام کے خط مین ہوتا ہی۔ دسمبر کی آخری تاریخون میں جب کانپور مین کانگرس اور خلافت دونوں کے سالانہ جلسے ہو رہے تھے، تو میں نے بڑھکر بڑی گرمجوشی سے داد دی۔ مولانا اُس وقت تک کامریڈ سے بالکل بددل ہو چکے تھے (اور بددلی کا بڑا سبب یہ تھا کہ سال سوا سال کی تلاش و کوشش کے باوجود بھی کوئی نائب یا

مددگار نہیں مل سکا تھا اور بند کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ میرے بار بار کے اصرار اور عرض معروض کرنے پر اس کا دوسرا نمبر نکالنے پر آمادہ ہوگئے۔ اور پرچہ ۲۲ جنوری ۲۶ء کی تاریخ کا نکال کر جب بند کیا ہے، تو اس نمبر میں مکتوب کا یہی دوسرا نمبر درج تھا۔ اور ضخامت کا حال سنیئے۔ مکتوب کا یہ دوسرا نمبر ضخامت میں پہلے سے بھی تقریباً دوگنا تھا۔ یعنی وہ اگر دس کالم کا تھا، تو یہ انیس ۱۹ کالم کا! ——— اسی آخری نمبر میں جو پہلا اداریتی مقالہ، کالموں کا ہے، وہ کسی سیاسی یا نیم سیاسی موضوع پر نہیں، بلکہ مولانا منور الدین دہلوی کی فقہی کتاب کتاب الحج والزیارۃ پر تبصرہ ہے، جس کے ضمن میں تبصرہ خود فقہ اسلامی پر ہو گیا ہے! انگریزی کے سیاسی پرچہ میں، اس بیسویں صدی میں، اس نوعیت اور پھر اس ضخامت کا "مولویانہ" مقالہ لکھ ڈالنا محمد علی ہی کا حصہ تھا۔

کامریڈ کی مالی حالت، اس دور ثانی میں، اچھی کبھی بھی نہ رہی۔ بس پرچہ لشتم پشتم کسی طرح چلے گیا۔ ایک مہینہ میں اگر بڑا زور لگانے سے سو خریدار کہیں بڑھے، تو دوسرے مہینے سوا سو خریدار گھٹ بھی گئے۔ قوم کو اپنے اس پرچہ سے شکایتیں بھی عجب عجب پیدا ہوتی رہیں۔ کوئی علم دوست بزرگ یہ کہتے کہ اب کامریڈ میں شیکسپیر کے ڈراموں پر ویسے تبصرے نہیں نکلتے جیسے ۱۱ء میں کلکتہ والے کامریڈ میں نکلتے رہتے تھے۔ کوئی شوقین صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اب اس کے "گپ" کے کالموں میں وہ زندہ دلی نہیں ہوتی جو اس کے دور اول میں ہوا کرتی تھی۔ یہ تو خیر سب خوش خیالیاں تھیں، اصلی شکایت اور واقعی تکلیف دہ بات خریداروں کے لیے یہ بھی کہ وقت کی پابندی پرچہ سے نہ نبھ سکی۔ شروع میں چند ہفتہ تو معاملہ غنیمت رہا۔ پھر ناغہ ہو کر

دو دو نمبر ساتھ نکلنے لگے۔ اور آخر میں تو نوبت یہ آگئی کہ چار چار، پانچ پانچ ہفتہ کا وقفہ ہونے لگا جس کے بعد ۲۔۳۔۴۔ ۴ پرچے اکٹھے نکلتے! پرچہ معنوی حیثیت سے، بہتر سے بہتر سہی، پھر بھی اتنی بے ترتیبی کے بعد کہاں تک زندہ رہ سکتا تھا! —— ایسے خریدار جو اصل مضامین کی پرکھ رکھتے ہوں، اور دل سے داد دے سکیں، تعداد میں واجبی ہی سے ہوتے ہیں، بڑا گروہ تو بس یہی دیکھتا رہتا ہے کہ پرچہ کسی طرح اپنے وقت پر ہاتھ میں آجائے۔

کامریڈ کے قدر دان اسے بھی گوارا کر لیتے، اور پرچہ جس بے قاعدگی اور جتنے ناغوں کے ساتھ بھی نکلتا، بہر حال نکلے تو جاتا۔ مشیت سے اجازت اس کی بھی نہ ملی۔ بند کر دینے کا ارادہ محمد علی نے تنگ آکر بار بار کیا۔ ہر دفعہ بات کسی نہ کسی طرح ٹلتی گئی، زیادہ تر مولانا شوکت علی کے دم دلاسوں سے۔ کبھی کہتے۔ میں ابھی شعیب کو سب ایڈیٹری پر بلائے دیتا ہوں۔ کبھی کہتے، اتنے خریدار بمبئی سے بھیج رہا ہوں۔ پرچہ کے لیے وقت کی پابندی پر وہ بھی بہت زور دیتے۔ لیکن عملاً اس کا انتظام کسی سے بھی نہ بن پڑتا۔ یک سر و ہزار سودا" محمد علی اس کا مجسمہ ہو رہے تھے۔ مصروفیت کا کونسا جز و ایسا تھا کہ جسے چھوڑتے، یا جو انھیں چھوڑتا! کچھ دخل اس میں طبعی بد نظمی اور عدم ضبط کو تھا۔ ۲۵ء جون تو ن ختم ہوا۔ فروری ۲۶ء میں محمد علی سخت علیل ہوئے۔ ذیابیطس تو تھا ہی۔ اب جسم میں پھوڑے جا بجا نکل آئے۔ اور بالکل صاحب فراش ہو کر پڑ گئے۔ میں نے دہلی جا کر دیکھا تو چلنا پھرنا الگ رہا، اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا۔ کامریڈ چار ہفتوں سے قرض چلا آرہا تھا۔ چار نمبروں کا مجموعہ ایک نمبر ۲۲ جنوری کی تاریخ ڈال کر تو خیر کسی طرح نکال ہی دیا۔ اس کے بعد کا پرچہ نکلنا کسی طرح

ممکن نہ ہوا۔ پریس والوں نشین مینوں، کمپاز یٹروں، وغیرہ کے مطالبات مدت کے چڑھے ہوئے تھے، ان ہی کا چکانا اور بیباق کرنا دشوار ہو رہا تھا، نئے مصارف کی گنجائیش کہاں سے نکلتی! ——— اس طرح کوئی ۱۵ مہینہ کی آب و تاب کے بعد یہ آفتابِ صحافت غروب ہو گیا۔ اولب کی مرتبہ اس کی تدفین انگریز حکومت کے جبر و تشدد کے ہاتھوں نہیں، خود اپنی قوم کی ناقدریوں کے ہاتھ ہوئی ؎

کھلا دیوان مرا تو شورِ تحسین بزم سے اٹھا
مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

محمد علی کا اصلی جوہر تحریر اردو کا نہیں، انگریزی انشاء کا میدان تھا۔ ساتھ ہی قوتِ استدلال غضب کی۔ بیان کی دلآویزی، زبان کی شگفتگی، دلائل کی قوت، بحث کے اطراف و جوانب کی جامعیت، سب مل ملا کر عجب سماں پیدا کر دیتے ——— کامریڈ جس دن بند ہوا ہے، حکّام والا مقام کے علاوہ خود ہم چشم لیڈروں میں سے بھی خدا جانے کتنوں نے اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ ایک بڑا کانٹا پہلو سے دور ہو گیا۔ وہ درحقیقت گم ہو گیا، جو بڑے اور چھوٹے کے درمیان صرف انصاف کرنا جانتا تھا۔ کامریڈ نامی ایک اخبار بند نہیں ہوا، مظلوموں کا ایک فریاد رس، اور مسلمانوں کا ایک بڑا ترجمان دنیا سے اٹھ گیا!

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا	تم ان لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے،
اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ	جنھوں نے اپنے عہد و پیمان توڑ ڈالے
الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ	اور جو رسول کے جلا وطن کرنے پر کمر باندھے بیٹھے،

اَوَّلَ مَرَّةٍ اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ	اور انھون نے خود ہی پہلے تم سے چھیڑ کی۔
اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ	کیا تم ان سے ڈرتے ہو۔ حالانکہ اللہ ہی
مُؤْمِنِيْنَ (توبہ - ۲)	زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔

دسمبر ۲۴ء تھا۔ دہلی میں ایک روز صبح کچھ دن چڑھے مولانا کے کمرہ یک بیک چلا گیا! دیکھا کلام مجید کی تلاوت بلند کر رہے ہین۔ زیادہ زور سے نہین، مگر اتنی آواز سے کہ قریب کے بیٹھے ہوئے لوگ سن سکیں۔ کمرہ مین تنہائی تھی۔ وہ مسہری پر بیٹھے ہوئے قبلہ رخ انہماک کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ میں چپکے سے جا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ ایک مترجم حمائل ہاتھ مین تھی، اور سورۂ توبہ اس وقت زیر تلاوت تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ آیت آئی جو ابھی درج ہوئی۔ خشوع و خضوع کی کیفیت پہلے ہی سے نمایان تھی۔ اس آیت پر پہنچکر جوش سے جھومنے لگے۔ آواز بلند سے بلند تر ہو گئی۔ آخری ٹکڑے اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کو بھرّائی ہوئی آواز سے بار بار پڑھنا شروع کر دیا، تکرار کرتے جاتے تھے اور آنکھون سے آنسو جاری تھے۔ زبان سے تو صرف الفاظ قرآنی کی تلاوت ہو رہی تھی، لیکن زبانِ حال سے صاف ایک مستقل اور بلیغ تفسیر ہو رہی تھی، کہ ہم بھی کوئی مسلمان ہین، جو حکومت سے ڈر رہے ہین، پولیس سے ڈر رہے ہین، پریس سے ڈر رہے ہیں، قید و بند سے ڈر رہے ہین، اِس سے ڈر رہے ہین، اُس سے ڈر رہے ہین۔ مسلمان کے لیے مخلوق بھی کوئی چیز ڈرنے اور خوف کھانے کی ہے؟ مسلمان کو ڈرنا تو صرف ایک اور اکیلے خالق ذوالجلال سے چاہیے نہ کہ اس کی مخلوق سے، اور مخلوق بھی کون؟ اس کی باغی، اسکی نافرمان، اس کی اطاعت و اطاعت سے خارج! ——— یہ منظر اپنی نوعیت میں میرے لیے بالکل انوکھا تھا۔ یوں تو محمد علی، ہر سچے مومن کی طرح، سارے ہی قرآن کے

عاشق تھے۔ لیکن جن آیات میں بیان توحید الٰہی کا ہوتا ہی یا جن میں تاکید جہاد ہوتی، انھیں پڑھ کر یا سن کر تو وہ بیتاب ہی ہو جاتے تھے۔ قال کے بجائے حال طاری ہو جاتا، آنسو دھڑا دھڑ بہنے لگتے، وَاِذَا سَمِعُوْا تَفِیْضُ اَعْیُنُھُمْ مِنَ الدَّمْعِ بِمَا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ کا نقشہ سامنے آجاتا ہی۔ کبھی کبھی ہاتھ پر بھی پٹختے، اور جوش و کیف سے جیسے بیخود ہو جاتے۔

ساتھ رہ کر نماز پڑھتے بھی بارہا دیکھا۔ وقت کی بے انضباطی جو زندگی کے سارے شعبوں میں چھائی ہوئی تھی، اس کے رنگ سے یہ شعبہ بھی خالی نہ تھا، نماز بارہا وقت سے بے وقت ہو جاتیں کبھی کسی عذر سے کبھی کسی عذر سے لیکن ناغہ کبھی بھی نہ ہونے پاتا۔ فجر کی نماز میں دیر ہو جانے کا ایک مستقل عذر شرعی بھی موجود تھا۔ مرض کے باعث رات میں پیشاب کے لیے بار بار اٹھنا پڑتا۔ ایک تو یوں ہی رات کو دیر میں سوتے، پھر درمیان میں یہ بار بار اٹھنا۔ قدرۃً صبح آنکھ کسی قدر دیر میں کھلتی۔ مولانا شوکت علی کو دیکھا کہ الٹی سیدھی جیسی بھی پڑھیں، نماز وقت ہی پر پڑھ لیتے۔ فجر کو آنکھ کبھی ان کی بھی دیر میں کھلتی (ذیابیطس کے مریض وہ بھی تھے) تو جھٹ پٹ وضو کر نماز پڑھ ڈالتے۔ محمد علی کے ہاں یہ نہ تھا۔ استنجا، طہارت، وغیرہ سب بڑی اطمینان سے کرتے۔ اکثر تو غسل بھی کرتے، اور بعد غسل سر کے بڑے بالوں اور داڑھی میں کنگھی بھی اسی طرح اطمینان سے۔ جب کہیں جا کر نماز کے لیے کھڑے ہوتے۔ ظاہر ہے کہ سورج اس درمیان میں بلند ہو چکا ہوتا، نیت یقیناً قضا کی باندھتے۔ لیکن پڑھتے اس خشوع و خضوع اور اس اطمینان کے ساتھ کہ ان کی ایک "قضا" نماز پر ہم ایسوں کی "ادا" نمازیں قربان کر دینے کے قابل تھیں۔ عارف رومیؒ کے الفاظ میں ؎

گر نمازت فوت می شد آں زماں
می زدی از درد دل آہ و فغان

آن تاسف و آں فغان و آں نیاز
در گزشتی از دو صد رکعت نماز

باب (۳۲)

۱۹۲۴ء - ۲۶ (۲)

(ہمدرد - ہمدرد کا اسٹاف)

یہ تھا ۲۴ء میں انگریزی کے ہفتہ وار کامریڈ کا اڈیٹر، اردو کے روزنامہ ہمدرد کا چیف اڈیٹر، اور ملک کے سب سے بڑے اور پُر قوت اور فعال سیاسی ادارہ، انڈین نیشنل کانگریس کا صدر! بھلا اس صدی کے اڈیٹروں، اور ان سے بھی بڑھکر لیڈروں کو نماز اور قرآن خوانی سے، اور وہ بھی اس شغف و انہماک کے ساتھ کیا واسطہ؟ اور ستم یہ کہ یہ قرآنیت اور اسلامیت لازمی نہیں، متعدی ہو کر رہی۔ اڈیٹر کی ذات تک محدود نہ رہی، کامریڈ اور ہمدرد دونوں کے صفحات میں، آئین صحافت کے خلاف "جرنلزم" کے دستور کے برعکس، برابر جلوہ گر ہوتی رہی۔ جو سرپھرا، کامریڈ میں قتلِ مرتد جیسے خالص مذہبی مسئلہ پر، بالکل منقولی حیثیت سے، تین تین نمبر اور بتیس بتیس کالم لکھ ڈالے، اور اردو کی ایک فقہی کتاب کے تبصرہ کے لیے اڈیٹوریل کے سات سات کالم وقف کردے، اسے کیا حق تھا کہ باوجود اپنی مشہور و مسلّم انگریزی انشا، پردازی کے، باوجود اپنی شہرۂ آفاق سیاست دانی کے، بیسویں صدی میں انگریزی جرنلزم پر قبضہ جمائے رکھے؟ —— دھارے کے خلاف پیراک کی قسمت میں ہار کر

اور تھک کر آخر ڈوبنا ہی تھا۔ کامریڈ نے سوا سال کی زندگی کے بعد آخری سانس لی۔

ہمدرد پر یہ قیامت آئی کہ اس میں بالالتزام روزانہ قرآنی "حکمت و موعظت" کے درس دیئے جانے لگے۔ دسمبر ۲۴ء میں جب میرا دہلی پہنچنا ہوا، تو بڑے گلے شکوؤں کے ساتھ ارشاد ہوا کہ "تم نے آنے میں اتنی دیر کی۔ تمھارے انتظار میں ہمدرد کا ایک مستقل عنوان ابتک رکا رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر روز بلاناغہ ہمدرد میں اڈیٹوریل صفحہ کے شروع میں کوئی آیت قرآنی مع اردو تشریح کے درج ہوتی رہے کہ جس مسلمان کے ہاتھ میں ہمدرد جائے، وہ کم از کم ایک آیت تو مع تشریح کے تلاوت کر لیا کرے، اور غیر مسلموں کے سامنے بھی قرآن اس صورت میں مسلسل پہنچتا رہے۔ عنوان "حکمت و موعظت" رہے گا۔ کل سے اس کالم کو اپنے ہاتھ میں لو۔"

تعمیلِ ارشاد میں فخر و مسرت محسوس ہوئی۔ ۱۰ دسمبر سے ہمدرد میں یہ عنوان مستقل ہو گیا۔ اور جب تک ہمدرد ۲۹ مارچ ۲۹ء میں بند نہ ہو گیا، برابر اس کے پرچہ میں کوئی نہ کوئی آیت مع تشریح نکلتی رہی۔ شروع شروع میں یہ خدمت اسی نیازمند کے سپرد رہی۔ دہلی سے جب واپس آنے لگا، تو آیتوں کا ایک ذخیرہ لکھکر وہاں چھوڑ آیا تھا۔ پھر دریاباد سے بھی لکھکر بھیجتا رہا۔ رفتہ رفتہ اسٹاف کے لوگ بھی اس کام میں منجھ گئے۔ اور خود ہی یہ خدمت انجام دینے لگے۔ اردو میں اُسوقت تک روزنامے بڑے بڑے ہی لوگ نکال چکے تھے، بلکہ علماء کے بھی بعض مخصوص روزنامے نکل چکے تھے لیکن اس "بدعت حسنہ" کی ایجاد کا سہرا ایک علی گڈھ کے "نیچری" اور آکسفورڈ کے گریجویٹ ہی کے سر رہا۔ اور بعد کو پہلے دکن کے ایک روزنامہ اور پھر بمبئی اور لکھنؤ

اور دہلی کے بعض روزناموں نے جس طرز کو اڑایا، اس کا نقشِ اول ہمدرد ہی کا قائم کیا ہوا ہے
یہ محض نمونہ دکھا رہا ہوں، محمد علی کے غلبۂ مذہبیت کا۔ اور تو اور، خود اسٹاف کے
"روشن خیال" ممبر اس مذہبی "دیوانگی" سے چیخ پیخ اٹھے۔ سارے روزنامے، ڈاک خانہ
کی تعطیل کے باعث، خود بھی اتوار کو چھٹی مناتے تھے۔ یہاں حکم یہ نافذ تھا کہ تعطیل، سرکاری
یوم تعطیل کے مطابق اتوار کو نہیں، بلکہ مسلمانوں کے یوم تعطیل جمعہ کو منائی جاتی رہے! اس سے
کاروباری نقصانات اٹھانے پڑے۔ منیجر صاحب نے غل مچایا، اڈیٹوریل اسٹاف نے
(اخباری اصطلاح میں) "صدائے احتجاج" بلند کی، مادی نقصانات کا احساس
خود مولانا کو ہوا، یہ سب کچھ سہی، لیکن حکم اٹل رہا!

دہلی ایک تو جغرافی حیثیت سے بھی مرکزی مقام۔ یہ نہیں کہ کلکتہ یا بمبئی کی طرح
ایک گوشہ میں ہو، پھر حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، اور سب سے بڑھکر خود مولانا کی زبردست
اور مرکزی شخصیتیں یہیں موجود۔ یہی وجہ تھی کہ خلافت کمیٹی کا صدر دفتر اگرچہ بمبئی میں تھا،
لیکن مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے بمبئی سے کہیں زیادہ دہلی ہی میں ہوا کرتے۔ ہمدرد
اور مولانا کی مستقل کشش تو تھی ہی، پھر ان جلسوں میں شرکت کی طلبی، غرض اب ہر دوسرے
تیسرے مہینہ میرے پھیرے دہلی کے ہونے لگے۔ کبھی دو ہی ایک دن بعد لوٹ آتا، اور
کبھی متصل کئی کئی دن ٹھہر جاتا۔ مولانا کو قریب سے دیکھنے کے موقعے خوب خوب ملتے
رہے ——— خالص سونے کا ایک ڈلا تھا، جتنا اسے پرکھا، تپا یا، وہ اور نکھرتا ہی گیا۔
محمد علی کا مکان گویا سارے ہندوستان کا مرکز اعصاب تھا۔ ہر ہر گوشہ سے
ایک ایک خبر وہاں پہنچتی۔ تار پر تار آتے رہتے، ٹیلیفون کی گھنٹی پر گھنٹی بجتی رہتی۔

اور آنے جانے والوں کا تانتا جو صبح سے شروع ہو جاتا تو بڑی رات گئے بھی مشکل ہی سے ختم ہو پاتا۔ یہ ڈاکٹر انصاری آرہے ہیں، وہ دہلی کے ہندو لیڈر لالہ شنکر لال چلے آرہے ہیں۔ آج لکھنؤ سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی تشریف لارہے ہیں، کل حیدرآباد سے ہمایون مرزا بیرسٹر وارد ہو رہے ہیں۔ ابھی فلاں ہندو لیڈر الہ آباد سے آئے ہیں، ابھی فلاں مسلمان لیڈر بمبئی سے۔ اخباری نمایندوں، نامہ نگاروں، اڈیٹروں کا تو شمار ہی نہیں۔ سیاسیات ہند کے کون سے مسئلے ایسے تھے، جن پر یہاں دن رات بحث نہ ہوا کرتی۔ کانگرس کی ممبری کے لیے اس وقت ایک لازمی شرط چرخہ کاتنے کی تھی۔ محمد علی صدر کانگرس دفتر میں بیٹھے چرخہ چلا رہے ہیں کہ مشہور سوامی شردھانند آگئے۔ اب اسی حال میں ان پر تبلیغ اسلام ہو رہی ہے، اور انگلیوں کے ساتھ ساتھ برابر زبان بھی جنبش میں ہے ——— سیاسی تربیت اور واقفیت محمد علی کے ساتھ رہ کر چند روز میں جتنی حاصل ہو جاتی تھی، وہ بجائے خود ایک نعمت تھی اور واقفیت صرف سیاسیات ہندی سے متعلق نہیں، بلکہ سیاسیاتِ عالم سے بھی، خصوصاً سیاسیاتِ عالمِ اسلامی سے۔

ہمدرد جب نکلنا شروع ہوا ہے، سچ کا اُس وقت تک وجود نہ تھا۔ اور جب اس کے ڈھائی تین مہینہ بعد سچ نکلا ہے، جب بھی کئی شریک عمل اور رفیق کار موجود تھے مجھے وقت کم ہی دینا پڑتا تھا۔ اور ہمدرد کی خدمت کے لیے میں بڑی حد تک خالی تھا۔ لکھنؤ، علیگڈھ، وغیرہ کے لیے وقائع نگار میں نے ہی ٹھہرائے تھے۔ بہت سے لکھنے والوں سے مراسلت کر کر کے مضامین حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ خود بھی شروع شروع کثرت سے مضامین لکھ کر دیے۔ زیادہ تر فرضی ناموں سے۔ کبھی کبھی اڈیٹوریل بھی لکھے۔ ان میں مقالات اکثر

اور نوٹ کمتر۔ اور ایک آدھ بار تو ایسا بھی ہوا کہ مضمون خود مولانا کے نام سے شائع ہوا، لیکن وہ لکھا ہوا اول سے آخر تک ان کے اسی نیاز مند کا تھا۔ لکھنؤ کے پنڈت کشن پرشاد کول کشمیری، سروینٹس آف انڈیا سوسائٹی کے ممبر، لبرل پارٹی کے رکن رکین، سیاسیات و مذہبیات دونوں میں ہمدرد سے بعد المشرقین رکھتے تھے۔ لیکن بہرحال تھے ایک سنجیدہ لکھنے والے۔ میری فرمایش پر ایک مفصل مضمون دو نمبروں میں ہمارے ہاں ہند و مسلم اتحاد پر لکھا۔ اس پر مفصل اڈیٹوریل تبصرہ نگاری میرے ہی حصہ میں آئی۔ اسٹاف میں اول اول سب سے بیشتر فاروقی صاحب تھے، انھیں مولانا کی ادا شناسیوں میں ملکہ حاصل تھا۔ یہ چلے گئے، تو افسری عارف ہسوی صاحب کے حصہ میں آئی۔ یہ بھی مولانا کے مزاج شناس تھے، اور مئی ۱۹۲۶ء تک، جب تک ان کا تعلق ہمدرد سے رہا، انھوں نے کام کو باوجود اپنے بعض سیاسی اور مذہبی اختلافات کے، بہ حیثیت مجموعی خوب نباہا۔ لیکن ۲½ سال کی مدت میں خدا معلوم کتنے نئے نئے لوگ آکر اسٹاف میں شامل ہوتے اور پھر چلے جاتے رہے (بعد کے آنے والوں میں سب سے زیادہ ممتاز نام ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کا ہے) سب نہ اس درجہ کے محتاط تھے نہ اس درجہ کے مخلص۔ بلکہ بعض صاحبوں نے تو زبانی اور تحریری بڑے بڑے دعوے مولانا سے محبت و عقیدت کے کیے، لیکن تجربہ سے چند ہی روز بعد معلوم ہوگیا کہ ساری محبت و عقیدت، مولانا کی ذات یا ان کے مسلک اور اصول سے نہیں، بلکہ مولانا کے روپیہ سے تھی!

جامعہ کے متعدد ہونہار نوجوان آآکر شریک ہوئے، اور تجربہ و تربیت حاصل کرکے الگ الگ اپنے کاموں میں لگ گئے۔ جعفری صاحب (جو ہمدرد میں شروع سے آخر تک رہے، اور اس وصف میں کوئی ان کا شریک نہیں) کے جوہر بعد کو کھلے۔

شروع شروع تو انکی حیثیت محض ایک نو عمر کار آموزہ کی تھی۔ ایک بڑا کام اسٹاف والون کی نگرانی تھی یعنی اس امر کی دیکھ بھال کہ کوئی بات ہمدرد کے معیار سے فروتر یا مولانا کے مسلک کے خلاف پرچہ مین نہ نکل جائے۔ مولانا نے بارہا یہ کیا کہ اسٹاف کے کسی سمجھدار ممبر کو بلا کر اپنا مافی الضمیر تفصیل کے ساتھ سمجھا دیا، بلکہ کام پڑ مین اپنا لکھا ہوا مقالہ بھی انھین پڑھوا دیا، پھر بھی ان صاحب نے جب ہمدرد مین مضمون لکھا، تو مولانا کو عموماً شکایت ہی رہی، بلکہ کبھی کبھی تو وہ مضمون چھپنے ہی کے قابل نہین قرار پایا۔ مولانا کا نام پرچہ پر ہمیشہ بحیثیت ایڈیٹر کے لکھا ہوا رہا، لیکن بجز ان چند مضامین کے جو انکے نام کے ساتھ شائع ہوئے ہم۔ ۱/۲ ۱ سال کی طویل مدت مین نہ کبھی وہ ہمدرد کیلئے مضمون لکھ سکے اور نہ کبھی اسکا کوئی پرچہ ایڈٹ ہی کر سکے۔ صرف ہدایات دیدیتے تھے، کام دوسرے لوگ کرتے تھے۔ اور اسی کام ہی کی نگرانی بڑی حد تک اس خادم سے متعلق تھی ـــــ جہانتک دہلی کے کام کی نگرانی دریاباد سے ممکن تھی۔

شروع ہی کا زمانہ تھا۔ اردو کے مشہور لکھنے والے سید سجاد حیدر (یلدرم) بی۔ اے۔ جو ان دنون مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے رجسٹرار تھے، ترکی کی تازہ سیاحت سے واپس آئے تھے، اور علی گڈھ مین طلبہ کے جلسہ مین اپنے مشاہدات سفر بیان کیے۔ دہلی کے ہندوستان ٹائمس نے (جسکی مسلم دشمنی اس وقت تک اتنی کھلی نہ تھی) تقریر کو اپنی خاص سرخیون اور رنگ آمیزیون کیساتھ شائع کیا۔ اس پر ہمدرد کے اسٹاف کے ایک ممبر کو بے محل جوش آگیا، اور ۱/۲ ۱ کالم کا ایڈیٹوریل سید صاحب کے جواب مین چھاپ دیا جس مین بار بار ان کے "وابستہ دولت برطانیہ" ہونے پر چوٹ تھی۔ سید صاحب سے یہی نہیں کہ مولانا سے تعلقات بہت قدیم اور مخلصانہ تھے، بلکہ مین تو ان سے ہمدرد کے لیے مضمون بھی طلب کر چکا تھا۔ اور پھر انکی اصل تقریر مین کوئی بات ایسی قابلِ گرفت تھی بھی نہین۔ ہمدرد کا مضمون پڑھ کر مجھے سخت ندامت ہوئی۔ مولانا کو بھی مضمون ناپسند ہوا۔ بہرحال اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مین نے نجی کا معذرت نامہ سید صاحب کو لکھا۔

باب (۳۳)

۲۶-۱۹۲۴ (۳)

(مطائبات ہمدرد۔ محاربات ہمدرد)

شروع ۲۶ء تھا۔ ہمدرد میں گاندھی جی کے خود نوشت تجربات زندگی کا مسلسل ترجمہ ان کے انگریزی ہفتہ وار ینگ انڈیا سے نکل رہا تھا۔ گاندھی جی نے ایک جگہ اس میں ذکر بچپن میں اپنے چھپ کر گوشت کھانے اور پھر اس کے ترک کے عہد کر لینے کا کیا ہے۔ ہمدرد کا نوعمر جامعی مترجم جب اس مقام پر پہنچا تو قوسین کے اندر یہ عبارت بڑھادی کہ "غالباً اچھا پکا ہوا نہ تھا، ورنہ اس آسانی سے نہ چھوٹتا"۔ مترجم کی نیت ظاہر ہے کہ کسی دلشکنی یا دلآزاری کی نہ تھی محض ایک خوش طبعی مقصود تھی۔ لیکن چیز تھی فی نفسہ بے موقع، کہ یہ ایک چوٹ گاندھی جی کے عقیدۂ ترکِ حیوانات پر تھی۔ اور جس فضا میں ہر چھوٹی سی چیز ہندو مسلم فساد کا باعث بن رہی تھی، یہ بے ضرر سا مزاح بھی بہت کچھ باعثِ ضرر بن سکتا تھا۔ ہم لوگ بات کو بالکل معمولی سمجھے۔ تیسرے دن خود مولانا کی نگاہ پرچہ پر پڑ گئی (روز کا روز انھیں اپنا بھی اخبار پڑھنے کو کہاں مل پاتا تھا) اور مترجم صاحب کی معاطلبی ہوئی۔ اور مولانا نے غریب کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ بیچارہ کے آنسو نکل آئے۔ مضمون ۲ فروری کے پرچہ میں نکلا تھا۔ ۸ فروری کے پرچہ

ین ایڈیٹوریل میں مفصل معذرت نکلی —— یہ ایک نمونہ تھا ہمدرد کے معیار صحافت کا۔
بھلا اس کو ملک کی عام اخباری فضا سے کیا مناسبت تھی۔ یہاں تو تفنن و خوش طبعی کے معنی ہی
دوسروں پر چوٹ کرنے اور کسی کے نسب پر یا وطن پر یا مذہب پر طنز و تعریض کرنے کے تھے۔
اور ظریفانہ کالم تو رکھے ہی اس غرض سے جاتے تھے کہ اس حمام میں قدم رکھتے ہی پوری برہنگی
کا مظاہرہ جائز ہو جائے!

ہمدرد غریب میں نہ کبھی "سنسنی خیز" سرخیاں دی گئیں اور نہ ایسی خبریں شائع ہونے پائیں
جو نوجوانوں کے جذبات کے لیے ہیجان انگیز ہوتیں۔ مالکِ ہمدرد کا حکم اور قطعی حکم تھا کہ
بس معلومات ہی زیادہ سے زیادہ تعداد میں اور زیادہ سے زیادہ شستہ و شریفانہ انداز
میں ناظرین تک پہنچائے جائیں۔ اور ایڈیٹوریل اسٹاف اپنی بساط بھر اس حکم کی تعمیل کرتا
اخبار یہاں تجارت اور دکانداری کی کوئی قسم نہ تھی، تبلیغ و تلقین کی ایک شاخ تھی۔
پنجاب کے دو مشہور معاصروں زمیندار اور تنظیم میں ان کے مالکوں کے نام کا "حضرت
ظفر الملت والدین" اور "سیف الملت والدین" لکھے جانے کا رواج عام ہو چکا تھا۔
ہمدرد نے اس وزن و قافیہ میں ایک بار بھی اپنے ہاں "محمد الملت والدین" کی ترکیب جائز
نہ رکھی، اور نہ کبھی "حضرت" کا لفظ اپنے پروپرائٹر کے لیے استعمال کیا۔ اور تو اور "رئیس الاحرار"
کا لقب مولانا کے لیے عام ہو چکا تھا۔ سارے دوسرے اخبارات بے تکلف لکھ رہے
تھے لیکن جس اخبار نے یہ بھی کبھی مولانا کے لیے استعمال نہ کیا، وہ خود مولانا ہی کا ہمدرد تھا! ——
تاکید رہتی تھی کہ زیادہ تعظیمی الفاظ و القاب ہرگز ان کی ذات کے لیے نہ استعمال ہوں، بس
زیادہ سے زیادہ لفظ "مولانا" کی اجازت تھی۔

ہمدرد کوئی خشک اور واعظانہ رنگ کا پرچہ ہرگز نہ تھا۔ ادبیت اس میں چاشنی کی حد تک نہیں، بلکہ اچھی خاصی نمایاں رہتی تھی۔ افسانے اس نے بارہا شائع کیے۔ ادبی تبصرے اس میں برابر نکلتے رہتے تھے مہذب شوخیاں اسکے اڈیٹوریل میں جھلکتی ہی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی کچھ دن کے لیے ظریفانہ کالم بھی اس نے اپنے ہاں کھولے۔ "حاجی بغلول" صاحب اس کے "تجاہل عامیانہ" کے کالموں کو وقتاً فوقتاً مشرف کرتے رہے۔ شعر و سخن کے چرچے بھی اس کے صفحات پر اکثر جاری رہے۔ بایں ہمہ مذاقِ عوام کی پیروی اس سے کبھی بھی نہ ہو سکی۔ بازاریت اور ابتذال، فحش و پھکڑ کی نقالی وہ نہ کر سکا۔ خشک وہ یقیناً نہ تھا، لیکن "چٹپٹا" بھی وہ نہ بن سکا۔ بگڑے ہوئے ذائقے جس چٹپٹے پن کی تلاش میں رہتے ہیں، اس جنس سے اس کا دامن ہمیشہ خالی ہی رہا۔ اشتہارات تک میں اس نے احتیاط برتی۔ شراب اور فحش کتابوں، فحش دواؤں کے اشتہارات تو خیر الگ رہے۔ سینما اور تھئیٹر کے بھی اشتہارات اس نے کسی اجرت پر بھی نہ چھاپے ——— بات کہنے کو معمولی ہی ہے لیکن ایک روزنامہ کے بارِ مصارف اور ضروریاتِ زر کا اگر اندازہ ہو، اور معاصرین اور ثقہ معاصرین کا تعامل عام پیش نظر رہے، جب شاید محمد علی کے اس مجاہدہ کی کچھ قدر ہو۔

۲۶ء کا ابھی شروع ہی تھا کہ بمبئی کا ایک لکھ پتی نوجوان مسلمان موٹر پر جاتا ایک بیسوا کے عشق کے سلسلہ میں مہاراجہ اندور کے اشارہ سے سرِ راہ قتل کر دیا گیا۔ قتل کا ہونا تھا کہ جیسے اخبارات کو منہ مانگی مراد مل گئی۔ اکیلے بمبئی ہی کے نہیں، دہلی تک کے بڑے بڑے معزز و خود دار اخبارات، اردو ہی کے نہیں انگریزی کے بھی، مضمون اسی داستان سے رنگین رہے۔ تصویریں نکل رہی ہیں، کارٹون چھپ رہے ہیں،

نظموں پر طبع آزمائی ہو رہی ہے، خبریں رنگ آمیزی کے ساتھ تصنیف ہو رہی ہیں، افتتاحیے اور نوٹ سبھی کی بھرمار ہو رہی ہے، ملک کے طول و عرض میں اردو، ہندی، گجراتی، مرہٹی، انگریزی اخبارات میں ایک ہمدرد ہی ایسا تھا، جس کے کان پر کہنا چاہیے کہ جوں تک نہ رینگی! ــــــ محمد علی تجارت کی دوکان کھول کر نہیں بیٹھے تھے، اصلاح و ہدایت وعظ و تلقین کا ایک منبر تلاش کر لیا تھا۔

معاصرین سے الجھنا ہمدرد نے کبھی اپنا شیوہ نہ رکھا۔ مولانا کی تاکید تو اس باب میں تھی ہی، شروع شروع میں جو سینیر اسٹاف بہم پہنچا، وہ بھی اس بازاریت سے بیزار ہی رہا۔ فاروق صاحب اور ان کے بعد عارف صاحب دونوں اس مذاق سے بیگانہ تھے۔ بلکہ فاروق صاحب تو دوسرے سرے پر پہنچ گئے تھے۔ یعنی بعض اوقات بالکل بلا ضرورت بھی بعض معاصرین کی تالیف قلب میں لگے رہتے۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود ایسے ایسے خوش ظرف معاصرین بھی، خصوصاً خاک پاک پنجاب میں موجود رہے، جو خواہ مخواہ بھی ہمدرد سے الجھتے رہتے، اور جب کبھی ہمدرد کو چھیڑتے تو مخاطب براہ راست مولانا محمد علی کی ذات ہی کو بناتے! حالانکہ یہ سب خوب جانتے تھے کہ مولانا مضامین لکھنا الگ رہا، ہمدرد کو پوری پابندی کے ساتھ پڑھنے کی بھی مہلت نہیں رکھتے۔

خیر معاصرین کی نیش زنی کا معاملہ تو پھر غنیمت تھا۔ ہمدرد کو اصلی مقابلہ حکومت انگریزی سے کرنا تھا۔ ہندوستان کی آزادی، اور ہندوستان سے بھی بڑھکر ممالک اسلامیہ کی آزادی محمد علی کو عزیز تھی۔ ہمدرد اور کامریڈ دونوں کے اجرا سے ان کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ ملت اسلامی کو اسی نقطہ پر لاکر متحد کریں۔ جزئی معاملات میں اختلافات اور

اندرونی نزاعات اس مقصد کے حق مین زہر تھے۔ اس لیے محمد علی کی انتہائی کوشش یہ رہتی کہ ہمدرد کبھی بھی اپنی قوت مسلمانون کے اندرونی باہمی اختلافات مین پڑنے اور ایک فریق بن جانے مین منتشر نہ کرے۔ لیکن تقدیر کا نوشتہ بہرحال پورا ہو کر رہتا ہے، اور حالاتِ تکوینی پر کس کا قابو چلا ہے۔ محمد علی کو، ہمدرد کی چار ساڑھے چار سال کی زندگی مین بھی، خدا معلوم کتنی بار اندرونی فتنوں کی طرف زور و قوت کے ساتھ متوجہ ہونا پڑا۔ اور ہمدرد کو اس میں قدرةً پورا حصہ لینا پڑا۔ ان مین سے مین جنگین خاص طور پر طویل اور تلخ رہین۔ پہلی جنگ، شریفی سعودی جھگڑے کے سلسلہ مین، مجلسِ خدام الحرمین اور فرنگی محل اور سارے "مشائخ و صوفیہ" کے مقابلہ مین رہی۔ دوسری جنگ، اسی سلسلہ مین، ٹھیک اسی کے برعکس، زمیندار اور مولانا ظفر علی خان اور ساری جماعتِ اہلِ حدیث کے خلاف۔ تیسری جنگ کا رخ دہلی کے مشہور عوامی نقیب خواجہ حسن نظامی[1] کے خلاف رہا۔ چوتھی جنگ ہمدرد کے بند ہونے کے بعد لڑی گئی۔ اور یہ جمعیۃ العلماء اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے محاذ پر۔ ان جنگون کے تذکرے اس ڈائری کے آیندہ صفحات مین انشاء اللہ اپنے مقام پر آئین گے۔ ان مین سے پہلی جنگ جو ۲۵ء کی دوسری ششماہی مین چھڑی، اس کا ذکر نسبتہً سب سے زیادہ تفصیل سے آئے گا۔ اور یہ اس لیے کہ اس مین خود یہ ڈائری نویس بھی محمد علی کے ایک پرجوش لفٹننٹ کی حیثیت سے پوری طرح شریک تھا۔

یہ جنگ محمد علی کے لیے شاید سب سے زیادہ تکلیف دہ بھی تھی۔ محمد علی کی عمر لڑنے

[1] خواجہ صاحب کی امتیازی حیثیتین متعدد ہین۔ مثلاً ان کا ایک صاحبِ طرز ادیب ہونا لیکن اس جنگ کا تعلق ان کی کسی اور حیثیت سے نہ تھا۔

مین گزری، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ لڑائی کے شایق ہرگز نہ تھے، اور جنگ میں ابتدا کرنا
کسی طرح نہیں چاہتے تھے۔ یہ جنگ، ناگوار جنگون مین ان کے لیے ناگوارترین تھی۔ اس
میں مقابلہ دشمنون سے نہ تھا۔ وہ دوستون سے کرنا پڑا، ایسے دوستون سے کرنا پڑا، جو عزیزون سے بڑھکر عزیز تھے، اور
مرید کو اپنے مرشد کے مقابلہ مین صف آرا ہو کر آنا پڑا ——— تفصیل کے بغیر یہ ماجرا
پڑھنے والوں کے لیے ایک معمہ رہے گا۔ اور اس خاص جنگ کی تفصیل اب موجود
اور زندہ لوگون مین اس ڈائری نویس سے بڑھ کر کوئی دوسرا کر نہین سکتا۔

———— • ————

باب (۳۴)

سنہ ۱۹۲۵ء (۴)

(مرشد و مرید۔ شرعی جمہوریت۔ امید افزا حالات)

مولانا قیام الدین عبد الباری فرنگی محلی مرحوم و مغفور اپنے زمانہ کے مشاہیر میں تھے۔ ایک نامور اور خاندانی عالم، ایک مشہور اور خاندانی شیخِ طریقت۔ اور اب ملک بھر میں شہرت سالہا سال سے ان دونوں حیثیتوں سے بھی بڑھ کر بہ طور ایک قومی لیڈر اور سیاسی کارکن کے تھی۔ کانگرس میں پیش پیش، گاندھی جی کے ہر مشورہ میں شریک، تحریکِ خلافت کے علمبردارِ خصوصی، اور انجمن خدام کعبہ کے تو بانیوں میں سے تھے۔ صاحبِ نفوذ و اثر۔ اور صورۃً بھی بڑے وجیہ و شکیل۔ ذاتی خوبیوں کو گنانے پر آیئے، تو بڑے مہمان نواز، بڑے فیاض، بڑے ملنسار، بڑے ذی مروت، جود و کرم کے پتلے، ہر شخص کے کام آنے والے۔ اللہ کا دیا ہوا تھا بھی بہت کچھ۔ "سخنے" اور "قدمے" کے علاوہ "درمے" بھی سب کی مدد و خدمت کے لیے تیار۔ عقائد اور رسوم وہی جو عام طور پر اس زمانہ کے مشائخ کے ہوتے ہیں۔ درگاہوں اور مزاروں پر حاضری کے پابند۔ اپنے ہاں بھی سال میں دو بار عرسوں کی محفلیں دھوم دھام سے کرنے والے۔ علی برادران کے بعض عزیز شاید قبل سے بیعت میں داخل تھے۔ خود علی برادران کے ساتھ خدام کعبہ وغیرہ ابتدائی تحریکات کے زمانہ

مین خوب خلا ملا ہو چکا تھا۔ اُدھر خیال یہ تھا کہ مولویوں اور صوفیوں کی جماعت مین ایسا روشن خیال اور ملت پرور دوسرا کہاں ملے گا۔ ادھر قول یہ تھا کہ نیچریوں اور انگریزی خوانوں کی جماعت مین اس حمیتِ دینی کی مثال ملنی ناممکن۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے عاشق زار۔ وہ ان پر فریفتہ و گرویدہ، یہ اُن کے والہ و شیدا۔ نظر بندی کا زمانہ ابھی شروع شروع کا تھا۔ برادران ابھی لینسڈون ہی میں تھے، اور چھندواڑہ ہنوز منتقل نہیں ہوئے تھے کہ ایک روز مولانائے فرنگی محلی یک بیک بہ نفس نفیس تشریف لائے۔ اپنا ایک خواب بیان کر کے فرمایا "میرے ہاتھ پہ بیعت کر لو، ورنہ معلوم نہین کہاں جا پھنسو گے"۔

برادران نے چپکے سے ہاتھ بڑھا دیے، اور سلسلۂ عالیہ قادریہ رزاقیہ مین داخل ہو گئے

یہ ڈائری محمد علی سے متعلق ہے، ان کے مرشد سے متعلق نہین، تاہم جو کچھ آگے آرہا ہے اسکے سمجھنے کے لیے ان سے بھی اس حد تک، تعارف ناگزیر تھا۔

اگست ۲۵ء؁ کا مہینہ ہے۔ وسط ماہ کی تاریخین گزر چکی ہین۔ محرم کا مہینہ ابھی ابھی ختم ہوا ہے۔ مولانائے فرنگی محلی آستانۂ اجمیر پر حاضری دیکر لکھنؤ واپس ہوتے ہین۔ دہلی چند گھنٹہ کے لیے اترتے ہین۔ مع دو رفیقانِ سفر و حضر کے محمد علی سے ملنے آتے ہین۔ دوپہر کا وقت۔ محمد علی کے ہاں تخلیہ کہاں۔ لیکن آج خلاف معمول اتفاق سے تخلیہ ہے۔ کامریڈ کے اڈیٹر کے کمرہ کے اندر کل پانچ آدمی۔ مولانائے فرنگی محلی اور ان کے دونوں رفیق، چوتھے محمد علی اور پانچواں یہ ڈائری نویس۔ محرم کا زمانہ ابھی تازہ تھا۔ گفتگو تعزیہ داری اور بدعات محرم پر چلی۔ سچ اور مدیر سچ عین اسی زمانہ مین بہ سلسلۂ محرم بہت "نیک نام"

۱؎ یعنی غالباً ۱۹۱۵ء؁ کے اواخر میں۔

ہو چکا تھا، اور اس کی "وہابیت" ایسے حلقوں میں جن کا تعلق مولانائے فرنگی محلی سے رفاقت سفر و حضر کا تھا، پوری طرح مسلّم ہو چکی تھی۔ محمد علی نے بھی اس وقت کچھ ایسی ہی "وہابیانہ" باتیں شروع کر دیں، اور خود مولانا نے بھی بڑی حد تک موافقت فرما دی۔ بات میں بات نکلتی آئی۔ ذکر حضرت عثمانؓ کی شہادت کا چلا۔ مولاناؒ بہر حال ایک ممتاز فاضل تھے۔ کئی منٹ تک سیرت عثمانی پر ایک مفصل تقریر فرمائی۔ خلاصہ یہ تھا کہ "حضرتؓ کے مناقب و فضائل کا کیا پوچھنا، مجموعۂ کمالات ہی تھے۔ جس کے دل میں عثمانؓ کی محبت نہ ہو، اس کے ایمان میں فرق۔ لیکن حضرتؓ کے مزاج میں مروت بہت زائد تھی۔ حضرت علیؓ وغیرہ کے سامنے انتظامات میں اصلاح کا وعدہ فرما لیتے اور ان پر دل سے عمل بھی کرنا چاہتے۔ مروان بیچ میں حائل ہو جاتا، اور کام بنتا ہوا بگاڑ دیتا۔ آپ سمجھتے سب کچھ تھے" لیکن بس وہی مروت کی افراط، اس کی اجازت نہ دیتی کہ رخنہ اندازوں کو راہ سے دور فرما دیں"

— محمد علی سکوت اور سکون کے ساتھ پوری تقریر سنتے رہے۔ جب ختم ہوئی تو زور سے بول اٹھے۔ "حضرت وہی صورت آج بھی قائم ہے۔ عثمان غنیؓ کا حلم و مروت بھی آج موجود ہے، اور اس حلم و مروت سے فائدہ اٹھانے والے مروان بھی آج موجود ہیں"

— مولانائے فرنگی محلی بھی بڑے ذہین و زیرک اور نکتہ رس تھے۔ مرید کے اس فقرہ سے پورا لطف لیا۔ معاً سمجھ گئے کہ فقرہ کا رخ کس طرف ہے۔ پہلے مسکرائے پھر ہنسے، اور پھر دیر تک لطف لے لے کر ہنستے رہے۔

ہمدرد، یاد ہوگا کہ نومبر ۲۴ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب شریف حسین کو سالہا سال تک داد شقاوت دینے کے بعد بالآخر تخت حجاز سے رخصت

ہونا پڑا تھا، اور دنیائے اسلام اس کی اور اس کے اولاد کے مظالم سے پکار پکار کر پناہ مانگ رہی تھی۔ ہزار ہا بیگناہ مسلمانوں، حاجیوں اور حجازیوں کا خون اس کی گردن پر ثابت ہو چکا تھا۔ مظلوموں کے منہ سے بے اختیار اس کے حق میں بددعائیں نکل رہی تھیں۔ بیواؤں کے سینوں سے گرم گرم آہیں اس کے مظالم پر فریاد کر رہی تھیں اور یتیم بچے بلک بلک کر اس کی سنگدلی کا افسانہ سنا رہے تھے۔ دستِ قدرت نے آخر کار والیٔ نجد سلطان عبدالعزیز ابن سعود کو انتقام کے لیے اس پر مسلط کر دیا تھا۔ فتوحاتِ سلطانی کی خبریں برابر آ رہی تھیں۔ اور مصر و شام، ہند و عرب سب کہیں کے مسلمانوں کے مسلمانوں کے چہرے کھلے جا رہے تھے کہ آخر کار تو فریادرس نے ہماری سنی، اور مظلوموں کی نصرت کی گھڑی آ پہونچی۔ شریف اور خاندانِ شریف کی طرف سے مسلمانوں کے دل ایسے پکے ہوئے تھے کہ اسے نکالنے کے لیے کوئی بھی اٹھ کھڑا ہوتا تو مسلمانوں کے دل اسی کے ساتھ ہو جاتے۔ ادھر سونے پہ سہاگا، سلطان نے بار بار یہ اعلانات کرنے اور بیانات دینے شروع کرائے کہ "میں حجاز پہ کوئی اپنی بادشاہت قائم کرنے نہیں آ رہا ہوں، میں تو اس ارضِ پاک کو شریفین کے پنجۂ ظلم و ستم سے نجات دلانے کو اٹھا ہوں۔ ذریاتِ شریف کے نکل جانے بعد مسلمان جانیں اور ان کا کام۔ وہ جسے چاہیں اپنا حکمران منتخب کر لیں گے"۔ ——— مسلمانوں کے دلوں میں اب سلطان کا گھر اور ہونا شروع ہوا۔ ساتھ ہی فتحمندیوں کی خبریں بھی روزانہ آنا شروع ہو گئیں۔ آج مکہ معظمہ پہ قبضہ ہو گیا، کل طائف ہاتھ آ گیا۔ آج شریف علی (ولیعہد شریف حسین) جدہ میں محصور ہو گیا۔ کل اس کی فوج نے علاج بالمثل کے اصول پہ عمل کر کے خود اس سے غداری کر دی۔ ہر صبح یہی چرچے، ہر شام یہی خبریں۔

لیکن شریف کے تعلقات سرکار برطانیہ سے تو آخر بڑا خواہی وفاداری کے تھے۔

اور پھر سلطان نجد آخر "نجدی وہابی" تھا۔ بدایون "شریف" اپنی پوری قوت کے ساتھ شریف کی حمایت و نصرت مین سرگرم ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور لاہور اور علی پور، اور بمبئی اور پھلواری، اور اجمیر اور کلیر، ہندوستان کے شمال وجنوب، شرق وغرب مین جہان جہان بھی "خوش عقیدہ" بزرگوارون کی بستیان، اور موروثی پیرزادوں کی عملداریان تھین، سب کہیں کے تار بہ یک وقت حرکت مین آگئے۔ اور، خیر! ایکا ان ہی سب کا ہوتا جب بھی محمد علی کے نقطۂ نظر سے کچھ ایسا مضائقہ نہ تھا، غضب یہ تھا کہ ان سب کی کمک پر فرنگی محل کا زبردست مورچہ بھی تھا، جو بیک وقت شریعت کا بھی دار الافتا تھا اور طریقت کی بھی خانقاہ، اور سیاست کا بھی پلیٹ فارم!

دنیاے اسلام کی سیاست اور عالم اسلامی کی فلاح وبہبود دوسرون کیلئے چاہے مشغلۂ تفریح ہو، محمد علی نے یہ سودا نقد جان دے کر خریدا تھا۔ اسی ایک غم مین کیا کچھ نہیں جھیلنا پڑا تھا۔ عزت گنوائی، دولت گنوائی، صحت گنوائی۔ برسون کی مدت نظربندی مین کاٹی۔ جیل خانہ دو دو بار گئے۔ قید تنہائی اٹھائی۔ اللہ کے گھر کی حفاظت کی فکر کی تو خود اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ رام پور کی خاک کے ذرہ ذرہ سے محمد علی کا دل اٹکا ہوا تھا، اس سرزمین پر قدم رکھنا بھی اب محمد علی کے لیے جرم قرار پا گیا تھا۔ خدا معلوم کتنی راتین جاگ جاگ کر، کتنے دن بے چینی سے کاٹ کاٹ کر، ہفتون نہیں، مہینون بلکہ برسون کے غور وفکر کے بعد محمد علی بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اصلاح حجاز اگر مقصود ہے تو آیندہ ہمیشہ کے لیے اس ارض پاک کو بادشاہ گردی سے نجات دلادی جائے۔ یہ سارے فتنے بادشاہت اور ملکیت کے ہین۔ اب یہ نہ ہونے پائے کہ آج شریف کا دور دورہ ہے تو

ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کی کتابین تلاش کر کر کے ان کے اوراق نذر آتش کیے جا رہے ہین، کل نجدیون کا تسلط ہوا تو قبون اور قبرون پر پھاوڑے چلنے لگے۔ پرسون باگ حکومت یمن کے زیدیون کے ہاتھ مین آئی تو شیخین رضی اللہ عنہما کی بے توقیری ہونے لگی بس ایک شرعی جمہوریت، تمام مسلمانانِ عالم کے صلاح و مشورہ سے، ساری دنیائے اسلام کی رائے و شوریٰ سے قائم ہو جائے اور روز روز کا یہ جھگڑا مٹے۔ سیاسی قوت و اقتدار بھی جبھی ممکن ہے، جب اسے مرکزیت حاصل رہے۔ آج کسی کی نظر مین حکومتِ حجاز کی وقعت ہی کیا ہے۔ غریب سلطنت اتنی بڑی بھی تو نہین، کہ حیدرآباد تو خیر بڑی چیز ہے، میسور کی بھی برابری کر سکے۔ فرنگی سمجھتا ہے کہ جب جی چاہے گا، چٹکی سے مسل کر رکھ دون گا۔ عالم اسلام کی جمہوریت قائم ہو جائے تو کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ پڑے، اور شیر برطانیہ یا عقاب جرمنی، سب سمجھ لین کہ اب مقابلہ تنہا حجاز سے نہین کرنا ہے، بلکہ ایک ہی وقت مین مصر سے، یمن سے، عراق سے، شام سے، طرابلس سے، البانیہ سے، افغانستان سے، ایران سے، ٹرکی سے، جاوا سے، سماترا سے، بخارا سے، مسلم چین سے، مسلم ہندوستان سے، سب سے اور سب کہیں کرنا ہے ——— محمد علیؒ اسلامی ہند کے لیڈر اور زعیم مشرق کی آنکھ سوتے اور جاگتے برسون سے یہ خواب شیرین دیکھتی رہی، رات کی نیندین اور دن کی بیداریان مدتون اس آرزو کی پرورش پر قربان ہوتی رہین۔ زبان اسی کی دعائین کرتے کرتے تھکی جا رہی تھی۔ سلطان نجد کے اعلانات سے پہلی بار خواب کی تعبیر پوری ہوتی نظر آئی۔ دل باغ باغ ہو گیا اور جی نہال۔ ترکون کی تنسیخ خلافت کا گہرا زخم دل پر ابھی تازہ تھا۔ جوان اور لاڈلی بیٹی کا داغ جگر پر تازہ تر تھا۔ محمد علی کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے غیب سے نزولِ مرہم کا سامان ہونے لگا۔ خلافت کمیٹی کی طرف سے شام مین وفد حجاز بھجوایا۔ اس کے ذریعہ سے

سلطان کے پاس زبانی پیام کہلایا۔ خلافت کمیٹی میں بار بار تجویزین پاس کرائین۔ الگ سے سلطان کے پاس تار بھیجے۔ ہر تان اسی شرعی جمہوریت پر آکر ٹوٹتی ــــــــ خود سلطان نے اپنی تقریرون مین، اعلانات مین، خطوط مین، ایک بار نہین، بار بار اور ڈھکے مُندے اشارون مین نہین، ہانک پکار کر وعدہ کیا کہ مجھے ملک گیری کی ہوس نہین ہے حجاز پر حکومت اپنی نہین، شریعت مطہرہ کی قائم کرنا چاہتا ہون۔ ظالمون کے وجود سے اس خطۂ پاک کو پاک کرنے کو اٹھا ہون، آیندہ حکومت کے لیے خود مسلمان جسے چاہیں منتخب کریں۔

باب (۳۵)

۱۹۲۵ع (۵)

"وہابیت" - "مدینہ منورہ" پر گولہ باری)

محمد علی کی ان بلند خیالیون تک کس کا دماغ پہنچتا؟ ان دور اندیشیون اور مصلحت
کو کون سمجھتا ہے اور کون ان کی قدر کرتا ہے کس نے ان مسائل پر اتنی دماغ سوزی کی تھی؟
کون ان مسائل کی اُدھیڑبن میں اس طرح خون جگر کھا کھا کر رہا تھا؟ ادھر سلطان
کی پیشقدمیوں اور فتحمندیون کی خبرین آنی شروع ہوئین کہ ادھر شامت کے مارے
ہندی مسلمانون مین دو اکھاڑے قائم ہو گئے۔ اور سب و شتم سے گزر کر نوبت "رفع ید"
تک آ گئی۔ ایک صف مین سلطان کے دوست تھے مگر نادان۔ دوسرے فریق
مین سلطان کے دشمن تھے مگر دانا وہ بھی نہین، دوستون ہی کی طرح نادان۔ اصل مسئلہ
کو بھول بھال اور اصلی تنقیح کو چھوڑ چھاڑ، بحث "عقائد" کی شروع ہو گئی۔ اور "تبدع
و توہب" کا وہ زبردست دیو، جو سویا کبھی بھی نہ تھا، درمیان مین ذرا اونگھنے لگا تھا، نئے
سے چونک کر، پوری قوت کے ساتھ ہر طرف دوڑنے دھوپنے، چیخنے چنگھاڑنے لگا۔ ادھر
سعودیوں کی فتح سے خوش ہو ہو کر، اہل حدیثون نے، غیر مقلدون نے، کتاب و سنت
کی پیروی کا دعوی رکھنے والون نے نعرے لگائے کہ اب کیا ہے، پالا مار لیا ہے، یہ

کمبخت بدعتی اور گور پرست اب تو آخر نیچا دیکھ کر رہے۔ اُدھر شریفیوں کی شکست سے ملول و مغموم ہو کر بریلویوں نے، علی پوریوں نے، "سنی حنفیوں" نے شور غم و واویلا بلند کیا، کہ ہائے یہ کیا غضب ہوا کہ جا رہا ہے، ان ناشدنی وہابیوں کا بھی یہ منہ اور یہ حوصلہ ہوا کہ مکہ اور مدینہ پہ اپنا علم نصب کرنے کا خواب دیکھنے لگیں ——— "مشائخ" اور پیرزادے، درگاہوں کے سجادے اور مزارات کے مجاور، سب ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے کہ یہ ہمارا دشمن اندا کہاں سے نکل پڑا۔ شریف آلِ رسول تھا۔ یہ اس کے مقابلہ میں آیا ہے، یہ مردود ہے، وہابی ہے، جہنم کا کندہ ہے، کانا دجال ہے، شیطان ہے، یہ اگر جیتا تو ہم کو جیتا نہیں چھوڑنے کا!

مولانائے فرنگی محلی لکھنؤ میں، محمد علی دہلی میں، دونوں کی ٹکٹکی برابر مطلعِ حجاز پہ لگی ہوئی۔ ایک کی نگاہ میں مقابر مسلمین کا احترام، دوسرے کے پیش نظر مصالحِ عالمِ اسلام۔ مقصود دونوں کا خدمتِ دین۔ لیکن اپنی اپنی بصیرت اور اپنا اپنا مقام۔ اجتہاد میں غلطیاں بڑے بڑے کاملین سے ہوئی ہیں۔ پہلی صدی کے اکابر سے ہوئی ہیں، تو چودھویں صدی کے علماء و مشائخ بیچاروں پر زیادہ گرفت کیوں کیجئے، اور انھیں طعن و اعتراض کا ہدف کیوں بنائے رکھیے۔ ادھر مولانائے فرنگی محلی کی سمجھ میں یہ نہ آتا کہ محمد علی خوش عقیدہ صوفی اور حنفی ہو کر وہابیہ اور نجدیہ کی حمایت کیسے کرنے لگا، اور غیر مقلدین کا شریکِ حال کیونکر بن گیا۔ ادھر محمد علی کی عقل یہ سمجھنے سے قاصر کہ مولانائے فرنگی محلی انگریزی تسلّط سے اس قدر بیزار اور مرکز اسلام کی آزادی کے لیے اس قدر بیقرار ہو کر اُس فریق کے شریک کار کس طرح ہوتے جا رہے ہیں جو ارض پاک میں فرنگی حکومت کو مداخلت کی دعوت دے رہا ہے۔

یہ اپنی طرف دنگ، وہ اپنی طرف حیران۔ پہلے آپس میں بڑی مفصل و موثر مراسلت رہی۔ اسکے بعد وسط اگست میں مولانا لکھنؤ سے اجمیر جاتے ہوئے دہلی میں اترے اور محمد علی سے مل کر گھنٹوں زبانی گفتگو کی۔ یہ سب کچھ ہو لیا۔ اس پہ بھی مشیت کے ہاتھ کا لکھا ہوا کہیں مٹتا ہے؟ ——— تاریخ ایک چھوٹے پیمانے پر دورِ عثمان غنیؓ اور دورِ مرتضیؓ کو دہرا رہی تھی۔

غلط فہمیاں بجائے گھٹنے کے بڑھتی ہی گئیں۔ ایک گتھی اگر سلجھتی تھی، تو اسکی جگہ دو اور پیدا ہو جاتی تھیں۔ جو دل جڑے ہوئے تھے، ان میں روز بروز دراڑیں ہی پڑتی چلی گئیں، اور درمیانی لوگ طرح طرح کی دراندازیوں میں مصروف۔ مولانائے فرنگی محلی نے کہا کہ مصالحت یوں ہو سکتی ہے کہ جو مسجدیں نجدیوں کے ہاتھوں مسمار ہوئی ہیں، سلطان اس انہدام پر اظہار ملامت کریں، اور جو قبّے گرائے جا چکے ہیں، انھیں اپنے صرفہ سے از سر نو تعمیر کرا دیں، یا کم از کم دوسروں کو اسکی اجازت دیدیں۔ محمد علی کا کہنا یہ تھا کہ خیر ان مطالبات کے پیش کر دینے میں تو مضائقہ نہیں، لیکن ہے یہ مسئلہ عالمِ اسلامی ہی کی کانفرنس کے طے کرنے کا، جس میں ہر فرقہ کے علماء شریک ہوں۔ مولانائے فرنگی محلی کے یہ مطالبات اخباروں میں نکلے۔ لیکن لکھنے والے نے تمہید میں یہ جڑ دیا کہ مولانا محمد علی کو بھی ان مطالبات سے اتفاق ہے ——— حضرت عثمان غنیؓ کے خطوط ہیں مروان کی "اصلاحوں" کی یاد، تاریخ کی مدد سے، تازہ کر لیجئے!

یہ تحریر اور تو اور، خود ہمدرد میں بھی بجنسہٖ نکل گئی۔ محمد علی نے اپنے اس "اتفاقِ رائے" کو جب پڑھا، تو بڑی تکلیفِ قلب محسوس کی۔ دوسرے ہی دن اپنے نام کے ساتھ مفصل تردید، مگر اتنے ہی جزو کی، ہمدرد میں چھپوائی۔ یہ مضمون اگرچہ محمد علی کے نام سے ہے، لیکن اب اس راز کے افشا میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ لکھا ہوا تھا انکے اشارہ کے مطابق اور انکی

اصلاح و ترمیم کے بعد انکے اسی نیاز مند ڈایری نویس کا۔ ادھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا کہ اُدھر یک بیک ۲۴ اگست کو لندن سے چلا ہوا وہ مشہور و معروف تار آگیا، جس مین مسجد نبوی پر نجدیوں کی گولہ باری کی خبر درج تھی۔ اس تار کا شایع ہونا تھا کہ گویا سرزمین ہند پر ایک بھونچال آگیا، آگ پر مٹی کا تیل پڑ گیا، اور شعلے لپک لپک کر آسمان سے باتین کرنے لگے!

---

۲۴ اگست ۱۹۲۵ء: مین دہلی مین کئی روز سے ہون۔ ریف اور حجاز دونون جگہ کی خبرین روزانہ جاذب توجہ بنی ہوئی ہین۔ ریف کی خبرین بڑی امیدون کے ساتھ اور حجاز کی خبرین تردد و اندیشہ کے ساتھ ہر روز پڑھی جا رہی ہین۔ محمد علی اپنی بڑی صاحبزادی زہرہ بی کے چھوٹے بچے عارف کی وفات کی خبر پاکر مع بیگم صاحبہ رامپور گئے ہوئے ہین۔ نہین، یہ فقرہ غلط لکھا گیا، رامپور شہر کی سرزمین پر قدم رکھنے کی اجازت ہی کہان تھی۔ رامپور نہین، صرف رامپور اسٹیشن گئے ہوئے ہین۔ دوپہر کا وقت ہے، کامریڈ کے ایڈیٹوریل کمرہ مین مین کھانا کھا رہا ہون کہ ہمدرد کے چیف سب ایڈیٹر عارف ہسوی صاحب کمرہ مین داخل ہوتے ہین۔ اور حسرت و یاس کے ساتھ ہاتھ پٹخ کر کہتے ہین کہ "نجدی آخر اپنی ہٹ پوری کر کے رہے، مدینہ پر گولہ باری کی خبر آگئی۔ ہم یہان انکی بات بنا رہے تھے اور وہ ظالم آخر اپنی والی حرکت کر گزرے" —— مین حیران و ششدر، منہ کا نوالہ منہ مین اور ہاتھ کا ہاتھ مین عارف صاحب کا منہ دیکھنے لگتا ہون، کیا واقعی خبر آگئی؟ عارف صاحب جل کر جواب دیتے ہین۔ "ہان ہان صاحب کیہ تو رہا ہون۔ رائٹر کا تار ہے، صاف صاف بمبارڈمنٹ کی اطلاع ہے"۔ جھٹ پٹ ہاتھ دھو دھلا عارف صاحب کے ساتھ مین اس کمرہ مین آتا ہون، جہان ہمدرد کا

---

۱ اردو روزنامون مین اس وقت تک رات کو کام کرنے کا رواج نہ تھا۔ تار دن ہی مین موصول ہوتے اور سہ پہر تک پرچہ مرتب ہو کر پریس کو دیدیا جاتا۔ شام کو شائع ہو جاتا۔

اڈیٹوریل اسٹاف کام کر رہا تھا۔ اور جی ہی جی میں دعائیں کرتا آیا کہ خدا کرے یہ بات ہی جھوٹ نکلے

عارف صاحب انگریزی جانتے نہیں، خدا کرے تار کا مطلب غلط سمجھے ہوں! ــــــــ

بے بس بندہ بھی اضطراب واضطرار میں کیسے کیسے بودے سہاروں کی طرف دوڑتا رہتا ہے!

دفتر میں تار میز پر رکھا تھا۔ خود پڑھا۔ اور دل جس چیز کو ماننا کسی طرح نہیں چاہتا تھا، اسے ماننا پڑا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس تار کو کیا کیا جائے۔ کسی نے کہا اسے شائع ہی نہ کیا جائے۔ دوسروں نے کہا، اس سے نتیجہ؟ تار رائٹر کا ہے، بہر حال انگریزی اور سب ہی اخبارات میں پہنچا ہوگا اکیلے ہمدرد کے نہ چھاپنے سے خبر تو چھپنے سے رہی۔ پھر ہمدرد اپنے سر مزید جرم خفائے خبر کا کیوں لے؟ مولانا موجود نہیں، ہدایت و رہنمائی کس سے حاصل کی جائے؟ حیص بیص قیل و قال: بالآخر طے پایا کہ "تار اخبار میں دے تو بہر حال دیا جائے لیکن نمایاں نہ کیا جائے۔ اور عنوان ایسا دیا جائے، جس سے خبر کی اصلیت ہی مشتبہ ہو جائے۔ یعنی "حملۂ مدینہ منورہ کے متعلق انگریزی بیان"۔ تار لندن سے آیا تھا اس لیے یہ عنوان بالکل مطابق واقعہ تھا۔ اور تار کے ترجمہ کے ساتھ یہ نوٹ بڑھا دیا جائے کہ مسلمان ابھی اس خبر کی تصدیق کا انتظار کریں۔ اور فوراً کوئی اشتعال نہ قبول کریں۔ سینیر مترجم ڈاکٹر سعید احمد بریلوی تھے۔ ان ہی نے یہ سب کچھ کیا۔

ــــــــ • ــــــــ

باب (۳۶)

سنہ ۱۹۲۵ء (۶)

(ادھر تحقیق و احتیاط - اُدھر ہڑبونگ)

۲۴ اگست سنہ ۲۵ء - مولانا شب کی ٹرین سے بہت رات گئے واپس آگئے تھے صبح سویرے ہی دفتر ابھی کہاں کھلا تھا، اور اتنے سویرے اڈیٹوریل صیغہ کا کوئی رکن حاضر بھی کیسے ہو سکتا تھا، سب سے پہلی بات جو مجھ سے ارشاد فرمائی، وہ یہ سوال تھا کہ ریف کی کیا کیا خبریں آئیں؟

ریف میں غازی عبد الکریم اسپین کے مقابلہ میں جہاد کر رہے تھے، اور اُس وقت تک برابر کامیابیاں حاصل کر رہے تھے - خبریں سن سن کر خوش سب ہی مسلمان ہو رہے تھے لیکن محمد علی کے دل کی خوشی کا کیا کہنا - خدا معلوم صبح تک کا انتظار ان سے کیسے کیا گیا - رات ہی میں مجھے اٹھا کر کیوں نہ خبریں دریافت کیں، یا اسی وقت اخبار پڑھنا کیوں نہ شروع کر دیا!

جواب میں میں نے عرض کیا کہ "جی - ریف کی تو ایسی کوئی خاص خبر نہیں - البتہ مدینہ منورہ کے متعلق خبر آئی ہے کہ نجدیوں نے مسجد نبوی پر گولہ باری کر دی" چھوٹتے ہی، بلا ایک لمحہ کے توقف کے غصہ کے ساتھ بولے "جھوٹ ہے جھوٹ - ہمدرد میں کہیں چھاپ تو نہیں دیا؟" میں جی میں لرز گیا کہ بس اب ڈانٹ پڑا کر رہی - جی کڑا کر کے جواب دیا کہ "ریوٹر کا تار ہے - سب ہی اخباروں میں آیا ہوگا کیونکر چھپا یا جاتا - البتہ خبر ان احتیاطوں کے ساتھ دی گئی ہے"۔ احتیاطوں کی تفصیل بیان کی

بولے "خیر، غنیمت ہے" پھر سکون و سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "ان خبرون کے چھاپنے میں بڑی احتیاط رکھنی چاہیے۔ ہر ہر طرح کی جھوٹی خبرین آئین گی تاکہ مسلمان آپس مین خوب لڑیں"۔

عارف صاحب کی بھی ایک عمر اخبار نویسی مین گزر چکی تھی، اور اپنے خیال میں وہ خبرون کے شعبہ مین مرتبہ ماہر کا رکھتے تھے، لیکن یہان تک نگاہ تو صرف محمد علی کی پہنچ سکتی تھی۔ یہ جھلک اس فراست ایمانی کی تھی جس کا نقشہ ان الفاظ مین دکھایا گیا ہے۔

واذا جاءھم امرٌ من الامن	انھین جب کوئی خبر امن یا خوف کی پہنچتی ہے
او الخوف اذاعوا بہ ولو ردوہ	تو اسے خوب پھیلا دیتے ہین، حالانکہ اگر
الی الرسول والی اولی الامر منھم	یہ اسے رسول اور اپنے مین سے صاحبانِ امر
لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم	کیطرف پہنچا دیتے، تو جو ان مین سے بات کی تہ
(نساء - آیت ۸۳)	تک پہنچ سکتے ہین وہ اسے سمجھ لیتے۔

وہی دن، وہی تاریخ۔ دوپہر کا وقت تھا۔ کھانا ہو چکا تھا، یا ہو رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ معلوم ہوا کہ ٹرنک کال ہے، اور دفتر کے چپراسی نے آکر کہا کہ ٹیلیفون لکھنؤ سے بول رہا ہے، اور وہ صاحب خود سرکار سے بات کرنا چاہتے ہین۔ محمد علی خود اٹھ کر فون پر گئے لکھنؤ سے چودھری خلیق الزمان بول رہے تھے۔ چودھری صاحب یو، پی کے لیڈرون مین سے تھے۔ ۲۱ء مین جیل کی ہوا کھائے ہوئے، اور تحریک خلافت کے سلسلہ مین نام پائے ہوئے۔ لکھنؤ میونسپل بورڈ کے صدر اور اس وقت تک محمد علی کے ایک مخلص نائب۔ انھون نے اپنی کوٹھی واقع خیالی گنج سے کہا "مولوی عنایت اللہ صاحب فرنگی محل سے مولانا عبدالباری صاحب کے بھیجے ہوئے ابھی آئے ہین۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے ہین۔ کہتے ہین، کل کے تار کے بعد اب خاموشی ناممکن ہے۔ مدینہ منورہ کی گولہ باری پر مسلمان کسی طرح ضبط نہین کر سکتے۔ لکھنؤ مین

ایک بڑا جلسہ کرنے والے ہیں۔ مجھ سے شرکت کے لیے کہا۔ میں نے کہا کہ مولانا محمد علی کا مشورہ سب پر مقدم ہے۔ سلطان ابن سعود کا اگر یہ جرم ثابت ہو جائے تو پھر کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ مولوی صاحب یہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ کے جواب کے منتظر ہیں۔ جو کچھ فرمایئے، ان سے کہہ دوں"

ــــــ یہ مولوی مفتی عنایت اللہ صاحب علاوہ مولانا عبد الباری ؒ کے عزیز قریب اور شاگرد اور مسترشد ہونے کے، خود بھی ایک صاحب علم و نظر فقیہ اور مدرسہ عالیہ نظامیہ فرنگی محل کے صدر تھے۔

محمد علی نے جواب میں کہا کہ "بیشک جو بھی کارروائی ہو، متفقہ ہونا چاہیے۔ لیکن مجھے تو ابھی تک اس خبر ہی پر یقین نہیں۔ سب سے مقدم خبر کی تحقیق ہے۔ تار لندن سے آیا ہے۔ اس میں بھی حوالہ بیت المقدس کے نامعلوم ذرائع کا ہے۔ تحقیق کی بہترین صورت یہ ہے کہ مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی سے بیت المقدس مسلم سپریم کونسل (مجلس اعلی) کے نام جوابی تار دے۔ یہ سپریم کونسل بھی انگریزوں ہی کے زیر اثر ہے اور شریف کا بیٹا عبداللہ بھی وہاں موجود ہے۔ تاہم مفتی امین الحسینی سے مجھے امید ہے کہ وہ ضرور صحیح اور سچی خبر دیں گے۔ یہاں جو کچھ بھی کیا جائے۔ اس تحقیق کے بعد نہ کہ اس کے قبل۔ اور اس میں زیادہ دیر بھی نہ لگے گی، ایک ہی دو روز لگیں گے۔ مولانا سے میری طرف سے بہت زور دے کر یہ کہہ دو کہ خدا کے لیے تھوڑے سے صبر و ضبط سے کام لیں۔ جوش کو بے محل نہ صرف ہونا چاہیے۔ شوکت کو بھی بمبئی ٹیلیفون کریں، میں ابھی انھیں ابھی ٹیلیفون کر چکا ہوں (یا کر رہا ہوں)"۔ یہ آخری فقرہ اتنے عرصہ کے بعد خوب یاد نہیں۔ "کر چکا ہوں" کہا تھا یا "کر رہا ہوں"۔ بہر حال کہا جو کچھ ہو بمبئی ان کا فون کرنا اچھی طرح یاد ہے۔ خود ہی ٹیلیفون پر کھڑے ہو کر دیر تک شوکت صاحب کو بیت المقدس جوابی تار دینے کی ہدایتیں کرتے رہے۔ خیال غالب یہی ہے کہ بمبئی کو وہ ٹرنک کال پہلے ہی کر چکے تھے، اس کے بعد لکھنؤ والا فون آیا۔ بیت المقدس کے مفتی اعظم شیخ امین الحسینی (جو آخر ۱۹۵۴ء میں اس ڈائری کے نقش ثانی کی تحریر کے وقت ماشاء اللہ ہر طرح صحیح سلامت اور خدمات ملی میں مصروف

ہین) انھین پورا اعتماد تھا[1] ـــــــ آج اتنے عرصہ کے بعد ٹھنڈے دل سے دیکھیے، تو یہی روش سب سے زیادہ سلجھی ہوئی، اور عقل و دیانت کے مطابق نظر آئے گی۔ لیکن اُس وقت جوش و ہیجان کے عالم مین یہ ہوشمندانہ کارروائی قابلِ صد ملامت ٹھہری، اور محمد علی کی طویل فردِ جرم مین ایک اہم عنوان قرار پائی۔

اصل تار، جس پر یہ ساری قیامت برپا ہو رہی تھی، اس کا لفظی ترجمہ یہ تھا: "لندن ۲۳ راگست بیت المقدس کا ایک تار مظہر ہے کہ معتبر ذرائع سے علم ہوا ہے کہ نجدیون نے مدینہ پر حملہ کر دیا۔ اور دو روز ہوئے کہ گولہ باری شروع ہو گئی، جس کے نتیجہ کے طور پر اس مسجد اعظم کے جس میں پیمبر کا مزار ہے، گنبدون کو بہت نقصان پہنچا ہے۔" (رائیٹر)

خلافت کمیٹی کا پہلا وفد حجاز، جس میں مولوی محمد شفیع داؤدی (لیڈر کیٹ صوبۂ بہار) مولانا محمد عرفان، مولانا عبد الحلیم صدیقی اور قمر احمد صاحب خازنِ سیکریٹری۔ پی، سلے و ایڈیٹر ردِ زنامہ خلافت۔ بمبئی) وغیرہ شامل تھے، ابھی ابھی سلطان ابن سعود سے مل کر واپس آیا تھا اور اسے سلطان اطمینان دلا چکے تھے کہ ہدم عمارات متبرکہ کے جو واقعات مکہ معظمہ مین ان کی غیر حاضری اور لاعلمی مین پیش آ چکے تھے، ان کا اعادہ مدینہ مین ہرگز نہ ہونے پائے گا۔ اس اطمینانی اطلاع کے بعد یون بھی یہ تار قابلِ اطمینان نہ تھا، پھر اس کا اس چکر کے راستہ سے آنا سے اور بھی مشتبہ بنا رہا تھا۔ اس سب کے علاوہ تار کا بین السطور خود یہ کہہ رہا تھا کہ نجدی فوج کے حملہ کا اصل ہدف شہر مدینہ ہے، جہان "شریف زادہ" امیر علی بن حسین کی فوجین موجود تھین، نہ کہ مسجد نبوی۔ مسجد کے قبون کو گزند اگر پہنچا ہے تو ضمناً اور گویا محض بے احتیاطی سے پہنچ گیا ہے۔

---

[1] بلکہ ماشاءاللہ اس مسودہ کی نظرِ ثانی کے وقت شروع ۱۹۵۴ء میں بھی۔

سب سے بڑھکر یہ کہ روضۂ رسول کے گزند پہنچے بلکہ اس پہ حملہ ہونے سے بھی یہ تار یکسر خاموش تھا! لیکن اندھا دھند جوش کا بھلا ہو کہ یہ طرفہ شور بھی مچ گیا کہ وہابیوں نے روضۂ رسول پر حملہ کر دیا، اور گنبد سبز پہ گولہ باری شروع کر دی! ——— ہندوستان کی ساری آبادیوں میں جہاں جہاں بھی "خوش عقیدگی" کی حکومت تھی، پیرزادوں کی کوئی بستی تھی "مشائخ" کا کچھ بھی اثر تھا، بس ایک ہیجان اور غضبناکی کی دوڑ دوڑ گئی کہ مردود وہابیوں نے گستاخی کی حد اور بے ادبی کی انتہا کر دی! بمبئی، کراچی، مرادآباد، لکھنؤ، لاہور، بدایوں وغیرہ جو جو شریفی مرکز تھے، سب کہیں بڑے بڑے "جنگی" جلسے ہونے لگے اور جلسے ہنگاموں کی شکل پکڑتے گئے۔ لکھنؤ کے شریفی جلسہ میں مولوی عبد الرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم نے کچھ بولنا چاہا، تو مع اپنے رفیقوں کے پٹتے پٹتے بچے۔ بمبئی کا ماجرا اس سے بڑھ کر رہا۔ کراچی میں مولانا ظفر علی خان (لاہور) کی "خبر لے لی گئی"۔ بدایوں "شریعت" نے سرکار برطانیہ سے مداخلت کی درخواست کھلم کھلا کر دی اور حنفی، وہابی، یا سُنی۔ وہابی کی جنگ کا میدان سالہا سال سرد رہنے کے بعد تازہ جوش و خروش کے ساتھ از سر نو گرم ہو گیا! ——— یہ ڈائری محمد علی کی ذات و صفات سے متعلق ہے۔ کوئی شریفی، سعودی محاربہ کی تاریخ نہیں۔ ان اوراق میں اس جنگ کی تفصیلات کے منتظر نہ رہیے۔ ڈائری میں اس جنگ کا ذکر تو صرف اس حد تک آئے گا، جہاں تک اسکا تعلق محمد علی سے ہے، اور اس کے بھی صرف وہ حصے جو ڈائری نویس کے ذاتی علم میں ہیں۔

باب (۳۷)

۱۹۲۵ء سنہ (۷)

(محمد علی کی "وہابیت" شریفی سعودی جنگ)

لکھنؤ اپنی مبالغہ پسندی اور تخیل نوازی کے لیے شروع سے مشہور چلا آرہا ہے۔ طلسم ہوش ربا اور فسانۂ عجائب کی داستانیں آخر اسی سرزمین پر "تصنیف" ہوئی ہیں۔ عالموں فاضلوں کا نمبر ۱۹۲۵ء میں اگلے شاعروں اور افسانہ طرازوں سے بڑھ چڑھ کر رہا۔ لکھنؤ میں جلسۂ عظیم کا جو اشتہار عظیم شائع ہوا اس کا عنوان عظیم رکھا "قیامت کبریٰ" اور اس کاغذی قیامت کبریٰ کے متن کی شرح میں دوسرا عنوان رکھا "گنبد خضراء پر گولہ باری"! ——— "مضمون آفرینی" کا یہ وہ مقام، اپنوں کے قلم و دماغ کا حاصل کیا ہوا تھا، جہاں تک فرنگی بیگانوں کے بھی دماغ کی رسائی نہیں ہوئی تھی! تار میں صراحت صرف شہر مدینہ پر حملہ کی تھی، صراحت تو مسجد نبویؐ تک پر حملہ کی نہ تھی، صرف اس کا استنباط ہوتا تھا۔ نکتہ وران لکھنؤ نے مسجد نبویؐ الگ رہی، گنبد خضرا تک کی تصریح چھاپ دی! (تار میں روضۂ اقدس کا نام تو صرف مسجد نبویؐ کی شناخت کی غرض سے تھا) العظمۃ للہ! ان عنوانات پر اشتہار اور پوسٹروں کی ساری عبارت کو قیاس کر لیا جائے۔ نتیجہ وہی نکلا جو قدرۃً نکلتا، اور شاید وہی مقصود بھی ذمہ دار اشتہار نویس بزرگوں کا تھا!

روضۂ اطہر کی بے حرمتی سنکر کون مسلمان اپنے جذبات پر قابو رکھ سکتا تھا؟ اک آگ سی

لگ گئی۔ شریفی پارٹی کی بن آئی۔ منہ مانگی مراد ملی۔ پروپیگنڈا دل کھول کر اور جی بھر کر ہوا۔ تحریر، تقریر، جلسہ، جلوس، نظم، نثر، اشتہار، پوسٹر، سارے ہی حربے نکل پڑے۔ لکھنؤ کا روزانہ پریس (تین ہی اخبار اس وقت مسلمانوں کے تھے) کہنا چاہیے کہ اسی جماعت کی مٹھی میں تھا۔ اتنوں کی حمایت کافی نہ سمجھ کر ایک اور مستقل روزنامہ اسی مقصد سے نکالا گیا۔ سید جالب صاحب اپنی ذات اور خیالات کے اعتبار سے فرنگی محل کے معتقد اور ہم مسلک تھے۔ لیکن ایک تو طبعاً نجان مرنج قسم کے تھے اور متانت اور سلامت روی ان کے قلم کا خاص جوہر تھی، پھر یہ بھی تھا کہ ان کے پرچہ کے ڈائرکٹروں میں اودھ کے نامور ایڈوکیٹ حاجی محمد نسیم صاحب اور لکھنؤ کے مسلم لیڈر چودھری خلیق الزماں جیسے "سعودی" حضرات بھی تھے۔ اس لیے ہمدم تو مخالفتِ ابن سعود میں حدود سے آگے نہیں بڑھا۔ باقی عام مقرروں کی آتش بیانیاں، اخبار والوں کی شوریدہ نگاریاں، شیعہ تعلقداروں کی زرپاشیاں، ماتمی انجمنوں کی کارگزاریاں ان سب نے مل ملا کر لکھنؤ کی فضا ایسی تیار کر دی تھی کہ ادھر کسی نے کلمۂ حق زبان سے نکالا، ادھر معاً اس پر "وہابی" ہونے کا فتویٰ لگ گیا۔ ہمدرد کے وقائع نگار لکھنؤ، فرنگی محل ہی کے ایک اہل قلم تھے۔ اب ان کے اس تعلق کے برقرار رہنے کا کیا امکان رہ گیا تھا،

ہمدرد کی روش اس موقع پر بھی قابل داد رہی۔ قبوں کی حمایت و مخالفت میں اس نے دو دو سنجیدہ مقالے، دونوں فریقوں کے لے کر اس بحث ہی کو ختم کر دیا۔ قبوں کی حمایت میں لکھنے والے مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ اور مولانا مفتی محمد عنایت اللہ فرنگی محلی تھے۔ اور مخالفت کرنے والے، مولانا خواجہ عبد الحیؒ (استاد تفسیر جامعہ ملّیہ) اور یہ نیازمند ڈائری نویس۔ ہمدرد سلطان ابن سعود کی سیاسی پالیسی کی حمایت کرتا رہا، لیکن ان کے مذہبی عقائد کی

ہمنوائی کبھی بھی نہ کی۔ شدید سے شدید اشتعال کے وقت، بجز ایک استثنائی موقع کے (جب بمبئی
مین ایک مسجد مین مولانا شوکت علی پر لکڑی سے حملہ ہوا ہے، اور پھر اس ایک موقع کے لیے
بھی بعد کو اس نے معذرت شائع کی)، اس نے اپنی متانت وسنجیدگی کی روش کبھی بھی نہ چھوڑی
اور اپنے کو برابر سنبھالے رکھا۔ ذاتیات وشخصیات کے بجائے صرف اصول ومسائل سے بحث کی
اور فرنگی محل، خصوصاً مولانا عبد الباریؒ کے ذاتی احترام کا تو ہمیشہ لحاظ رکھا۔ عارف صاحب
(ہمدرد کے ان چارج ایڈیٹر) کو مالک ہمدرد اور فرنگی محل کے باہمی تعلقات کا علم تھا، قدرۃً
فرنگی محل کے معاملہ مین بچ ہی بچ کر لکھتے۔ لیکن ہیجان جذبات کے وقت حدود کا لحاظ رکھتا ہی کون
ہے۔ میدان جنگ مین سب سے پہلے کام آجانے والے تو حق وانصاف ہی ہوتے ہین! ہمدرد غریب
کو اس احتیاط وتقویٰ کا انعام یہ ملا کہ الٹے اس کے بائیکاٹ (مقاطعہ) کی تبلیغ وتلقین "خوش
عقیدہ" حلقوں میں شروع ہو گئی۔

قرآن کے مخلوق وغیر مخلوق ہونے کی بحث، صدیاں گزر چکنے کے بعد، آج ہم کو آپ کو کیسی
بے روح اور بے حاصل سی معلوم ہو رہی ہے، لیکن اسی "نزاع لفظی" کے پیچھے ایک وقت مین
کیا کچھ نہین ہو چکا ہے۔ اور کیسی کیسی عزیز اور بیش بہا جانین اپنے ایمان کے تحفظ کے لیے اس
پر نثار نہین ہو چکی ہین؟ پھر اسی طرح جبریہ وقدریہ کے منازعات، اور بیسیون دوسرے کلامی
محاربات جن سے قدیم فرقون کی تاریخین بھری پڑی ہین۔ اور خیر، یہ تو صدیوں قبل کی اور ہندستان
کے باہر کی باتین ہین۔ "آمین بالجہر" اور "رفع یدین" اور اسی قبیل کے بیسیون دوسرے فقہی
جزئیات کی خاطر تو ابھی ایک ہی آدھ نسل قبل اور اسی ہندوستان کے اندر، کیا کچھ خون خرابہ
نہین ہو چکا ہے! اور پھر مسئلہ میلاد نبوی اور مسئلہ قیام میلاد اور مسئلہ علم غیب رسول اور مسئلہ

امکان خلف وعدہ! العظمۃ للہ۔ آج آپ جتنا چاہیں یہ کہہ کہہ کر اپنا دل خوش کرلیں کہ بھلا یہ
بھی کوئی ایسے اہم اور مہتم بالشان مسئلے ہو سکتے ہیں۔ لیکن ابھی کل تک کس درجہ ان کی اہمیت
دلوں میں جاگزیں تھی۔ گویا یہی عین معیار کفر و ایمان تھے۔ مباحثہ، مناظرہ، مشاتمہ، مجادلہ، مشاغبہ،
یہاں تک کہ مباہلہ بلکہ کہیں کہیں مقاتلہ تک کی نوبت ان ہی مباحث کے صدقہ میں آچکی تھی۔
اور جس وقت تک ان کی گرما گرمی رہی، کون ایسا تھا جو اپنے کو اس سیلاب کی زد میں آنے سے
بچا سکا تھا؟

بس بعینہ یہی کیفیت ۱۹۲۵ء کے نصف آخر اور ۱۳۴۴ھ کے نصف اول میں مسئلہ قبور
وقباب میں آپ کے اسی ہندوستان میں، اسی لکھنؤ اور اسی دہلی، اسی اودھ اور اسی پنجاب،
اسی دکن اور اسی بہار میں ان آنکھوں نے دیکھی۔ رائیٹر کی اصل حکایت، جس پر یہ سارے قصے
قضیے چل پڑے تھے، وہ تو درمیان میں غتربود ہو کر رہ گئی، اور ہر مجمع میں، ہر محفل میں، ہر گھر
میں بحث یہ چھڑ گئی کہ قبور کو پختہ کرنا اور پھر ان پر قبہ یا گنبد بنوانا جائز ہے یا ناجائز؟ مستحسن ہے یا حرام؟
اور بنے ہوئے گنبدوں کے باقی رکھنے نہ رکھنے کے باب میں کیا احکام ہیں؟ فرنگی محل کے
عالم، اور ندوہ کے فاضل، دیوبند کے فقیہ اور جامعہ ملیہ کے استاد، سچ کا اڈیٹر اور بدایون
وپھلواری کے خانقاہ نشین، جنھیں دیکھئے اسی بحث میں الجھے ہوئے، اور ایک دوسرے سے
گتھے ہوئے۔ آج ایک فریق کا مضمون نکلا تو کل دوسرے فریق کی طرف سے اس کا جواب۔
آج ایک نے پمفلٹ لکھا، کل دوسرے نے اس کا رد شائع کیا۔ نوبت زبانی تو تو میں میں
سے گزر کر کہیں کہیں ہاتھا پائی بلکہ فوجداری کی آگئی۔ گھر گھر اختلاف وشقاق کی آگ دوڑ
گئی۔ باپ شرعیٔ ہے تو بیٹا سعودی۔ ایک بھائی قبہ شکن ہیں تو دوسرے قبہ نواز۔ بیوی
"بدعتی" ہیں تو میاں "وہابی"۔ ـــــــــ محمد علی کو اپنی ذات سے ان بحثوں میں بہت ہی

کم دلچسپی تھی۔ وہ انھیں فروع ہی نہیں، فروع در فروع کے درجہ میں رکھتے تھے۔ رحجانِ طبع اگر کچھ تھا تو عقائد فرنگی محلی ہی کی جانب نہ کہ عقائد سعودیہ نجدیہ کی جانب۔ کہا کرتے تھے کہ "بلند و پختہ قبوروں کو اسلام نے پسند یقیناً نہیں کیا ہے، لیکن ان کی تعمیر کی کوئی قطعی ممانعت یا بنے ہوئے مزارات کے ڈھا دینے کا کوئی صاف حکم بھی ابھی تک میرے علم میں نہیں۔ جس دن آ جائے گا، میں خود ہی ہاتھ میں پھاوڑا لیکر تعمیل ارشاد کو بڑھوں گا۔" ہمدرد میں میرا ایک مفصل مضمون دو نمبروں میں مسلک فرنگی محل کے رد میں اور مشاہد و مزارات کے عدم جواز میں نکلا۔ محمد علی نے اس رائے اور عقیدہ سے کچھ زیادہ اتفاق نہ کیا۔ وہ جو اس وقت سلطان ابن سعود کی تائید کر رہے تھے، اس میں سلطان کے مذہبی عقائد کو ذرا بھی دخل نہ تھا۔ انکی تائید اس وقت تمامتر اس خیال کے ماتحت تھی کہ اب ارض حجاز کو ملوکیت و استبداد کے عذاب سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جا رہی ہے، اور جمہوریۂ شرعی کی بنیاد، خلافتِ راشدہ کے نمونہ پر قائم ہوئی جاتی ہے۔ اس پر بھی جتنی "بدنامی" ان کی قسمت میں تھی، ہو کر رہی، جذبات کے ہیجان و تلاطم میں کسے تحقیق کی فرصت اور کس کو صداقت کی پروا؟ محمد علی کی وہابیت اور بدعقیدگی کی تشہیر کے لیے بس اس قدر کافی تھا کہ کسی پہلو سے اور کسی بنا پر سہی، بہرحال، وہ ہیں تو سلطان ابن سعود کے حامی و ہمدرد۔ غریب کی حنفیت اور قادریت، بیعت اور مزارات پر حاضری، عرسوں میں شرکت اور قوالی کی محفلیں، کوئی چیز بھی آڑے نہ آئی، اور گلی گلی، گھر گھر ڈھنڈھورا پٹ گیا کہ محمد علی وہابی ہیں وہابی، بلکہ وہابیوں کے سردار اور نجدیوں موذیوں کے گرو گھنٹال!

باب (۳۸)

۱۹۲۵ء (۸)

(بزم اور پھر رزم)

خلافت کمیٹی نام کے لیے اب بھی زندہ تھی حقیقۃً اس کی زندگی ایک آدھ سال پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اودھ میں بھی ایک مستقل صوبہ خلافت کمیٹی تھی۔ یہ نیازمند بے عمل و پست ہمت، اس کے دور عروج میں تو اس سے چھٹکا پھرا، اب محمد علی کی مروت اور ان کی تعمیل ارشاد میں مجبوراً اس میں شرکت کرنا پڑی، اور کچھ عملی حصہ لینا پڑا۔ یا لوگوں نے کوئی ذمہ داری کا عہدہ بھی سر منڈھ دیا، اس کی تفصیلات تو اب یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ اس نئی اور اہم ذمہ داری کے سر آپڑنے پر اسی جولائی کے مہینہ میں محمد علی کو خط لکھا کہ "اپنی قسمت کو کیا کہیے کہ یہ فرض اپنے حصہ میں آیا تو اب جبکہ فضا بالکل ٹھنڈی ہو چکی ہے، اور کوئی ولولۂ عمل کہیں باقی ہی نہیں رہا ؎

ہر کس خمے کشیدہ در مجلس وصالش   چوں دور خسرو آمد جام و سبو نماندہ!"

دریاباد کے لیے دعوت بھی اس خط میں تھی کہ تشریف لائیے، تو آم کھائیے، اور میرے تربیت دیے ہوئے قوالوں کی زبان سے اپنا کلام سنیے۔ جو عارف صاحب کے قلم سے آیا، اور اسی خط میں ہمدرد کے بعض اور پہلوؤں پر بھی روشنی موجود ہے:-

مولانائے محترم۔ عدم فرصت اور کچھ ناسازی طبع کی وجہ سے اس عرصہ میں خط نہیں لکھ سکا۔

جعفری صاحب سے لکھواتا رہا۔

ابتک جسقدر بھی ایڈیٹوریل مضامین ہمدرد مین شایع ہوئے وہ سب میرے ہی قلم سے نکلے ہین، البتہ اب تین روز سے ڈاکٹر سعید احمد صاحب کے مضامین لیڈنگ آرٹکل کی صورت مین شائع ہو رہے ہین۔ اور مراکش کے متعلق مسلسل ان ہی کے قلم سے کام ہدیہ کے مضامین اردو قالب مین ڈھال کر شائع کیے جائین گے۔ یہ بزرگ ایک سب اسسٹنٹ سرجن ہین جو تنہا بہار مین پریکٹس کرتے تھے۔ "ضرورت" کے عنوان سے جو اشتہار ہمدرد مین نکلتا رہا ہے، اس کو دیکھکر ڈاکٹر صاحب کی بھی درخواست آئی تھی۔ اور منجملہ بہت سے لوگون کے ڈاکٹر صاحب کے نام قرعۂ انتخاب نکلا۔ مضامین سے انکی قابلیت کا اندازہ آپ کو ہو جائیگا۔ آدمی ذہین اور ادبی مذاق کے ہیں۔

مولانا نے آپ کے خط کے جواب مین فرمایا ہے کہ بڑے زور سے "ہاں" لکھدو، اور فرمایا خواہ کچھ ہو مگر آم اور قوالی نہین چھوڑی جاسکتی مگر مولانا یہ تنہا مولانا کو دعوت دینے کے کیا معنی، آخر آم اور قوالی سے تو اور لوگوں کو بھی ذوق ہے۔

"چون دو خسرو آمد" کے جواب مین مولانا فرماتے ہین کہ کام کا تو وقت یہی ہے۔ اس وقت تو ایک سیلاب تھا، اور سب ہی اس میں بہے چلے جا رہے تھے۔ اب کام کرنا عزیمت کا ثبوت ہے، "پر زور مقابلہ" کا دوسرا نمبر سچ سے نقل کر دیا گیا۔ مگر یہ کیا ستم ہے کہ سچ جس وقت سے نکلا ہے، ہماری قسمت میں صرف اس کے مضامین نقل کرنا ہی رہ گیا ہے۔

یہ ڈاکٹر سعید احمد صاحب سعید بریلوی میرے ایک مرحوم بھائی، سن مین مجھ سے بہت بڑے کے ہم سبق تھے، اور اس لیے میرے لیے بالکل اجنبی نہ تھے۔ بلکہ میرے لیے ایک حد تک قابلِ احترام بھی تھے۔ مناسبت انھین اپنے فن سے بڑھ کر شعر و ادب سے تھی۔ مولانا نے جب ان کا تقرر کیا تو مجھ سے فرمایا کہ "میں ان کی قابلیت سے تو کم ان کی ادبیت سے زیادہ متاثر ہوا"

اب ہمدرد میں عارف صاحب کے بعد سب سے سینیر یہی تھے۔ اور عارف صاحب جب
چلے گئے تو یہی انچارج ایڈیٹر ہو گئے۔ مولانا انھیں اپنے کام کے مضامین پڑھنے کو بتا دیتے، اور
پھر انھیں اردو کے قالب میں ڈھالنے کے لیے ان کو مزید ہدایات زبانی بھی دیر تک دیا کرتے۔

یہ ذرا سا جملہ معترضہ آ گیا تھا۔ اب پھر وہی داستان جنگ ملاحظہ ہو۔ قلم اور زبان کے
محاذ بے زور شور سے جاری ہیں۔ ہمدرد پہلے تو زور دروں سے لکھتا رہا، مگر اب کچھ سرد سا ہو گیا۔
محمد علی تو اپنے اسی اونچے سیاسی تخیل پر قائم، اور آویزش کو تمام تر عالم اسلامی کے نقطۂ نظر سے
دیکھ رہے ہیں۔ میں خود اتنی بلندی پر ساتھ نہ دیکر اسی عام "فرقہ وارانہ" پستی کی سطح پر ہوں، اور
ہمدرد میں قبور و قباب پر لکھ رہا ہوں۔ محمد علی غریب اس حرب عقائد سے بیزار اب تک اسی
کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کم از کم ان کے مرشد تو سنبھل جائیں، اور ہندوستان میں اس خواہ مخواہ
کی کشمکش کو آگے نہ بڑھنے دیں۔ خوب جانتے تھے کہ فرنگی محل ہی میں مولانا کے گرد و پیش بڑے
بڑے غالی موجود ہیں اس لیے اس کا بھی اہتمام رکھے ہوئے تھے کہ ان کی نجی کی سعی اصلاح
میں یہ حضرات دخل نہ دینے پائیں، بلکہ انھیں اس مراسلت کی سن گن بھی نہ ملے۔
عارف صاحب کا ایک مکتوب ستمبر کا ملاحظہ ہو۔ اس سے بہت سے مسائل متعلقہ صاف
ہو جائیں گے۔

"مولانائے محترم۔ السلام علیکم
آپ کے دو گرامی نامے رجسٹرڈ موصول ہوئے۔ مضمون کا پہلا حصہ چھپ چکا ہے۔ باوجود
کوشش کے ممکن ہے کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں۔ دوسرا آج شائع ہو رہا ہے۔ مگر صفحۂ اول پر نہ
جا سکا، اس لیے کہ وہ چھپ چکا تھا۔ اب اس سلسلہ کو میں بند کرتا ہوں۔ آپ کے جواب میں

مضامین آنے شروع ہو گئے ہیں۔ اور مجھے معلوم ہے کہ لکھنؤ و بدایوں وغیرہ میں زور و شور سے جواب کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس لیے آج ایک نوٹ کے ذریعہ کچھ عرصہ کے لیے اس سلسلہ کو بند کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔

آپ کا پہلا خط جس وقت آیا مولانا شملہ میں تھے۔ وہاں سے آئے تو اندر زنانخانہ میں بیٹھ کر کام کرتے رہے، اور کل پھر پٹنہ چلے گئے، اس لیے اُن امور پر گفتگو نہیں کر سکا جن کا جناب نے ذکر فرمایا تھا۔

مولانا عبد الباری صاحب کو جو خط مولانا محمد علی نے لکھا تھا اس کی اطلاع میں نے آپ کو مولانا کے علم و اجازت کے بغیر کی تھی اس لیے میں وہ خط طلب نہیں کر سکا۔ مبادا مجھ سے جواب طلب کرتے کہ کیوں تم نے اطلاع دی۔ یہ خوف مجھے یوں پیدا ہوا کہ مولانا نے اپنے خط میں لکھ دیا تھا کہ اس کو پڑھ کر چاک کر ڈالیے گا اور کسی کو دکھلایئے گا نہیں۔ اس کے جواب میں فرنگی محل سے دو خط خاص مولوی صاحب کے قلم کے موصول ہوئے ہیں۔ انھوں نے بھی یہی تاکید محمد علی صاحب کو کی ہے۔ تاہم ارادہ تھا کہ میں اس طرح ذکر کروں کہ آپ کو کسی ذریعہ سے اس خط کا حال معلوم ہو گیا ہے اس لیے آپ نے ایک خط میں اس کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ اس کی نوبت آئے وہ اس خط کو مع مولانا عبد الباری کے دونوں خطوں کے لیکر پٹنہ چلے گئے، تاکہ وہاں شوکت صاحب کو دکھلائیں۔ واپسی پر اگر آپ فرمائیں تو ان سے لیکر بھجوانے کی کوشش کروں۔

اڈیٹوریل مضامین میں جو تغیر آپ نے محسوس کیا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس مسئلہ نے خود میرے اندر ایک جوش پیدا کر دیا تھا اور حریفوں کو جو باطل پر تھے شکست دینے کا جذبہ کام کر رہا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انگریزوں کی دشمنی کام کر رہی تھی جن کا ہاتھ اس فتنہ کی پشت

پر ہے۔ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ میں اب بھی اچھا اور زوردار لکھ سکتا ہوں مگر اس وقت جب میرے دل میں کوئی کیفیت پیدا ہو۔ اگر یہ فتنہ نہ دبتا اور کمزوری کے آثار مخالف کیمپ میں نہ پیدا ہو جاتے تو شاید عرصہ تک قلم میں زور باقی رہتا۔ لیکن الحمد للہ کہ تمام مخالف سمتوں میں اضمحلال و کمزوری کے آثار و علائم پیدا ہو گئے ہیں اور چند روز میں یہ فتنہ بالکل دب جائے گا۔ گو لکھنؤ میں اس کو ابھارنے کی کوشش کی جائے گی مگر زندگی کا حال معلوم۔ اصل یہ ہے کہ نیک نیتی کا فریق مخالف کے ہاں فقدان ہے۔ زیادہ تر علی برادران کی رقابت کام کر رہی ہے۔ البتہ حسرت موہانی کا افسوس ہے۔"

محمد علی "پارٹی" کی لیڈری کیلئے خلق ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ پارٹی چاہے سیاسی ہو یا مذہبی اور نہ انھیں ایسی محدود اور تنگ قسم کی لیڈری سے کچھ دلچسپی تھی۔ مذہب ہو یا سیاسات وہ ہر مسئلہ کو "رہبر ملت" کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی، اور اس پر عالمی نقطۂ نظر سے نظر کرنے کے خوگر تھے۔

ہمدرد میں مضامین و مراسلات برابر میرے اشاروں پر جا رہے تھے، مخالفت کا مرکز مولانائے فرنگی محلی کو بنائے ہوئے۔ استدلال ہم لوگوں کا یہ تھا کہ اُدھر سے شریف پر بس جب سب کا سب محمد علی کو اپنے طعن و طنز کا ہدف بنائے ہوئے ہے۔ تو آخر کیا وجہ ہے کہ ہم مولانائے فرنگی محلی کو چھوڑے ہوئے رہیں۔ ہمدرد کا اسٹاف اپنا ہم خیال تھا، اور خوشی سے ایسے مراسلے و تائع وغیرہ لے رہا تھا۔ لیکن خود محمد علی کی نظر جب بھی پڑ جاتی بس اسٹاف والوں کی خیر نہ تھی۔ مجھ حقیر کا لحاظ اس میں شبہہ نہیں کہ محمد علی بہت کرتے تھے۔ کرم و شفقت میرے حال پر بے نہایت رکھتے تھے۔ لیکن اصول کے معاملہ میں، حق و انصاف کے معاملہ میں، محمد علی کسی کی

مروت یا رعایت کرنا جانتے ہی نہ تھے ــــــــ عارف صاحب ۱۲ اکتوبر کو خط کیا لکھتے ہیں رو رو کر اپنا حال زار سناتے ہیں :-

"مولانائے محترم - مولانا محمد علی صاحب نے سخت تاکید کردی ہے کہ اب آیندہ سے مولانا عبدالباری صاحب کے متعلق ایک حرف نہ لکھا جائے - خیر میں اتنی پابندی تو نہیں کر رہا ہوں، مگر جناب والا نے "فرنگی اور فرنگی محلی" کے عنوان سے جو مضمون بھیجا ہے، مجبوراً پروف پر سے اسے حک کروا رہا ہوں - امید ہے کہ آپ مجھے معذور و مجبور سمجھ کر معاف فرمائیں گے - میں فرنگی محل کے متعلق آپ سے زیادہ متشدد ہوں اور اسی میلان طبع اور خیالات ذاتی کا اثر تھا کہ اس قدر کثرت سے فرنگی محل کے خلاف ہمدرد میں لکھا گیا - مولانا نے پہلے بھی مجھکو منع کیا تھا مگر اب سختی سے منع کر دیا ہے - لہٰذا مجبوری ہے -

مولانا شوکت علی اس کے حق میں تھے کہ فرنگی محل کی خبر لی جاتی رہے - مگر مولانا محمد علی صاحب اس سے زیادہ جتنا ہو گیا پسند نہیں کرتے - ان کا خیال ہے کہ مولانا ایک سادہ لوح آدمی ہیں اور جو پاس رہتا ہے اس کا ان پر قبضہ ہو جاتا ہے -

میں نے "وقائع لکھنؤ" بغیر پڑھے ہوئے لکھنے کے لیے دیدیا تھا - ورنہ میں فوراً آپ سے صورت حال عرض کرتا اور پھر آپ سے مشورہ کرتا - لیجئے زاہد علی صاحب[۱] نے ابھی پروف مولانا کو دکھلا دیا اور انھوں نے باز پرس کر لی - اور خود اس حصہ پر سیاہی پھیرنے کا حکم دیدیا - یہ خط لکھنے کے دوران میں ہوا ہے -

امید ہے کہ آپ میری صحیح پوزیشن کو سمجھ لیں گے اور مجھ سے ناراض نہ ہوں گے - آج شیخ عبدالعلی بھیا روی[۲] کا بھی مراسلہ آیا ہے جس میں احمد حسین والے معاملہ پر روشنی ڈالی ہے،

۱؎ مولانا محمد علی کے بھتیجے اور بڑے داماد اس وقت ہمدرد کے منیجر تھے - ۲؎ مولانا فرنگی محلی کے ایک عزیز قریب (باقی ص ۲۴۹ پر)

یعنی یہی معاملہ جس پر آپ نے بھی لکھا تھا۔ اس تحریر کو مولانا کو دکھلانے کو لیے جا رہا ہوں، اگر اجازت دیں گے تو شائع کر دوں گا، نہیں تو نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں اب زیادہ لکھنؤ کانفرنس کا ذکر کرنا اس کو اہمیت دینا ہے

خادم عارف ہسوی

عبدالعلی میاں کے مراسلہ کی اشاعت کی اجازت دیدی ہے۔ مگر مع ایک نوٹ کے جو کل شائع ہوگا۔"

محمد علی کا غیظ و غضب، آتش بیانی اور تیز زبانی تو دنیا میں خوب اچھلیں۔ کمتر لوگ ہوں گے جنھوں نے محمد علی کی اس شرافت قلب کو جانا، یا اس عالی ظرفی کو پہچانا

مسلسل حملوں اور اشتعال انگیزیوں کے درمیان اپنے مقام عدل اور نقطۂ اعتدال پر قدم جمائے رکھنا، کام ہم عوام کا نہیں، خاص اہل اللہ کا ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴۸) جو اس وقت اپنے ان بزرگ کے شدید مخالف تھے۔ ۳؎ ٹینس کے مشہور کھلاڑی۔ اس وقت خلافت کے خاص کارکن تھے۔ شریفیوں کی کانفرنس (لکھنؤ) میں شرکت کے لیے گئے تھے۔

باب (۳۹)

سنہ (۹) ۱۹۲۵ء

(پیر اور مرید کی آویزش)

ارض حجاز پوری کی پوری سلطان ابن سعود کے قبضہ میں آچکی، لیکن ہندوستان کے ایک بڑے حصہ میں اس تسلط کے خلاف بغاوت اب تک جاری رہی۔ ستمبر کا سارا مہینہ ابن سعود کے حامیوں اور مخالفوں کی کشمکش میں گزرا۔ جہاں دیکھیے یہی آویزش، جدھر آنکھ اٹھائیے یہی چپقلش۔ لکھنؤ، فرنگی محل کی پرقوت سرپرستی کے بل پر، ابن سعود کے دشمنوں کا ایک زبردست مرکز۔ پوسٹر، پمفلٹ، مضامین و مقالات، کارٹون، تمسخر آمیز ہجویہ نظمیں، ماتمی انجمنوں کی آہ و بکا، ماتمی جلوس اور جھنڈے، گرما گرم تقریریں، پرخروش جلسے، ایک مستقل ادارہ "خدام الحرمین" کا قیام، ایک نام کی آل انڈیا سکا نفرنس وغیرہا۔ غوغائیوں کی بڑی تعداد کے ساتھ چند مخلصین کی شرکت سونے پر سہاگہ کا کام کر گئی۔ سالار لشکر مولانا عبد الباری فرنگی محلی۔ میمنہ اور میسرہ پر حسرت موہانی اور شیخ مشیر حسین قدوائی[1]۔ عقب میں شیعہ امراء و تعلقدار، خصوصاً راجہ صاحب سلیم پور اور راجہ نواب علی خان، خلافت والے غریب کہاں تک ظلم و ستم سہتے، اور آخر کب تک نہ بہتے! مولوی ظفر الملک علوی (ا

---

[1] گدیہ (ضلع بارہ بنکی) کے تعلقدار و بیرسٹر۔ بڑے پرجوش مسلمان۔ انگریزی میں چھوٹی بڑی متعدد تبلیغی کتابوں کے مصنف۔ اب مرحوم (سنہ ۱۹۵۲ء)

اور چودھری خلیق الزماں نے بھی ایک لمبی انگڑائی لی۔ طے یہ پایا کہ باطل کے سارے رسی کے سانپوں کو نگل جانے کے لیے عصائے حق کا ایک اژدہ کافی ہے۔ نظر سب کی محمد علی ہی پر پڑی ——

اتفاق سے عین اسی زمانہ میں ۱۸ر اکتوبر کو سیتاپور میں صوبہ کی پولیٹیکل کانفرنس کا اجلاس مولانا شوکت علی کی صدارت میں تھا۔ گاندھی جی بھی اس میں بولنے والے تھے اور محمد علی بھی۔ (اس وقت بغیر اس مقدس ثلیث کے اجتماع کے کوئی اہم کام ہو ہی کہاں سکتا تھا)۔ صلاح یہ ٹھہری کہ واپسی میں ۲۰ر اکتوبر کو محمد علی لکھنؤ چند گھنٹہ کے لیے اتر پڑیں، اور ایک تقریر کر دیں جس سے ساری غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں اور غلط گمانیوں کے بادل چھٹ کے رہ جائیں۔ یہ نیازمند اس سفارت پر سیتاپور گیا۔ دو چار گھنٹے علی برادران کے ساتھ بسر کیے۔ مزیدار کھانے ان کے ساتھ کھائے۔ اس سے زاید مزیدار باتیں ان کی سنیں۔ اور بات پکی کر کے شام واپس آگیا۔

تاریخ موعود آئی، اور تاریخ کے ساتھ ہی محمد علی وارد لکھنؤ ہوئے —— مرید کا کام تو شیخ کی اطاعت، حمایت و نصرت ہی ہر حال میں سمجھا گیا ہے۔ ارشاد و بیعت کی ساری تاریخ میں یہ واقعہ شاید اپنی نظیر آپ ہی ہو، کہ مرید اپنے شیخ کی مخالفت کرنے اعلی الاعلان اور پرزور مخالفت کرنے دور دراز کا سفر اختیار کر کے، اپنا وقت اور اپنا پیسہ خرچ کر کے آ رہا ہے! بیعت، ارادت، محبت عقیدت کی بنیاد جس طرح حق و اخلاص پر تھی، مخالفت، تردید، تغلیط کی بنیاد بھی حق و اخلاص پر رہی۔ محبت اگر اللہ کے لیے تھی، تو اس علی گڈھ کے بیچری، اور آکسفورڈ کے گریجویٹ نے، اس چودھویں صدی ہجری میں، اپنی مثال سے یہ دکھا دیا کہ مخالفت بھی اللہ ہی کے لیے ہو سکتی ہے!

—— حب فی اللہ کے بعد بغض فی اللہ کی یہ کیسی قابل رشک تفسیر رہی!

لکھنؤ کی منزل تو ابھی بعد کی تھی۔ امتحان کی گھڑی اس سے قبل سیتاپور ہی میں آگئی۔[1] بعد مغرب وہاں

[1] سیتاپور معتقدین و مریدین فرنگی محل کا ایک خاص مرکز تھا۔

کی جامع مسجد میں پر زور تقریر اسی مسئلہ حجاز پر کر رہے تھے، کہ حاضرین میں سے کوئی صاحب بول اٹھے کہ "آپ کے مرشد کا مسلک تو اس کے خلاف ہے، پھر یہ مرشد سے مخالفت کیسی"، محمد علی نے تقریر کی اسی رو اور روانی میں بغیر ایک لمحہ کا خلل ڈالے جواب دیا "میں نے تو مرشد اسی لیے انھیں بنایا تھا کہ جن معاملات میں مجھے ہدایت کی ضرورت ہوگی وہ مجھے حق کی راہ دکھائیں گے لیکن اس خاص مسئلہ میں تو وہ خود میری رہنمائی کے محتاج ہیں، ان کی اعانت کرنا میرا فرض ہے" ——— مرشد کو مرشد کے مرتبہ پر، اور اللہ کو اللہ کے مرتبہ پر رکھنے کی ایسی خالص ایمانی مثالیں میرے علم میں متعدد نہ اس کے قبل آئی تھیں، نہ اس کے بعد ہی آئیں!

مرید اپنے مرشد کا محض مطیع ہی نہ تھا، دوست و محب بھی تھا، عاشق و شیدائی بھی تھا، ممنون کرم بھی رہا کرتا تھا۔ پارٹی نے ایک بڑی بے ڈھب ایک شرط یہ لگا دی تھی کہ لکھنؤ میں قیام اس بار محلسرائے فرنگی محل میں نہیں بلکہ چودھری خلیق الزماں کے ہاں ہو، ورنہ تعلقات کی آتش کشیدگی کی حالت میں اپنے لوگوں میں سے فرنگی محل جانا کون گوارا کرے گا؟ سالہا سال کا معمول ٹوٹا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس دل سے محمد علی نے ایک فرنگی محل چھوڑ کر خلیق صاحب کی مہمانی قبول کی۔ یہ محض اتفاق کہیے یا کچھ اور، کہ مولانائے فرنگی محلی بھی اس تاریخ کو لکھنؤ سے باہر تھے، ہزار ڈیڑھ ہزار میل دور، حیدرآباد میں۔ صبح ہوئی کہ خلیق صاحب کی کوٹھی (واقع خیالی گنج) میں محمد علی کے گرد مجمع ہوگیا۔ پرانے مخلصوں اور معتقدوں، خلافت کے کارکنوں کے ساتھ ساتھ بعض نئے حواری بھی! ——— محمد علی کی محبت و ارادت میں نہیں، فرنگی محل کی ضد اور عناد پر! حب علی میں نہیں، بغض معاویہ پر!

ادھر محمد علی خود فرنگی محل جانے کے لیے بیتاب ہو رہے تھے۔ پارٹی کا حکم اس حد تک تو بہرحال نہیں مان سکتے تھے کہ فرنگی محل سے کوئی تعلق ہی نہ رکھیں۔

پارٹی کا کوئی شخص کیوں ہمراہ جانے لگا تھا۔ بس یہی ڈائری نویس، جو پارٹی بھر میں سب سے زیادہ ٹھنڈے مزاج کا سمجھا جاتا تھا۔ اور جس کے تعلقات اس وقت تک بھی فرنگی محل سے بدستور نیازمندانہ تھے، ہمراہ ہوا، خلیق صاحب کے موٹر پر محمد علی فرنگی محل کے لیے دوپہر سے کچھ قبل روانہ ہوئے بگین کے بجائے زیارت صرف مکان کی ہوئی۔ مولانا کے صاحبزادہ جو اب ماشاءاللہ جمال میاں کے نام سے مشہور ہیں، اس وقت بالکل بچہ تھے، اور کسی شمار قطار میں نہ تھے۔ البتہ مولانا کے دوسرے سن وا اعزہ مولوی سلامت اللہ صاحب، مولانا مفتی محمد عنایت اللہ وغیرہم بڑھ کر ملے۔ حسرت موہانی بھی یہیں مل گئے۔ عجب نہیں جو لنگ کے لیے بلا رکھے گئے ہوں۔

فرنگی محل کی میزبانی اور مہمان نوازی مشہور ہے۔ دوپہر کا کھانا یہیں ہوا۔ لیکن دسترخوان ہی پر گرم گرم اور لذیذ کھانوں کے ساتھ گفتگو بھی گرماگرم اور زود بدمزہ شروع ہوگئی۔ محمد علی بجز اپنے مرشد کے اور کسی سے اس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے ہی نہ تھے۔ لیکن سوالات شروع ہوگئے اور جواب انھیں بادل ناخواستہ دینے پڑے۔ چلتے چلتے بات بڑھنے لگی، اور جب رخصت ہوکر فرنگی محل کے پل پر، پولیس چوکی کے سامنے، موٹر پر سوار ہونے لگے، تو فریقین کا لہجہ اتنا بلند ہو چکا تھا کہ راہگیروں کا ایک خاصہ مجمع گویا تماشا دیکھنے ہی کے لیے ہوگیا۔ اور اس کم ہمت کو ہمت کر کے مولانا عنایت اللہ صاحب کے منہ پر ہاتھ رکھ دینا، اور ادب کے ساتھ عرض کرنا پڑا کہ "مولانا، یہ چوراہہ ہے چوراہہ"

—— یہ سارے جزئیات جذبات کی شدت اور زبان کی حدت کا نمونہ دکھانے کو قلمبند ہو رہے ہیں —— محمد علی کی طرف سے بڑی گرفت اس لکھنؤ والے بڑے جلسے کے اشتہار کی اشتعال انگیزی اور مبالغہ آمیزی پر تھی جس کا کوئی جواب فریق ثانی کے پاس نہ تھا۔

باب (۴۰)

سنہ ۱۹۲۵ء (۱۰)

میدان جنگ کا ایک منظر

جلسہ کے اصلی کرتا دھرتا مولوی ظفر الملک علوی تھے۔ ان ہی نے سارے انتظامات کر رکھے تھے لیکن عین وقت پر پیر میں زخم آگیا تھا، اور اس "غدر لنگ" پر گھر کے اندر معتکف تھے۔ کہیں آنے جانے کے قابل نہ تھے۔ محمد علی فرنگی محل سے اٹھ ان ہی کے ہاں آئے۔ یہ دفتر الناظر دریچ اس وقت وکٹوریہ اسٹریٹ پر فرنگی محل سے چند ہی قدم کے فاصلہ پر تھا۔ یہیں ان کے ملاحظہ میں لکھنؤ کے وہ اخبارات خصوصاً "پنچ" اخبارات لائے گئے، جنھوں نے مزاح و ظرافت کو آڑ بنا کر تہذیب، شرافت و انسانیت کا اپنے ہاتھ سے گویا گلا گھونٹ گھونٹ دیا تھا۔ ——— کلکتہ اور بمبئی میں جس طرح سالسٹر بڑے بڑے بیرسٹروں کو مقدمہ کے کاغذات دکھا دکھا کر پیروی کے لیے تیار کرتے ہیں، کچھ ایسی ہی منزل میں اس وقت مولوی حاجی ظفر الملک تھے۔ انھیں خود تو جلسہ میں جانا نہ تھا البتہ محمد علی کو ہر طرح لیس کر دینا تھا۔

یہاں سے چل کر محمد علی قیصر باغ میں راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں آئے، جو اب مہاراجہ ہو چکے تھے، اور اس وقت یو۔پی گورنمنٹ کے ہوم ممبر بھی تھے۔ در پردہ ان کی بھی ہمدردیاں مخالفین ابن سعود ہی کے ساتھ تھیں، لیکن بہر حال یہ کھلے ہوئے معاند نہ تھے اور شیعہ رئیسوں میں سب سے غنیمت تھے

محمد علی سے جس طرح ہمیشہ ملتے آئے تھے، اب کی بھی ملے۔ محمد علی کا معمول ہمیشہ سے ان کی ملاقات کا تھا، اور اس میں ان کے سرکاری عہدہ نے بھی فرق نہ پڑنے دیا۔ نہ ان کی طرف سے نہ محمد علی کی طرف سے۔ آج کے ہونے والے جلسہ کا بھی ذکر رہا۔ مہاراجہ نے رات کے کھانے پر بھی مدعو کر دیا۔ باتوں باتوں میں ذکر شیخ مشیر حسن قدوائی کا آگیا، جو اتفاق سے اس وقت محمد علی کے بالکل مخالف کیمپ میں تھے۔ مہاراجہ نے ان کا ایک اعتراض (تمام تر لغو) محمد علی کی پبلک زندگی سے متعلق نقل کر کے ان کا یہ قول بھی دہرا دیا کہ "اگر یہ غلط ہے تو محمد علی حلف سے اس کا انکار کر دیں"۔ محمد علی نے برجستہ ایک الزامی جواب شیخ صاحب کی خانگی زندگی کے متعلق مہاراجہ کے کان میں دیا۔ اور کہا کہ "اگر یہ غلط ہے تو مشیر حسین حلف سے اس کا انکار کر دیں"۔ جواب تھا بڑا دلچسپ، لیکن اتنا عریاں کہ صفحہ کاغذ پر اس کے لانے کی کوئی سبیل ہی نہیں۔ مہاراجہ تھے بڑے شستہ، مہذب اور شائستہ۔ ایسا غیر متوقع جواب سن کر اور کچھ نہ بن پڑی بجز اس کے کہ زور سے لاحول ولا قوت پڑھ دیں!

محمد علی بے حد برجستہ گو اور حاضر جواب تھے، چپ رہنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ لیکن کم لوگوں کو علم ہوگا کہ وقت آنے پر ہزل گوئی اور فحاشی یا پھکڑ کسی بات میں چوکنے والے نہ تھے۔ افسوس کہ انکے متعلق یہ علم، صرف علم سینہ ہی رہے گا، علم سفینہ نہ بن سکے گا۔

جلسہ کا مقام، عمارت رفاہ عام کلب کا عقبی صحن تھا۔ اس وقت تک علاوہ امین الدولہ پارک کے پبلک جلسے یہاں بھی ہوتے رہتے تھے۔ وقت وہی سہ پہر بعد عصر کا، جو لکھنؤ کے پبلک جلسوں کے لیے اس وقت عام وقت تھا۔ جلسہ کے داعیوں میں شہر کے معززین، شرفا، اور ہر طبقہ کے نمایندوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ یہ ڈائری نویس سایہ کی طرح محمد علی کے ساتھ ساتھ جس وقت ہم لوگ جلسہ گاہ میں پہنچے ہیں، بہت بڑا مجمع پہلے سے پہنچ چکا تھا۔ موٹر برساتی میں رکا

اور ہم لوگ اتفاق سے عمارت کے ہال کے اندر سے ہو کر گذرے۔ دیکھا کہ ہال کے اندر تماشائیوں کی نظر سے مخفی و مستور، راجہ صاحب سلیم پور اور راجہ نواب علی خان بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ مجھ سادہ لوح کو حیرت ہوگئی کہ یہ حضرات یہاں کہاں۔ سرسری صاحب سلامت ہوئی۔ ادھر ذہن ہی نہ گیا کہ اگر جلسہ میں شرکت ہی کھلے خزانہ انھیں منظور ہوتی، تو بجائے صحن میں ہونے کے، ہال کے اندر ان کا "قیام" کیوں ہوتا۔

صدارت کے لیے انتخاب چودھری خلیق الزماں صاحب کا ہوا۔ اور جلسہ شروع ہوا۔ ایک عرب سیاح توفیق شریف اس زمانہ میں آئے ہوئے تھے۔ پہلے انہوں نے عربی میں ایک تقریر کی۔ اور اس کے ایک ایک فقرہ کا ترجمہ مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم کرتے گئے اتنے میں مغرب کا وقت آگیا، اور نماز اسی صحن میں بہت بڑی جماعت کے ساتھ ہوئی۔ بعد نماز محمد علی تقریر کو اٹھے۔ انکا اٹھنا تھا کہ معلوم ہوا قیامت اٹھ کھڑی ہوئی! سب سے پہلے بہت دور سے فرنگی محل کے ایک مرید خاص کی طرف سے ایک سوال کی آواز، اور اس آواز پر معاً دوسری آواز، اور تیسری آواز، اور پھر ایک ساتھ بیسیوں آوازیں! گویا ایک کورس تھا، جو بجائے نغمہ و ترنم کے، شور و غوغا کی لے میں بلند ہو رہا تھا۔ اب سوالات موقوف تھے، اور انکے بجائے صرف یہ مطالبہ اور یہ نعرہ کہ "ہم نہیں سنینگے، نہیں سنینگے" حلق کی پوری قوت اور چیخ کی انتہائی بلندی کے ساتھ فضا میں قائم! صدر مجلس بار بار نظم قائم رکھنے کی ہدایت اور خاموش ہونے کی تلقین فرما رہے ہیں، چمکار کر بھی اور گھڑک کر بھی، لیکن جو محمد علی سے بغاوت پر تل کر آئے تھے، وہ خلیق الزمان غریب کو کیا خاطر میں لاتے؛ غوغائیوں کی تعداد کچھ ایسی بڑی نہ تھی۔ سو ڈیڑھ سو ہونگے۔ لیکن صحن کے مختلف حصوں میں بڑی ترکیب اور استادی کے ساتھ کھڑے

ہوئے تھے، اور جلسہ کو درہم برہم کر دینے کے لیے بالکل کافی بلکہ کافی سے زاید تھے۔ بعض ماتمی انجمنوں کے ارکان پیش پیش دکھائی دیے، اور ان شیعہ رئیسوں کی تشریف آوری کے معنی اب بالکل روشن تھے!

سیکڑوں ہزاروں عام حاضرین دنگ و حیران، متحیر و پریشان کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے! اندھیرا تو ہو ہی چلا تھا کہ اتنے میں ایک بڑا سا ڈھیلا تخت صدارت کے سامنے آکر گرا۔ عین اس جگہ میں بیٹھا ہوا تھا اور حسرت موہانی کے ایک ندیم خاص بھی۔ ڈھیلا گرتے ہی ایک شور برپا ہوا "لینا" "پکڑنا" "یہ کس کی حرکت ہے" "جانے نہ پائے" ایک ملیح آبادی سرخ پوش خاں صاحب (ایک مشہور ملیح آبادی کے والد ماجد) ڈنڈا لیکر یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ "یہ بدمعاش یوں نہ مانیں گے"۔ میں نے ان کے ہاتھ پکڑ کر اور اپنے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ خدا کے لیے کہیں ڈنڈا نہ چلا بیٹھیے گا، غضب ہو جائے گا۔" بولے کہ "نہیں، شہر کا مجمع ہے، یہ یوں ہی ٹھیک ہو سکتا ہے۔" — حلقہ فرنگی محل کے ایک خاص متوسل کھدر پوش اور اس وقت تک مولانا شوکت علی سے تعلق خاص رکھنے والے، دکھائی دیے کہ ہر طرف گھوم پھر کر گویا اس لشکر کی کمان کر رہے ہیں۔ محمد علی نے چلا چلا کر درود شریف پڑھا اور دوسروں سے پڑھوایا۔ لیکن اثر کس پر ہوتا؟ جب خود آل محمد کی خطابت میدان کربلا میں امت کے لیے بے اثر رہی، تو آل محمد کا محض نام کب ہمیشہ اور ہر جماعت پر اثر کر سکتا ہے؟ جالب صاحب (ایڈیٹر ہمدم) بھی تخت صدارت کے قریب ہی تھے، اور سب کے ساتھ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ محمد علی نے ان کا نام لیکر پکارا، اور پوچھا "جالب صاحب آپ میری تقریر سننا چاہتے ہیں یا نہیں؟" بولے "کیوں نہیں۔ ضرور سنوں گا۔" "اچھا تو پھر باقاعدہ بیٹھ جایئے۔" لیکن ایک جالب بیچارہ کی شرافت اور باقاعدگی سے کیا ہوتا تھا۔

گیس کے ہنڈے بجھائے جانے لگے، اور پوری کیفیت ہڑبونگ کی پیدا ہو گئی۔ ایک افراتفری کا عالم نفسی نفسی پڑ گئی۔ اندھیرے میں یہ اس پر گرتا، وہ اسے ڈھکیلتا۔ حکومت اس وقت نہ عقل کی نہ نقل کی، نہ شریعت کی نہ شرافت کی۔ صرف شرارت اور ننگے پن کی تھی ——— عارف رومی نے مثنوی میں ایک جگہ کہا ہے کہ ایک شخص جب سننا نہ چاہے تو سو سنانے والوں کا ناطقہ بند کر سکتا ہے

یک کس نامستمع زستیز و رد　　　صد کس گوئندہ را عاجز کند

اور پھر جب غوغائیوں کی تعداد ایک دو نہیں، بیسیوں اور پچاسوں ہو تو ظاہر ہے کہ انھیں سنانا کس کے بس میں ہے؟

---

۵ منٹ۔ ۱۰ منٹ۔ ۱۲ منٹ۔ صدر صاحب بھی آخر کب تک صبر و انتظار کرتے، کچھ دیر اور موقع دینے کے بعد جلسہ برخاست کر دیا ع

بات رہ جاتی ہے اور وقت گزر جاتا ہے!

اللہ کی شان، کہ مسلمانان ہند کے سب سے بڑے لیڈر کے ساتھ یہ سلوک، غیروں کا نہیں، خود مسلمانوں کا دیکھنے میں آیا! اور وہ بھی کہاں، مسلمانوں کے خاص شہر اور مسلم تہذیب و شائستگی کے مرکز لکھنؤ میں! کہاں ہزاروں کا مجمع محض محمد علی کا نام سنکر تقریر کے شوق و اشتیاق میں آیا تھا، اور کہاں چند شریروں کی جسارت نے نوبت یہ پہنچا دی۔ محمد علی جلسہ گاہ سے چلے، اور اب کی پھر اسی حال کے اندر سے گزرے۔ مخلصوں اور معتقدوں کا ایک ہجوم ہمراہ تھا۔ بعض کا اصرار ہوا کہ جلسہ اب منعقد ہو، شورہ پشت عنصر چلا گیا، اس لیے مشتاقوں کا اشتیاق اب پورا کیا جائے۔ میری شامت کہ ان لوگوں کے کہنے سے یہی بات میں نے محمد علی کے کانوں تک پہنچا دی۔ اسی بھرے مجمع میں میرے اوپر وہ زبردست ڈانٹ پڑی کہ اسے آج تک نہیں بھولا ہوں ———

محمد علی کے غصہ میں تمامتر آمد ہی آمد ہوتی تھی۔ تصنع و آورد کی ہر آمیزش سے خالی۔ اتنی مصلحت بینی کی گنجایش ہی کہاں ہوتی تھی کہ یہ جگہ خلوت کی ہے یا جلوت کی! مجرم پر محض عتاب ہی ہو رہا ہے۔ یا اس کی تفضیح بھی ہوتی جا رہی ہے۔

ایک طرف یہ ہو رہا تھا۔ دوسری طرف وہی کھدر پوش "آنریری" فرنگی محلی جو غوغائیوں کی کمان کرتے ہوئے دیکھے گئے تھے، اب یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ "محمد علی صاحب اور جا کر ٹھہریں خلیق الزماں کے ہاں"! یہ گویا اقرار اس امر کا تھا کہ اصل مخالفت خود محمد علی سے نہیں، بلکہ ضد و کد جو کچھ ہے وہ ان کے لکھنوی رفیقوں اور ہمدردوں سے ہے ——— غوغائی سرداروں نے ایک عارضی وقتی ہنگامی "فتح" حاصل کر کے مستقل بدنامی اپنے لئے حاصل کر لی۔ شہر میں گلی گلی، گھر گھر ان پر نفرین ہونے لگی۔ اور تو اور، خود مخفین کے ہم خیالوں میں جو لوگ سنجیدہ، شریف المزاج اور خوش فہم تھے، جیسے حسرت موہانی، سید جالب، وغیرہم، اُنھوں نے بھی اس طریقہ کو ناپسند کیا۔ اور روزنامہ ہمدم نے تو علانیہ اس سے اپنی بیزاری ظاہر کی۔ ساری شریف پبلک کے سامنے اب یہ سوال آ گیا کہ مخالفت کا یہی طریقہ اگر چل نکلا، تو آئندہ پبلک جلسوں کا کیا حشر ہوگا؟ اس کے معنے تو یہ ہوئے کہ جس کسی نے بھی کرایہ پر دس بیس لفنگوں کو جمع کر لیا، وہ جس مقرر کو چاہیگا بولنے سے روک دے گا

باب (۴۱)

سنہ ۱۹۲۵ء (۱۱)

(دو مستقل کیمپ = قبتی ولاقبتی)

ڈھائی ہفتہ کی مدت ہی کیا ہوتی ہے، بات کہتے گزر گئی۔ ۸ رنومبر کے لیے دوسرا جلسۂ عام قرار پایا۔ اور اب کی جلسہ کا مقام بجائے رفاہ عام کے کھلے ہوئے میدان کے، ممتاز یتیم خانہ اسلامیہ (واقع باغ گونگے نواب) کی عمارت تجویز ہوئی، جو باوجود وسیع ہونے کے بہرحال ایک محدود ومقید عمارت تھی بے قید میدان نہیں۔ جلسہ کے داعیوں میں اب کی پہلے سے بھی کہیں زاید لوگ شامل ہوئے۔ کوئی ۹۰ آدمیوں کے دستخط اعلان پر تھے۔ ان میں وکیل، بیرسٹر، رئیس، تاجر، عالم، دوکاندار پیشہ ور اور برادریوں کے چودھری، ہر طبقہ کے نمائندے پوری طرح پر تھے۔ اور اب کی محمد علی کے ساتھ مولانا شوکت علی اور جمعیۃ العلماء دہلی کے دو مشہور مقرر عالموں کو بھی بلایا گیا۔ مولوی حاجی ظفر الملک صاحب اپنا حجرۂ اعتکاف چھوڑ کر باہر نکلے۔ اور اب کی انتظامات گویا تمامتر ان ہی کے ہاتھ میں رہے۔ ادھر مولانا عبدالباری صاحب بھی سفر سے واپس آچکے تھے اور فرنگی محل ہی میں مقیم تھے۔ اخباری جنگ اور تحریری جنگ پرزور بلکہ چار چند جوش و سرگرمی کے ساتھ جاری۔ لکھنؤ کا مقامی پریس تقریباً سارے کا سارا فرنگی محل کا ہمنوا، لیکن باہر کے اخبارات زمیندار (لاہور) خلافت (بمبئی) مدینہ (بجنور) تنظیم (امرتسر) وغیرہ اکثر ہمدرد و محمد علی کے ساتھ۔ ادھر سے اگر اخباری مضامین و مقالات بہ کثرت نکلتے تو

اُدھر سے (خصوصاً فرنگی محل اور پھلواری سے) ان کے جواب میں پمفلٹ اور رسالے شائع ہوتے
ادھر خلافت کمیٹی جیسا زبردست ادارہ موجود تھا، جو لاکھ لٹ جانے پر بھی بہت کچھ منظم تھا۔
ادھر بھی اس کے جواب میں ایک نیا ادارہ انجمن خدام الحرمین کے نام سے عالم وجود میں آچکا تھا،
اور اس کے کارکنوں کا نیا نیا جوش و ولولہ قدرۃً بہت بڑھا ہوا تھا۔

اصل نزاع جہاں سے شروع ہوئی تھی، یعنی نجدیوں کے روضۂ مبارک پر حملہ کرنے کی روایت، سو یہ روایت اب سب کے نزدیک ضعیف کیا، باطل و موضوع ثابت ہو چکی تھی، اور یہ مسئلہ ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اب نہ اس پر بحث تھی نہ اس کا کوئی تذکرہ ——— جب جذبات بھڑک اٹھتے ہیں تو لوگ اصل حقائق اور نفس مسائل کی طرف سے ایسے ہی غافل و بے پروا ہو جاتے ہیں ——— بلکہ اب سارا زور اور ساری گرماگرمی وہابیت اور خوش عقیدگی کی باہمی اور قدیم جنگ میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک طرف یہ اصرار کہ قبوں اور پختہ قبروں کا نام و نشان بھی دنیا میں نہ رہنا چاہیے اور جو ہمت والا یہ کر گزرا، وہی مجاہد ہے، غازی ہے، سچا متبع سنت ہے۔ اور دوسری طرف یہ غلو کہ جس نے قبوں کو ہاتھ لگایا، اس گستاخ و بے ادب کے ملعون ہونے میں کیا شک۔ وہ رسولؐ اور آل رسول کا کھلا ہوا دشمن، اور اسلام کا مجرم و باغی ہے۔ وہ ڈھائی مہینہ کے اندر جس کثرت سے اشتہاروں، اعلانوں، مضمونوں، رسالوں، پمفلٹوں کا انبار اس موضوع پر فریقین کے پرجوش اہل قلم کی طرف سے لگ گیا، انھیں کوئی یکجا کرے، تو دفتر کے دفتر تیار ہو جائیں ——— اور جب ہر فریق کے جذبات اس حد تک مشتعل ہو جائیں اور ہر گروہ ان ہی بحثوں کو دین کا بنیادی مسئلہ بنا لے، تو ظاہر ہے کہ فریق مخالف اور اس کے پیشواؤں اور سرداروں کے لیے کسی نرمی و رواداری کی گنجائش اس کے قلب میں کہاں نکل سکتی ہے؟

گویا "مقلد" و "غیر مقلد" کے وزن پر اب مسلم ہندوستان "قبی" و "لاقبی" کے دو مخالف کیمپوں
میں بٹ چکا تھا۔ قبہ شکنی اور قبہ نوازی کے اس ہنگامہ و غلغلہ میں ادھر ادھر ڈگمگائے بغیر، جادۂ مستقیم
پر گنتی کے جن چند لوگوں کے قدم ثابت و استوار رہے، ان کے سردار و پیشوا محمد علی تھے۔ محمد علی اس "حرب
عقائد" سے بے تعلق رہ اور اس سارے قضیہ کو اس سے کہیں بلند تر زاویۂ نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔
وہ سلطان ابن سعود کے دوست، ہمدرد و ہوا خواہ اس وقت بیشک تھے۔ مگر صرف اس بنا پر
کہ ان کے خیال میں اب سلطان کے ذریعہ سے جزیرۃ العرب اغیار کے خطرۂ دست برد محفوظ ہو رہا تھا
اور اب ارض حرم میں صحیح و "آزاد اسلامی" یعنی عالم اسلام کی مشترک حکومت کی بنیاد پڑ رہی تھی، قبے
رہیں یا گریں، بہرحال محمد علی کی نظر میں سلطان نجد کی حیثیت ارض حرم کو شریفی مظالم سے نجات دلانے
والے محسن کی تھی۔ اور امید یہ تھی اب ارض حجاز پر کسی ایک نسل یا خاندان کو موروثی ملوکیت کے بجائے
اسلامی جمہوریت قائم ہو گی۔ محمد علی کو جزئیات کلامیہ و فقیہ میں پڑنے کی فرصت کہاں تھی۔ ان کے پیش نظر
تو اتنا عظیم الشان کام تھا کہ جس کی نظیر ہی خلفائے راشدین کے بعد کہیں نہیں ملتی۔ وہ محض ان ہی توقعات
اور امیدوں کے سہارے سلطان کے ہمدرد و حامی تھے، اور باوجود ذاتی طور پر قبہ نوازی کی جانب میلان
رکھنے کے قبہ نوازوں کی اس ہنگامہ آرائی کو اپنے مقاصد عالی کے حق میں سخت مضر سمجھ رہے تھے۔ اور
دل سے چاہ رہے تھے کہ کسی طرح ہندوستان میں یہ شور فرو ہو۔ اور سلطان کو بجائے مخالفت و
مزاحمت کے ہندوستان سے تائید و امداد حاصل ہو ــــــــ ان باریکیوں اور بلند خیالیوں
تک نظر کس کی پہنچی؟ نتیجہ قدرۃً یہ نکلا کہ ادھر ہندوستان کے سارے قبہ شکن خوش ہوئے کہ محمد علی
جیسی زبردست شخصیت کی تائید ہاتھ آ گئی۔ ادھر ملک بھر کے قبہ نواز اسی درجہ میں ناخوش و ناراض
بھی کہ راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ، راستہ کا سب سے بھاری پتھر یہی محمد علی کی ذات ہے۔ اگر اسے گرا لیا
تو بس بیڑا پار ہے۔ ان چند ہفتوں کے اندر جتنے کارٹون محمد علی کے نکل گئے، جتنی ہجویہ نظمیں ان کے

منطقی چھیں جتنی گالیاں اور کوسنے ان پر پڑے، ان کے سہنے اور برداشت کرنے کے لیے بھی محمد علی ہی کا جگر درکار تھا۔

مثنوی کے شروع ہی میں ایک شعر ہے ؎

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من ۔۔۔ وز درونِ من نجست اسرارِ من

اب اس کا مصداق ہندوستان کے طول وعرض میں محمد علی سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔ دوست و دشمن دونوں کا منطقی استدلال یہ تھا کہ

سلطان ابن سعود وہابی اور قبہ شکن ہیں۔

محمد علی سلطان کے دوست و ہمدرد ہیں،

اس لیے محمد علی بھی وہابی اور قبہ شکن ہیں!

تحریک خارجیت نے، جو ایک طرح کی "انارکزم" (لاحکومتی) کے مرادف ہے، جب خلافت کے دور رابع میں جنم لینا شروع کیا تو اتفاق سے مسند خلافت پر حضرت علیؓ فائز تھے، اور اسلیے خارجیت جو درحقیقت ہر بشری حکومت کے خلاف ایک بغاوت تھی اور اپنی نافہمی سے قرآن کو ہر انسانی حکومت کا مطلق صورت میں مخالف سمجھ رہی تھی، اس کی بغاوت کا رخ قدرۃً اس وقت امیر المومنین حضرت علیؓ کی جانب ہو گیا۔ اس سے لوگوں میں یہ خیال چل پڑا کہ خارجیت کوئی تحریک شیعیت کے مقابل، اور بالذات حضرت علیؓ کی مخالفت میں تھی۔ اور عوام تو عوام خواص تک اب تک اس خیال میں پڑے ہوئے ہیں کہ خارجیت اور شیعیت ہم سطح تحریکیں، ایک دوسرے مقابل، اور ذات علیؓ کی مطلق دشمنی اور مطلق دوستی کے مرادف ہیں!

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا!

اس وقت خلیفہ اگر اتفاق سے بجائے حضرت علیؓ کے حضرت عمرؓ یا حضرت ابو بکرؓ ہوتے، تو خارجی یقیناً ان کے بھی اسی درجہ میں دشمن ہوتے۔ اس لیے کہ انھیں اپنے اصول وعقائد کے لحاظ سے مخالفت ان میں سے کسی کی متعین شخصیت سے نہیں بلکہ نفس امارت و امامت و حاکمیت انسانی سے تھی، خواہ وہ حکمراں ان کے سامنے، زید، عمر، بکر کوئی بھی انسان ہوتا۔ ———— ٹھیک اسی حال میں اس وقت محمد علی تھے۔ وہ ہر اس مسلمان کے حامی وہمدرد ہو جاتے (بغیر اس کے جزئیات عقائد کے اندر گھسے ہوئے) جو ارض حجاز کو غیر مسلم اور فرنگی اثرات سے آزاد کرتا، خواہ وہ مسلمان "مقلد" ہوتا یا "غیر مقلد" خارجی ہوتا یا شیعی۔ زیدی ہوتا یا حنبلی، "وہابی" ہوتا یا "بدعتی"۔ یہی بات انھوں نے سلطان ابن سعود میں پائی تھی۔ اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ سلطان حنبلی تھے، قبہ شکن تھے، ابن عبد الوہاب کے ہم مشرب تھے۔ محمد علی کو ان کی حنبلیت، وہابیت، قبہ شکنی، ان چیزوں سے کیا غرض اور کیا بحث تھی۔

باب (۴۲)

سنہ ۱۹۲۵ء (۱۲)

(حُبِّ علیؓ کم، بغض معاویہؓ زیادہ)

فرنگی محل کے دور متاخرین میں ایک جامع شریعت و طریقت، عالم باعمل و سالک بے بدل مولانا ابوالحیا محمد نعیم (المتوفی ۱۹۰۲ء) قدس اللہ سرہ گزرے ہیں، ان کے ایک مسترشد روایت کرتے تھے کہ "حضرت نے جب میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، تو فرمایا کہ میاں، اگر حق تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت سے میری مغفرت کر دی تو وعدہ کرتا ہوں کہ اُس وقت تمہیں یاد رکھوں گا۔ اب تم بھی اسی طرح کا اقرار مجھ سے کرو کہ حق تعالیٰ کے ہاں اگر تمہیں مقبول ثابت ہوئے تو تم بھی مجھکو بھول نہ جاؤ گے۔ معاہدۂ بیعت تو طرفین سے ہوتا ہے۔ پیر و مرید دونوں میں سے جس کسی کا نصیب یاوری کر جائے، وہ دوسرے کو اپنے ساتھ گھسیٹے"۔ پیر و مرید کے سلسلہ میں عام عقیدہ دلوں میں جما ہوا یہ ہے کہ حقوق سارے کے سارے مرشد ہی کو حاصل رہتے ہیں۔ اور فرائض کا بار سارے کا سارا مرید کے ذمہ رہتا ہے۔ مولانا کے ارشاد نے اس کے برعکس یہ حقیقت واضح کر دی، کہ کچھ حقوق مرید کے بھی ہوتے ہیں۔ اور دونوں پر ایک دوسرے کی ہوا خواہی واجب ہوتی ہے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہٗ کا فضل و کمال کسی تعارف کا محتاج نہیں اپنے مرشد حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے عاشق زار بھی تھے۔ مرشد نے مکہ معظمہ سے اپنی تازہ تصنیف "فیصلہ ہفت مسئلہ"

کے دو سو نسخے ان کے پاس گنگوہ روانہ فرمائے۔ مولانا نے بجائے اس کے کہ مرشد کی کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور سر اور آنکھوں پر جگہ دیتے، تعظیم و تکریم یہ کی کہ انھیں ہاتھ تک نہ لگایا، بلکہ ایک روایت تو یہاں تک ہے کہ ان سے حمام گرم کرایا! یہ اس لیے کہ مولانا کی رائے میں حضرت حاجی صاحب کی تحقیق ان مسائل میں صحیح نہ تھی، اور رسالہ کی اشاعت مصالحِ امت کے حق میں مضر تھی۔ مرشد اور مرید کے تعلقات اس واقعہ کے بعد بھی ایک طرف سے شفقت و کرم کے اور دوسری طرف سے والہانہ عقیدت کے بدستور قائم رہے۔

ماضی قریب کے وہ مسلّم الثبوت بزرگوں کی حکایتوں سے نتیجہ یہ نکلا کہ عوام افراطِ عقیدت اور غلو سے خوش عقیدگی میں جو کچھ بھی سمجھتے رہیں، محققین نے مرید کا بھی ضمیر ایک زندہ ضمیر تسلیم کیا ہے، اور مرشد کے وجود میں ضم ہوئے بغیر بھی، اس کی مقبولیت کا امکان تو بہرحال مانا ہے اور پھر عین دورِ حاضر میں حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ نے جس جس طرح مرشد کے مطاع و مقتدا ہونے پر قیدیں لگائی ہیں، اور اس کی اطاعت و تقلید کو واجب جن جن حدود کے اندر رکھا ہے، اس کا تعلق تو صرف ان کے رسائل و مقالات کے دیکھنے سے ہے۔

محمد علی کے دامن پر، خوش عقیدہ گروہ کی طرف سے، ایک بہت بڑا داغ مرشد کی مخالفت کا عاید کیا جاتا ہے۔ اور اچھے اچھوں کی زبان پر یہ فقرہ آجاتا ہے کہ "وہ کچھ بھی سہی، شیخ کی مخالفت آئینِ طریقت میں کفر سے کم نہیں" حالانکہ یہ اختلاف جو کچھ بھی تھا، سلوک و طریقت کے کسی باطنی معاملہ میں تو کیا، شریعتِ ظاہری کے بھی کسی مسئلہ میں نہ تھا۔ اور تصادمِ افکار کا تعلق عقاید سے ذرہ بھر بھی نہ تھا۔ محمد علی کا کہنا یہ تھا کہ سیاسیاتِ حجاز بلکہ سیاسیاتِ عالمِ اسلامی کے سمجھنے میں اس وقت مولانا عبد الباری صاحب کو شدید غلط فہمی ہو رہی ہے۔

وہ غلط اطلاعات پر اعتماد کرکے سلطان کو آثار مسلمین کا دشمن سمجھ بیٹھے ہیں، اور اس لیے اس کی مخالفت پر تل گئے ہیں۔ حالانکہ سلطان ایک مبشر ہے، حجاز کو ملوکیت سے اور فرنگی اثرات سے نجات دلانے والا ہے۔ جمہوریت وشورویت کی بنیاد قائم کرکے خلافت راشدہ کی روح کو تازہ کرنے والا ہے ــــــــــ ان کی سیتاپور والی تقریر کا اقتباس ابھی چند صفحے اوپر درج ہو چکا ہے کہ جب کسی نے دوران تقریر میں سوال کر دیا، کہ آپ تو ہمیں ابن سعود کی طرف بلا رہے ہیں اور آپ کے شیخ ابن سعود کو نکلوا رہے ہیں، مرشد و مرید میں یہ مخالفت کیسی؟ تو محمد علی نے برجستہ جواب دیا کہ

"یہ مخالفت نہیں ہے۔ رائے وبصیرت کا اختلاف ہے۔ جن معاملات میں مجھے ہدایت ورہنمائی کی ضرورت تھی، وہ میری دستگیری کر رہے ہیں جس مسئلہ میں خود انھیں صحیح رہنمائی کی ضرورت ہے، میرا فرض ہے کہ میں ان کی اعانت کروں"۔

بات بالکل صاف و واضح تھی۔ لیکن دنیا اتنی نیک، صلح جو، معقولیت پسند کب رہی ہے؟ یہاں تو لوگوں کو مزہ لڑائی کا تماشہ دیکھنے میں ہمیشہ آیا ہے۔ جب امیرالمومنین علی مرتضیٰؓ اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کے درمیان لگائی بجھائی کرنے والوں انفاق ڈلوانے والوں کی کمی نہ تھی، تو چودھویں صدی کے محمد علی اور ان کے مرشد کس شمار وقطار میں تھے ــــــــــ اُدھر ہر وقت یہ کہہ کر ابھارا جاتا، اکسایا جاتا رہتا تھا کہ "دیکھیے یہ آپ کے مرید ہیں۔ مرید ہو کر شیخ سے یہ بغاوت، گستاخی، نافرمانی۔ ان کی مریدی باقی کب رہی؟ مریدی سے ان کے عاق ہونے کا اعلان کیجیے۔ ایسے بے ادب وہابی نیچری کو اپنے حلقہ میں رکھنے سے نتیجہ کیا؟" اور ادھر بار بار یہ صدائیں اور یہ کھٹیاں اٹھتی رہتی تھیں، کہ جو کچھ بھی ہو جائے، اب محمد علی کو مولوی عبدالباری سے ہرگز ملنے اور ایک نہ ہونے دیا جائے۔ اور یہ ڈائری نویس چونکہ محمد علی کے ہاں کا

خاص مقرب اور منہ لگا سمجھا جاتا تھا، اس لیے اس کے اوپر دباؤ خاص طور سے اس کے لیے پڑتے رہتے تھے۔ اور یہ دباؤ ڈالنے والے ہوتے کون تھے؟ کوئی باہر کے اور بیگانے نہیں۔ آپس ہی کے اسی جوار اور اپنی برادری ہی کے لوگ۔ جو کسی نہ کسی وجہ سے مولانائے فرنگی محلی سے ملال رکھتے تھے ـــــــ ہر کینہ اور بغض کے نکالنے کا یہ موقع "خداداد" ہاتھ آگیا تھا!

ہمیشہ کے بیگانے اور اجنبی، جنھیں نہ محمد علی کی ذات سے کبھی عقیدت رہی، نہ ان کے اخبارات یا تحریکات سے کوئی دلچسپی یا تعلق رہا، اس وقت جسم پر ہمدردی کا لبادہ پہن اور چہرہ پر عقیدت کا نقاب ڈال، محمد علی کے پاس آتے، اور بے تکلفی کی جرأت کے ساتھ جھٹ سے سوال کر بیٹھتے کہ "یہ تو فرمائیے، اب فسخ بیعت کا اعلان کب ہوگا؟ ہم تو اس دن کے منتظر ہیں۔ ہم لوگ اس ذلت کو اب مزید برداشت نہیں کر سکتے" ـــــــ ملیح آباد کے ایک جوان عمر اجنبی نے، چودھری خلیق الزمان کے مکان پر آکر، محمد علی کو ایک کمرہ میں تنہا پاکر، اور مجھے اپنا ہمدرد گمان کرکے، میرے سامنے جھٹ سے یہ سوال کر دیا۔ محمد علی نے بالکل روکھے ہو کر جواب دیا،

"یہ معاملہ بالکل میری ذات کا ہے۔ آپ کو کسی قومی معاملہ پر گفتگو کرنا ہو تو کیجیے!"

ادھر اگر محمد علی پر جی کھول کر تبرے ہو رہے تھے، آوازے کسے جا رہے تھے، کارٹون بن رہے تھے، ہجویں کہی جا رہی تھیں، تو ادھر "مسعودی" پریس میں بھی مولانائے فرنگی محلی کی بھی توہین و تضحیک کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رہا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے ایک عزیز قریب نے، جو کسی خانگی رنجش کی بنا پر مولانا سے سخت بیزار تھے، پارٹی کے مشورہ سے (اور اس مشورہ پر آج بہ صد حسرت و ندامت اعتراف ہے کہ آخری صاد کرنے والا یہ ڈائری نویس ہی تھا، مولانائے فرنگی محلی کی، درح اسکو

معاف فرمائے) "فرنگی محل کا کچا چٹھا" ایک لمبے چوڑے اشتہار کی صورت میں چھاپ کر تقسیم کرنا شروع کر دیا ——— یہ چٹھا "سچا" خدا جانے کس حد تک تھا، لیکن "کچا" تو یقیناً تھا!

ان ذاتی قصوں اور فضیحتوں سے بلند اور مستثنیٰ! صرف ایک ذات تھی، اور وہ خود محمد علی کی تھی۔ اپنی "پارٹی" کے جوش و خروش کو ہمیشہ ٹھنڈا کرتے رہتے۔ اور ہمدرد پر اس باب میں جتنی کڑی نظر رکھتے، اس کا تذکرہ ابھی چار نمبر قبل آچکا ہے۔

باب (۴۳)

۱۹۳۵ء (۱۳)

(خطرناک جلسہ)

۸ر نومبر، اتوار کا دن تھا کہ محمد علی دس بجے دن کو وارد لکھنؤ ہوئے۔ میں حسب معمول محمد علی کی پیشوائی کے لیے دو ایک روز قبل دریاباد سے چل کر لکھنؤ آ گیا تھا، بلکہ محمد علی کو لینے رات کی ٹرین سے سندیلہ اسٹیشن تک چلا بھی گیا تھا۔ اتفاق کہ محمد علی بجائے ادھر سے آنے کے، کانپور کی طرف سے آئے۔ بہر حال اسٹیشن سے موٹر پر ان کا ساتھ رہا۔ اسی ٹرین سے جمعیۃ العلماء کے بھیجے ہوئے مولانا عبد الحلیم صدیقی اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی بھی اترے۔ مولانا شوکت علی صاحب عارف صاحب کے ساتھ بمبئی کی طرف سے دو گھنٹہ قبل وارد ہو چکے تھے۔ فرنگی محل کے مقابلہ کا اصل مورچہ (یا ہیڈ کوارٹرز) چودھری خلیق الزماں کے مکان پر تھا۔ ایکی بھی علی برادران وہیں اترے۔ جذبات کا ہیجان اتنے زور پر تھا کہ ابھی کل تک جو مخلص دوست، رفیق کار و شریک عمل تھے، وہ آج ایک دوسرے کی صورت سے بیزار، بلکہ ایک دوسرے کی عزت و آبرو کے خواہاں تھے۔ یہ دو ڈھائی ہفتہ کا وقفہ جو ملا تھا، یہ

صلح تھی اک مہلت سامان جنگ

اس میں جذبات دھیمے پڑنے کے بجائے اور بھڑک چکے تھے۔ اور نفرت و عداوت کے شعلے بلند

سے بلند تر ہو چکے تھے۔ ادھر یہ ٹھن چکی تھی کہ (بہ زبان مولوی ظفرالملک) جو کچھ بھی ہو، فرنگی محل کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رہنا ہے۔ ادھر یہ ضد سما گئی تھی کہ (ایک جوشیلے فرنگی محلی کی زبان میں) دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے "یہ شہر کے نوٹے وہابیوں" کا طلب کیا ہوا جلسہ کامیاب نہ ہونے پائے گا۔ داعیان جلسہ نے، پچھلے جلسہ کی ناکامی سے ہوشیار ہو کر اب کی ہر طرح کی خوب مضبوطیاں کر لی تھیں، اور سب کے سر خیل، اور نگران اعلیٰ مولوی ظفرالملک علوی تھے ـــــ مخالفین جلسہ کی ریشہ دوانیوں کا نمبر ان سے بھی بڑھا ہوا رہا۔ اور سب جانتے ہیں کہ کسی جلسہ میں نظم قائم رکھنے کے مقابلہ میں اُس میں بد نظمی، یہ ہمی، ہلڑ پیدا کر دینا کتنا آسان ہوتا ہے۔

لکھنؤ پہنچتے ہی یہ سننے میں آیا تھا کہ تخریبیے اب کی، پچھلے جلسہ کی طرح صرف حلق و حنجرہ اور آوازہی کی قوت سے نہیں، بلکہ ہاتھ پیر، لاٹھی اور ڈنڈے کی بھی قوت سے پوری طرح کام لینگے اور جنھوں نے حجاز میں قبے توڑے، ان کے ہمدردوں کے سروں اور کھوپڑیوں کے قبے لکھنؤ میں توڑ کر اپنے دست و بازو کی زبردستی کا ثبوت دینگے۔ یہ خبر بھی کان میں پڑی کہ سلیم پور اور اکبر پور کے شیعہ تعلقداروں (راجہ احمد علی خان اور راجہ نواب علی خان) کے ساتھ اب کی گدیہ کے سنی تعلقدار (شیخ مشیر حسین قدوائی) کا بھی ساز ہو گیا ہے اور اسی اتحاد ثلثہ نے جلسہ کو درہم برہم کرنے کو دیہات سے اپنی رعایا کو طلب فرمایا ہے۔

بعض خبریں ان سے بھی بڑھ بڑھ کر وحشت ناک تھیں۔ دل نہ اس وقت ان کے یقین کرنے پر آمادہ تھا اور نہ اس وقت ان کے بیان کرنے پر۔ موٹر پر جب محمد علی کے ساتھ بیٹھا تو اسٹیشن سے مکان تک یہ مفصل رپورٹ ان کے گوش گزار کر دی۔ لیکن اللہ رے ظرف!

ہراس، اندیشہ پیدا ہونا کیا معنی، اطمینان قلب کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ یہاں بیان کرتے دل ہولا جاتا تھا، وہاں خود اپنے کو خطرہ کی زد میں سنکر ذرا بھی تغیر نہ ہوا! موٹر کے رکتے رکتے میں نے آخری اپیل التجا کے لہجہ میں کی "مولانا، آج آپ کے جوش کا نہیں، آپ کے تدبر کا امتحان ہے۔ تقریر جذباتی نہیں، حکیمانہ و مدبرانہ ہو" جواب میں محمد علی صرف مسکرا دیے۔ جیسے یہ کہہ رہے ہوں کہ "ایاز قدر خود بشناس۔ لقمان کو حکمت سکھانے چلے ہو" ——— سچ ہے اللہ جسے بڑا بنانا ہے، اس کا ظرف، تحمل، حوصلہ بھی بہت بڑا کر دیتا ہے۔

فرنگی محل حاضری کی وضعداری میں ابکی بھی محمد علی نے فرق نہ آنے دیا۔ پچھلی بار جب ان کے شیخ موجود نہ تھے، جب تو انھوں نے معمول میں ناغہ ہونے نہیں دیا، تو ابکی تو شیخ موجود تھے۔ ابکی کیسے نہ جاتے۔ ابکی میں بھی ہمراہ نہیں گیا، اور میرے سوا کوئی اور تو جا سکتا ہی نہ تھا۔ بالکل تنہا گئے، اور ملاقات تخلیہ کی رہی۔ محمد علی تو رقیق القلب تھے ہی، ان کے مرشد بھی رونے رلانے میں کچھ کم نہ تھے۔ جذبات سے بہت جلد متاثر بلکہ مغلوب ہو جاتے۔ بچھڑے ہوئے مرید کو ایک بار پھر اپنے آستانہ پہ دیکھ، گلے سے لپٹ گئے اور لپٹ کر رونے لگے۔ ایک صاحب نے مشہور یہ کر دیا کہ دونوں مل کر خوب روئے۔ محمد علی نے مجھ سے اس کی پرزور تردید کی، اور تصریح کے ساتھ کہا کہ "اس وقت تو وہی روتے تھے، میرے ایک آنسو بھی نہیں نکلا تھا!"

آج کا دن لرزہ خیز افواہوں اور رعشہ انگیز دھمکیوں کا دن تھا۔ افواہیں طرح طرح کی سننے میں آرہی تھیں۔ مار پیٹ کی افواہیں، گالم گلوج کی افواہیں، فوجداری اور لٹھ بازی کی افواہیں، خون خرابہ کی افواہیں۔ اور دھمکیاں یہ مل رہی تھیں کہ آج شہر کے "وہابیوں" اور "ندویوں" کی خیر نہیں۔ ملیح آباد کے جنگ آزما، پرجوش خطہ کے کچھ جوان چودھری صاحب

اور ظفر الملک صاحب کی کمان میں ہیں۔ ان سے مقابلہ کے لیے دیہات سے لٹھ بند سپاہی بلوائے گئے ہیں۔ اور اودھ کے تعلقہ داروں نے اپنی اپنی رعایا کی فوج بھرتی کر بلائی ہے ——— ممکن ہے، اور ممکن کیسا، اب کہتا ہوں کہ یقیناً ایسی ہی خبریں ہم لوگوں کی تیاریوں سے متعلق اُدھر بھی پہنچ رہی ہوں گی۔ لیکن میرے علم میں تو بہرحال اسی فریق کی جارحانہ اور سفاکانہ تیاریوں کی خبریں آتی رہیں۔

مولوی عبد الرحمن ندوی نگرامی مرحوم ہماری جماعت میں بڑے نیک اور معصوم صفت جوان صالح تھے۔ ان بیچارہ نے روزہ رکھ لیا کہ اگر نوبت شہادت ہی کی آگئی تو حالتِ صوم میں شہید ہونے کا اجر مزید ہو۔ جلسہ کا وقت بعد عصر تھا، میں بعد ظہر اپنے ہاں سے کھانا کھا خلیق صاحب کے ہاں آگیا۔ خوب یاد ہے کہ کھانا کھاتا جاتا تھا اور خیال کرتا جاتا تھا کہ کیا عجب جو یہ زندگی کا آخری کھانا ہو ——— روایتیں ویسی ہی ہولناک کان میں پڑ چکی تھیں ——— جلسہ اور جلسہ گاہ دونوں کے انچارج مولوی ظفر الملک صاحب تھے۔ انھوں نے ازراہ احتیاط اپنے فریق میں منادی کرادی تھی کہ کوئی شخص لاٹھی لیکر جلسہ میں نہ آئے کہ اس سے خواہ مخواہ دوسرے فریق کو اشتعال ہوگا۔ مگر مخالفین کا بیان ہے کہ لاٹھیوں کی ایک تعداد پہلے ہی سے جلسہ میں چھپاکر جمع کرلی گئی تھی۔ واللہ اعلم۔ بہرحال دوپہر ہی سے ہنود اور لٹھ بندوں دونوں کا جماؤ شروع ہوگیا۔ جلسہ گاہ کا دروازہ ابھی بند ہی تھا، اور جلسہ کے داعیوں اور منتظموں سے اکا دکا ہی کوئی پہنچا ہوگا کہ مخالفین نے باہر سے گویا پورا محاصرہ کرلیا اور جابجا اپنے مورچے قائم کرلیے ——— سرپھٹول کی یہ تیاریاں مسلمان کی مسلمان کے مقابلہ میں ہو رہی تھیں۔

خلیق صاحب کے ہاں خبریں منٹ منٹ پر پہونچ رہی تھیں۔ میں خود تو گھبرا چلا، اور میری ہی طرح کے دوسرے کمزور دل و ہمت والے بھی۔ لیکن علی برادران اور اُنکے میزبان خلیق صاحب کے نہ چہرہ پر شکن نہ کسی انداز و گفتار میں کوئی خوف و ہراس۔ بلکہ خلیق صاحب نے تو ایک مرتبہ جوش میں آکر اپنے ایک ملیح آبادی لفٹنٹ کو بزن بول دینے کا حکم بھی دیدیا۔ محمد علی بیٹھے ہوئے یہ اطمینان باتیں کررہے ہیں، اور اسکے منتظر کہ کسی طرح جلسہ کا وقت آئے، اور جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوں!

باب (۴۴)

۱۹۲۵ء (۱۴)

(عثمانؓ، علیؓ کے نقش قدم پر)

وقت خدا خدا کر کے آیا۔ جلسہ گاہ کی عمارت، ممتاز دار الیتامیٰ، کچھ ایسی دور نہ تھی، چار فرلانگ کے فاصلہ پر تھی۔ علی برادران سواری پر روانہ کیے گئے، اور پیچھے پیچھے ہم لوگ، یعنی جمعیتی مولوی صاحبان چودھری خلیق الزماں اور یہ ڈائری نویس، دوسرے راستہ سے۔ جلسہ گاہ پر پہنچے، تو ایک عجیب ہی منظر دیکھنے میں آیا۔ کانوں جو خبریں سنی تھیں، وہ تو عجیب تھیں ہی، آنکھوں سے جو باتیں دیکھنے میں آئیں وہ عجیب تر نکلیں۔ دیہات کے نیچ ذات کے ہندو، پاسی وغیرہ کی قسم کے، سینہ پر نئی اور نوخیز انجمن خدام الحرمین کا بلا، خادم الحرمین، لگائے ہوئے، اور ان کا ایک جم غفیر لاٹھیاں لیے ہوئے جلسہ گاہ کے ارگرد گھیرا ڈالے ہوئے ہے — ایسے عجیب وغریب خادم الحرمین، ہم نے آپ نے کیا معنی چشم پیر فلک نے بھی کبھی کیوں دیکھے ہوں گے! — اور ان ہی کے درمیان جا بجا حلقۂ فرنگی محل کے متوسلین چھلکتے ہوئے۔ یہیں ایک خالص فرنگی محلی صاحب کو دیکھا، چلا چلا کر دعظ فرما رہے ہیں کہ یہ مردود وہابی گستاخ وبے ادب ہیں، روضۂ رسول کے دشمن ہیں۔ ہمارے شاہ مینا صاحب کا مزار کھود ڈالنے کی فکر میں ہیں، وقس علیٰ ہذا۔ کیسی تحقیق شرعی اور کہاں کا استدلال عقلی۔ پروپیگنڈا اور صرف پروپیگنڈا۔ شاہ مینا صاحب کا مزار لکھنؤ کے بچہ بچہ کی آنکھ

میں سرمۂ عقیدت بنا ہوا تھا، اس کا نام بڑے موقع سے لایا گیا۔ یہ صاحب اس نیازمند کے
خاص اخلاص کرم فرما تھے۔ فنظرے نظر ملی، علیک سلیک ہوئی۔ دل نے محسوس کیا کہ اُدھر نگاہیں
جھکی ہوئی ہیں، اٹھ نہیں رہی ہیں۔

پھاٹک پر ایک غل، ہنگامہ، شور، پکار، ہڑبونگ اور چپقلش۔ ہر شخص دوسرے پر پلا پڑ رہا ہے
کہ دروازہ میں میں ہی سب سے پہلے داخل ہو جاؤں۔ دروازہ کے تنگ زینہ پر ہجوم کا وہ ریلا کہ دبلا پتلا
آدمی تو اب کچلا اور جب کچلا! علی برادران سواری پر تھے، چند منٹ قبل پہنچ چکے تھے۔ ان کا داخلہ
تو دیکھنے میں آیا نہیں کہ کس شان سے ہوا۔ سننے میں یہ آیا کہ لٹھ بند "خدام الحرمین" انھیں دیکھ خود ہی
ان کی شوکت و وجاہت سے مرعوب ہو گئے، اور بجائے روک ٹوک کے، بے اختیار "محمد علی
شوکت علی کی جے" پکارنے لگے! اپنی آنکھوں دیکھی بات یہ ہے کہ خلیق صاحب کے لیے بھیڑ خود بخود
چھنٹتی گئی اور راستہ خود نکلتا آیا۔ اس سے قیاس یہی ہوتا ہے کہ علی برادران کا استقبال ان کے
شان کے شایان ہی ہوا ہوگا۔ میں جب داخل ہونے لگا تو دیکھا کہ اپنی جماعت کے ایک صاحب
اوپر کھڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے معاً مجھے ہاتھ سے کھینچ کر اندر لے لیا! ——— یہ تحقیق
کبھی نہ ہو سکی کہ گنوار دیہاتیوں بلکہ پاسیوں تک کو خدام الحرمین بنا ڈالنے کی اپج میں آیا مولانا
فرنگی محلی کی اجازت بھی شریک تھی یا یوں ہی بالا بالا یار لوگوں نے یہ کارروائی کر ڈالی تھی۔ کم از کم
اس نیازمند کو تو مولانا کے ساتھ یہ سوءظن قائم کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اور محمد علی کو تو یقین تھا
کہ مولانا ہر گز اسے روا نہیں رکھ سکتے تھے۔

تاریخوں میں جب یہ پڑھتا تھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مروان اور
فلاں فلاں جعلی کارروائیاں حضرت کے نام سے کر گزرے، اور لوگوں نے انتقام حضرت سے لیا

یا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے وقت، ایک انتشار اور فلاں فلاں افراط ہوا خواہی میں خود خلیفہ کی نافرمانی کر بیٹھے، اور بار بار حدود سے باہر نکل نکل گئے، تو وہ لوگ کچھ بہت عجیب سے معلوم ہوتے۔ اور یہ باتیں دل میں پوری طرح اترتی بھی نہ تھیں۔ قدرت نے اس موقع پر ان تاریخی اور نفسیاتی حقائق کا ایک چھوٹے سے پیمانہ پر مشاہدہ کرا دیا، اور عملاً یہ سبق دیدیا کہ فطرت بشری کے تلونات ہر دور، ہر عصر میں، اپنے اپنے ظرف و ماحول کے ماتحت یکساں ہی رہے ہیں۔ عجب عجب کارروائیاں ادھر سے بھی ہوتی رہتیں اور ادھر سے بھی۔ مقصد تمامتر یہ ہوتا کہ اشتعال برابر بڑھتا رہے، اور اختلاف کی آگ کسی طرح بجھنے نہ پائے۔ اپنے فریق کی کارگزاریوں کا علم ذرا تفصیلی ہے اور چشم دید۔ فریق ثانی کی حرکتوں کا علم اجمالی ہے اور وہ بھی زیادہ تر سماعی ——— بس گنتی کے چند افراد ایسے تھے جو شخصیتوں اور پارٹیوں سے نظر قطع کیے ہوئے محض اصول کی خاطر، اخلاص کے ساتھ محمد علی کے جھنڈے کے نیچے تھے۔ اور ان چند میں ایک ممتاز، اور اپنے کو گمنام و بے نشان رکھنے کی کوشش کے باوجود ممتاز ہستی، شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے مرید و مسترشد، جواں مرد و جواں مرگ جوان صالح مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی کی تھی۔

باہر کے لوگوں کو کیا خبر کہ محمد علی کے دل و جگر پر اس وقت کیا گزر رہی تھی، پیر و مرشد سے جنگ، اور پھر کیسا مرشد، جس کے ساتھ روحانی تعلقات کے پہلو بہ پہلو، محبت کے، دوستی کے سالہا سال کی رفاقت و شرکت عمل کے، بھائی چارہ کے مادی تعلقات بھی گہرے اور شدید تھے! جنگ آسان نہ تھی۔ محمد علی جیسے شیر دل کے لیے بھی آسان نہ تھی۔ خدا معلوم کس کس طرح دل میں گھٹ گھٹ کر رہتے ہوں گے۔ پچھلے جلسے کے موقع پر (جو اکتوبر میں رفاہ عام میں ہوا تھا اور ناکام و ناتمام رہا تھا) تو خیر مولانا نے فرنگی محلی لکھنؤ سے باہر ہزار ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلہ پر تھے، اور محمد علی کے پاس اپنا دل سمجھانے کے لیے یہ عذر کافی تھا۔ لیکن ابکی تو بات یوں بھی نہیں بن رہی تھی

آج تو مولانا بہ نفس نفیس موجود تھے۔ آج ان ہی کے شہر میں، ان ہی کے مریدوں کی سپہ سالاری میں عین ان ہی کی انجمن (خدام الحرمین کے صدر مولانا ہی تھے) کی طرف سے یہ استقبال محمد علی کا ہو رہا تھا! محمد علی یہ حیرت انگیز تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اپنی آنکھوں کو کیسے جھٹلاتے؟ سنی کو ان سنی بارہا کر چکے تھے، اب دیکھی کو ان دیکھی کیسے بنا لیتے؟

۱۹۱۹ء کا ذکر ہے، جب علی برادران قید فرنگ میں تھے کہ دہلی میں ہندو مسلم اتحاد کا ریلا زور و شور سے آیا۔ ہندو مسلمان دونوں ایک ہی میدان میں سنگینوں اور گولیوں کا نشانہ بنائے جا چکے تھے۔ اسی ہیجان اتحاد کے وقت جامع مسجد میں ایک جلسہ ہوا، اس میں آریہ سماجیوں کے مشہور لیڈر سوامی شردھانند نے مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی۔ جلسہ کے بعد باہر کے مسلمانوں نے لے دے شروع کی کہ مسجد کے اندر ہندو کیسے گھسا، اور گھسا تو خیر گھسا مسجد کے منبر پر بھی چڑھ گیا؟! اس اعتراض میں پیش پیش فرنگی محل تھا۔ ہمدم مرحوم کی پرانی فائلیں اس کی گواہی دیں گی۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ۱۹۲۵ء میں بھی فرنگی محل، نیچ ہندوؤں اور پاسیوں کو کھلے خزانے، ہانکے پکارے "خادم الحرمین" بنا رہا تھا! گویا سنہ ۱۹ء میں اگر اونچی ذات کے معزز ہندو بھی مسلمانوں کی اجازت کے بعد مسجد میں داخل ہونے کے قابل نہ تھے، تو سنہ ۲۵ء میں نیچی ذات کے ادنیٰ ہندو، مکہ و مدینہ کی خدمت کے قابل ہو گئے تھے ——— ضد اور غصہ میں انسان کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے!

بہر حال ان ہی لاٹھیوں اور لٹھ بندوں کو چیرتے اور ان کے درمیان گھستے پلتے، ہم لوگ جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔ مولانائے فرنگی محلی خود تو تشریف فرما نہ تھے، باقی ان کے خاندان کے دوسرے ذمہ دار حضرات، نیز ان کی پارٹی کے اکابر سب موجود۔ مجمع موافقین و مخالفین کو ملا کر عظیم الشان۔ علی برادران ڈائس پر جا کر بیٹھ لیے، تو مولوی ظفر الملک صاحب نے بہ حیثیت داعی جلسہ پکار کر کہا کہ "ہم لوگ جلسہ

کرنے کو تیار ہیں اور میں داعیان جلسہ کی طرف سے حفظ امن کا ذمہ لیتا ہوں۔ اب فریق مخالف کے لیڈر مولانا حسرت موہانی اور شیخ مشیر حسین قدوائی سامنے آکر اسی طرح کا وعدہ کریں اور اعلان کریں کہ "ان کے فریق کی طرف سے نقض امن نہ ہوگا" دونوں صاحب اس پر صاف نکل گئے، اور یہ عجیب قسم کا احساس ذمہ داری تھا لگے کہنے کہ "ہم کوئی ذمہ داری نہیں لیتے" مولوی ظفر الملک نے جب یہ قبول کرالیا تو پھر پکار کر کہا کہ "دیکھ لیجئے، ایک فریق فساد پر آمادہ ہوکر آیا ہے، اور اس کے لیڈر قیام امن کی طرف سے کانوں پر ہاتھ دھر رہے ہیں، تو اب میں اعلان کرتا ہوں کہ جلسہ ملتوی کیا جاتا ہے، آپ لوگ پرامن طور پر منتشر ہو جائیں"

جلسہ برخاست ہوگیا، لیکن پبلک نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ پچھلے جلسہ کی طرح ابکی بھی فساد پر تل کر کون آیا تھا۔ اور عامۂ مسلمین کے دلوں میں شورش پسندوں کی طرف سے بیزاری و نفرت کی جو لہر دوڑ گئی، اس کا دور کرنا اب کسی کے بس کی بات نہ رہی۔ "پاسبانۂ خدمت حرمین کا دوبارہ مظاہرہ اب شہر لکھنؤ میں ممکن نہ رہا۔

باب (۴۵)

۱۹۲۵ء
سنہ (۱۵)

(ذاتیات و قومیات۔ مقامِ عدل)

محمد علی کی فراست غضب کی تھی اور کام کرنے کا جذبہ بے پناہ۔ آج کا رنگ دیکھ کر سمجھ گئے کہ اصلی ضد اور کد جو کچھ ہے وہ مقامی کارکنوں سے ہے، نہ کہ خود ان سے۔ شوکت صاحب کی قوت عمل کچھ ان سے بھی بڑھ کر تیز تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے یہ فیصلہ کر لیا کہ جلسہ کل ہی پھر ہو، اور ابکی جلسہ کے طلب کرنے والے لکھنؤ کے کارکنانِ خلافت نہیں، بلکہ خود مولانا شوکت علی ہوں، اور صدر جلسہ بھی اپنی پارٹی کا کوئی شخص نہ بنایا جائے جو دوسروں کی نظر میں معتوب و بدنام ہو، بلکہ کوئی غیر جانبدار شخص ہو۔ میں جلسہ کے بعد جلسہ گاہ کے باہر اور امین الدولہ پارک میں لوگوں سے ملنے ملانے، پبلک کے خیالات و تاثرات کا اندازہ کرنے کو ٹھہر گیا تھا۔ ——— میری چھوٹی موٹی "لیڈری" پر کہیں غالب میری "ایڈیٹری" اور صحافت رہتی تھی ——— کیا خبر تھی کہ خلیق صاحب کے ہاں آناً فاناً یہ فیصلے ہو جائیں گے۔ بعد مغرب دن بھر کا تھکا ماندہ سیدھا اپنے گھر جا رہا تھا کہ راستہ میں محض اتفاق سے ایک صاحب مطبع مل گئے۔ کل کے جلسہ کا اشتہار چھاپنے بھاگا بھاگ چلے جا رہے تھے، ان سے مسودہ لے کر پڑھا۔ مقام جلسہ وہی باغ امین الدولہ میں ممتاز حسین بیرسٹر مرحوم کا للق و دق مکان۔ بالکل ٹھیک، داعی جلسہ مولانا شوکت علی، یہ بھی ہر طرح مناسب، لیکن صدر جلسہ؟ حیرت کی آنکھوں سے دیکھا، اور استعجاب کی عینک

سے بڑھا کہ یہ گمنام! اور یہ انتخاب بھی گویا ایسا یقینی بلکہ الہامی کہ خود اس صدر کی منظوری اور اس سے پوچھ گچھ کی بھی کچھ ضرورت نہیں! شوکت صاحب کے احکام و فرامین ایسے ہی نادری ہوا کرتے تھے۔

یہ گمنام، گمنام ہی تھا، اور یہ سچ ہے کہ خلیق صاحب یا ظفر الملک صاحب کا سا "بدنام" نہ تھا۔ تاہم کہاں اتنے اہم جلسہ کی صدارت کا بارگراں اور کہاں اپنا دوشِ ناتواں! وہ تو کہیے کہ بڑی خیریت ہوئی کہ خبر اشتہار چھپنے سے قبل ہی ہوگئی، ورنہ عین وقت پر تو کچھ بھی بنائے نہ بن پڑتی۔ جوں توں ان صاحب مطبع کو روکا کہ یہ اشتہار فی الفور نہ چھاپ دیجیے گا، اور دوڑا ہوا شوکت صاحب کے پاس پہنچا کہ "ایسا غضب نہ کیجیے، ایک ادنیٰ سپاہی کو دفعۃً سالار لشکر کے مرتبہ پر تو نہ پہنچا دیجیے، خدمت ہی لینا ہے تو کوئی چھوٹی موٹی ڈیوٹی لگا دیجیے، انشاء اللہ اس سے سرتابی نہ ہوگی"۔ بارے شوکت صاحب کو رحم آگیا۔ حکم ہوا، کوئی اور نام پیش کرو۔ سید ظہور احمد ایڈوکیٹ، لکھنؤ کے ایک بڑے پرانے قومی کارکن تھے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری بھی رہ چکے تھے، ان کا نام معاً ذہن میں آگیا۔ پیش ہوا اور شوکت صاحب کی بارگاہ میں منظور ہوگیا۔ غرض بات کی بات میں دوسری شام کا جلسہ طے پاگیا، اور اشتہارات رات ہی چھپ چھپا گئے۔

۹ر نومبر کی صبح ہوئی، اور راجہ نواب علی خان مع مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کے ـــــ ان راجہ صاحب کی افسرانہ اور خودمختارانہ حیثیت اور ان مولانا کی دبی ہوئی اور ماتحتانہ ہیئت اس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی[1] ـــــ علی برادران سے ملنے خلیق صاحب کی کوٹھی پر آئے۔ خلاصۂ گفتگو یہ تھا کہ "ہمیں اختلاف آپ سے نہیں۔ ہم تو صرف یہ دکھانا چاہتے تھے کہ آپ کے یہ لکھنوی دوست ہم لوگوں کو نکال کر لکھنؤ میں جلسہ نہیں کرسکتے۔ اب جلسہ مولانا شوکت علی صاحب

[1] بہ قول شخصے ع غیر واحد بزم میں مختار بنے بیٹھے ہیں :: ہم الگ چور گنہگار بنے بیٹھے ہیں۔

طلب کر رہے ہیں، وہ شوق سے کریں، ہم اس میں خلل انداز نہ ہوں گے، بلکہ وہ جلسہ تو بعد مغرب ہے۔ ہم اپنا ایک جلسہ وکٹوریہ پارک میں بعد ظہر کیے دیتے ہیں۔ آپ وہاں اگر تقریر فرمائیں۔ ہم سب آپ کی تقریر کو سنیں گے۔" شوکت صاحب جواب میں بولے "آپ لوگوں کو میرا معمول تو معلوم ہے۔ میں مخالفین کے جلسہ میں جاتا ہی نہیں، اس سے بدمزگی اور بڑھتی ہے۔" محمد علی نے لقمہ دیا "مگر میرا معمول نہیں۔ میں تو مخالفین ہی کے جلسہ میں شوق سے جاتا ہوں کہ مخالفین کے درمیان تبلیغ کروں۔ یہ عین سنت رسول ہے۔ حضورؐ اپنا پیام ابوجہل کو سناتے تھے، ابوبکرؓ کو اس کی حاجت نہ تھی ——— کیا ظرف تھا "خود بین و خود پرست" محمد علی کا! محمد علی نے معتقدین سے واہ واہ حاصل کرنے والی تقریر میرے علم میں تو کبھی کی ہی نہیں۔ ولولہ انھیں جب پیدا ہوتا تو منکروں پر تبلیغ کا، گمراہوں کو راہ راست پر لانے ہی کا ہوتا۔ اور اپنے حق پر ہونے کا اس درجہ اعتماد و وثوق رہتا تھا کہ مخالفین کے ہجوم و کثرت سے کبھی گھبرائے ہی نہیں۔ کہا کرتے تھے کہ پبلک سے ڈرنا کیا معنی جس کے دل میں پبلک کا خوف بیٹھا ہوا ہے اور جو پبلک سے بدگمان ہے، اس کی جمہوریت جھوٹی جمہوریت ہے، اور وہ لیڈری کا کسی طرح اہل نہیں۔

ادھر وہ لوگ اٹھ کر گئے، ادھر محمد علی پر لے دے ہونے لگی، خود اپنی پارٹی والوں کی طرف سے سب سے زیادہ برسنا خلیق صاحب نے شروع کیا کہ "ان لوگوں کے جلسہ میں آپ کا جانا ہماری شدید توہین کرنا ہے" ——— محمد علی بہت بڑی پارٹی اپنے ساتھ رکھنے کے باوجود بھی اکیلے ہی تھے! وہ جس بلند سطح پر تھے وہ نہ مخالفین کی سمجھ میں آتی نہ موافقین کی۔ گھوم پھر کے سوال ان سب کی نظر میں وہی ذاتی توہین و تحقیر کا تھا۔ محمد علی لاکھ لاکھ اپنے زاویہ نظر کی توضیح کر رہے ہیں، پارٹی والے کب سمجھنے پر آمادہ تھے۔ اتنے میں خبر معلوم ہوئی کہ راجہ نواب علی خاں صاحب نے اعلان

جلسۂ عام کا کیا ہے۔ مفر کا یہ موقع قدرت نے محمد علی کو دیدیا۔ محمد علی نے خط لکھ بھیجا کہ "میرا وعدہ آپ کے جلسہ ہیں، مخالفین کے جلسہ ہیں، خدام الحرمین کے جلسہ میں آنے کا تھا۔ آپ نے اسے جلسۂ عام بنا دیا۔ میں آپ کے طلب کیے ہوئے جلسۂ عام میں آنے سے معذور ہوں" ——— چلیے بڑی خیر ہوگئی۔ خلیق صاحب اور ان کی پارٹی کے آنسو بجھ گئے، اور بات رہ گئی۔

صبح کا وقت ہے، اور غالباً وہی صبح۔ میں خلیق صاحب کے یہاں بیٹھا ہوا ہوں کہ بالاخانہ پر ایک فرنگی محلی صاحبزادہ آئے، اور ہاتھ میں ایک روزنامچہ کے اوراق لیے ہوئے۔ صاحبزادہ خود بھی اپنے خاندان سے باغی اور مولانا عبدالباری کے شدید مخالف، اور جن مرحوم بزرگ کی آخر عمر کا روزنامچہ لائے ہیں، وہ بھی اس زمانہ میں مولانا کے شدید مخالف ہو چکے تھے۔ روزنامچہ کے سفینہ میں وہی سب کچھ درج تھا، جو گھر کے بھیدی" کے سینہ میں خانگی رنجشوں اور عداوتوں کے بعد بھرا رہا کرتا ہے۔ اور پھر روزنامچہ کی نقل وقل نہیں، بجنسہ روزنامچہ۔ اُن مرحوم کے دست خاص کا لکھا ہوا۔ نعمت غیر مترقبہ اس سے بڑھ کر اور کیا ہاتھ آسکتی تھی؟ وہ صاحبزادہ چاہتے تو منہ مانگے دام بھی اس پارٹی والوں سے وصول کر لیتے۔ مخالفوں کے سردار کی مخالفت کے لیے اس سے بہتر مصالحہ اور کہاں سے ہاتھ لگ سکتا تھا! کوئی ایک آدھ حربہ نہیں پورے کا پورا میگزین ہاتھ آرہا تھا۔ کون حریف اس موقع کو چھوڑتا؟ دنیا میں جنگ اور مناظرہ اور پارٹی بازی کے وقت جو ذہنیت ساری دنیا کی ہو جاتی ہے، اس معیار سے دیکھیے تو کون اتنے بڑے شکار کو ہاتھ سے جانے دیتا؟ بڑے بڑے لیڈر اور اڈیٹر، اور اچھے اچھے مولوی، اور مشائخ ایسے موقع پر کیا کیا کرتے ہیں! لگ لپک لپک بڑھے، اور لگے اُن صاحبزادہ کو حلقہ میں لیکر، مزہ لے لے کر، روزنامچہ کو پڑھنے۔ کوئی بیٹھا اور کوئی کھڑے ہی کھڑے ——— سارے مجمع میں صرف ایک شخص ایسا تھا جو مجمع سے ہٹا ہوا،

پہلے تو اس "تماشہ" کو دور سے دیکھتا رہا۔ پھر اٹھا، قریب آیا۔ اور شوق اور مسرت کے بجائے ناگواری کے لہجہ میں بولا "یہ کیا واہیات ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے قومی معاملات میں ہے، ذاتیات اور خانگی نزاعات کی راہ نہیں کھل گئی ہے۔"

اس شخص کو آپ نے پہچانا؟ یہ محمد علی تھا۔ وہی محمد علی جس کے غصہ ور و زود اشتعال ہونے، جنگجو و جنگ پسند ہونے کی داستانیں اور حکایتیں خدا جانے آپ کتنی سن چکے ہوں گے! انسان کا اصلی ظرف، مخالفت اور شدید مخالفت ہی کے وقت کھلتا ہے۔ جب تک دوستی و موافقت ہو، ہر عیب ہنر ہے۔ ادھر مخالفت شروع ہوئی، اُدھر ہر ہنر عیب بن گیا۔ اور پھر ہمارے اخبار نویس تو شدید مخالفت کے بغیر بھی ایسی ایسی خانگی دستاویزوں کی ٹوہ ہی میں رہا کرتے ہیں۔ انھیں تو خدا ایسے موقع دے! اپنی مخالفت کا کمال ہی اسے سمجھتے ہیں کہ آج اسے ننگا کر دیا، کل اس کی پگڑی اچھال دی، پرسوں تیری اور میری رسوائیاں مزے لے لے کر چھاپ ڈالیں۔

باب (۴۶)

سنہ ۱۹۲۵ء

(ڈائری نویس پر ڈانٹ ۔ عالی ظرف محمد علی)

"فرنگی محل کا کچا چٹھا" دوسروں کے علاوہ اس ڈائری نویس ہی کی سازش سے ہزاروں کی تعداد میں طبع ہو کر گھر گھر شائع ہو رہا ہے ۔ باہر کے اکثر اخبارات میں نکل چکا ہے ۔ لیکن خود محمد علی کے اخبار ہمدرد میں ابتک نہیں نکلا ۔ خیر، لکھنؤ کا پریس تو پنچ ہاتھ میں تھا نہیں، اس کی طرف تو صبر تھا، لیکن یہ ہمدرد میں نہ نکلنے کے کیا معنی؟ کہیں اور چھپتا نہ چھپتا، ہمدرد میں تو اسے سب سے پہلے نکلنا تھا ۔ عارف صاحب (ہمدرد کے انچارج ایڈیٹر) لکھنؤ میں محمد علی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں ۔ صبح کوئی ۱۰، ۱۱ کا وقت ہو گا کہ خلیق صاحب کی کوٹھی پر "چھٹے" نویس صاحب ملے ۔ فریاد و داد خواہی کے لہجہ میں تندی سے بولے کہ ہمدرد میں چھپنے کے لیے میں نے عارف صاحب کو دیا تھا ۔ عارف صاحب نے لکھا کہ مولانا کی اجازت لے لوں ۔ مولانا نے اجازت نہ دی ۔ اب آپ کہیے" میں نے دل میں کہا، یہ نہ چھپنے کی خوب رہی ۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ جنگ میں غنیم کے گولے تو ہمارے سروں پہ آ کر دھڑا دھڑ گر رہے ہیں، اور ہم ہیں کہ اپنی سب سے بڑی توپ کے دہانے پر مہر لگائے ہوئے ہیں! ــــــــــ عوام کی نظر میں یہ ساری جنگ بجز فرنگی محل اور محمد علی کی جنگ کے اور تھی کیا؟ اور "خواص" اس باب میں کب "عوام" سے ممتاز تھے؟

جی کڑا کر کے محمد علی سے عرض کی۔ کہنے کی دیر تھی کہ ایک زبردست ڈانٹ پڑی، وہ بھی تنہائی میں نہیں، پارٹی والوں کے بھرے مجمع میں! گرجتی ہوئی آواز میں اس قسم کے فقرے ہوا میں گونجے "ہرگز نہیں چھپ سکتا"۔ "میرے اخبار میں اور ایسی لغو چیزیں"۔ "یہ ہرگز صحیح اور شریفانہ صحافت نہیں"۔ "یہ طریقے چندنامنی ایڈیٹر لیڈر کو مبارک ہوں"۔ "یہ آپ نے چندنامنی کا طریقہ کہاں سے سیکھ لیا"۔ یہ کہا اور "چھٹا" میرے ہاتھ سے لے سب کے سامنے پرزہ پرزہ کر ڈالا! ——— میں لاکھ معتقد اور شیدائی سہی، بہرحال ایک زندہ نفس رکھتا تھا۔ اور نفس ایک مجمع کے سامنے اپنی خواری کب برداشت کر سکتا ہے؟ اس توہین کی تاب نہ آئی۔ لیکن کر تا کیا، دل ہی دل میں جھنجھلاتا اور غصہ کرتا رہا کہ محمد علی کا دوست بھی خراب اور دشمن تو خراب ہی ہے۔ یہی مزاج ہے، جبھی تو کوئی ان کا دوست باقی نہیں رہا۔ یہاں تو ان کے واسطے مٹے جا رہے ہیں، اور یہ ہیں کہ نہ دوسرے کی عزت کا خیال کریں نہ جذبات کا۔

کچھ دیر روٹھا ہوا ان سے الگ بیٹھا رہا۔ اتنے میں کھانے کا وقت آگیا۔ سب اٹھے، میں چپ بیٹھا رہا۔ خود ہی بولے "اٹھو، کھانا بچھ گیا"۔ میں نے کہا "مجھے بھوک نہیں"۔ اٹھ کر پاس آئے۔ گلے سے لپٹا لیا، اور بولے "واہ بس اتنے میں خفا ہو گئے"۔ لوٹے میں پانی لے کر کھڑے ہو گئے کہ "تو میں خود ہاتھ دھلاتا ہوں۔ تم نہ کھاؤ گے تو میں بھی نہ کھاؤں گا"۔ طبیعت حجزبز تو ہوئی، لیکن پھر وہی کہ آخر کرتا کیا۔ اپنی ہار ماننی ہی پڑی۔ ——— کوئی ڈائری خواں کہیں یہ نہ فرمانے لگیں ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات میں رکھا کیا ہے۔ لیکن یہی روزمرہ کے واقعات ہی تو ہر شخصیت کے ناپنے کا اصل پیمانہ ہوتے ہیں۔ سیرت پر، کردار پر، باطن پر، سرشت وجبلت پر روشنی اگر ان واقعات سے بھی نہ پڑے گی تو آخر اور کہاں سے واقعات لائے جائیں گے؟

۹ر کی شام خدا خدا کرکے آئی۔ جلسہ گاہ پر سارے رضاکاروں کا پہرہ بہت قبل سے تھا۔ لاٹھیاں اور چھڑیاں سب سے باہر رکھوالی جاتی تھیں۔ آنے والوں میں موافقین ہی اکیلے نہ تھے، مخالفین بھی اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ بعد مغرب مجمع خوب کھچا کھچ ہوگیا، اور جلسہ کی کارروائی امن و اطمینان سے شروع ہوئی۔ پہلے ایک گھنٹہ کے قریب مولانا شوکت علی بولے۔ اور پھر کوئی ڈیڑھ پونے دو گھنٹہ محمد علی۔ تقریر تھی کیا؟ کیا اپنے اوپر جو مسلسل دلآزار حملے دو ڈھائی مہینوں سے جاری تھے، ان کا کوئی جواب؟ حریفوں پر کوئی جوابی حملہ؟ قبہ نوازی کی تردید میں، قبہ شکنی کی حمایت؟ ابن سعود کے مناقب و فضائل؟ "وہابیت" کی حوصلہ افزائی؟ فرنگی محل پر چوٹیں؟ لوگ کہتے، اور صحیح کہتے ہیں کہ محمد علی جذبات کے پتلے تھے۔ لیکن وہ محض جذباتی ہرگز ہرگز نہ تھے۔ عقلی و استدلالی بھی اسی قدر تھے، جتنے جذباتی۔ جب جذبات کا دریا موج زن ہوتا تو بیشک سب کچھ اپنے ساتھ بہالے جاتا لیکن جب استدلال پر آتے تو منطقی گرفتیں وہ رنگ دکھاتیں کہ اچھے اچھے وکیلوں اور بیرسٹروں کو نیچا دیکھنا پڑتا ——— آج کی تقریر تمام تر ٹھوس، مدلل، سنجیدہ و معقول تھی، گو خشک تو ان کی کوئی تقریر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ بس جمعیۃ خلافت اور مسئلہ حجاز میں اس کی روش و مسلک کی تائید میں ایک مفصل و مکمل بیان تھا۔ شروع سے ایک ایک واقعہ گنا کر، اس کے جزئیات کی تفصیل میں جا کر حاضرین سے اس قسم کے سوالات کرتے جاتے کہ اب بتلائیے واقعات حجاز پر پردہ کون ڈالنا چاہتا ہے، آیا خلافت کمیٹی جس نے مدتوں قبل دسمبر ۲۴ء ہی میں اپنا خاص وفد تحقیقِ حال کے لیے روانہ کر دیا تھا، یا شریف علی ابن حسین جس نے جدہ سے آگے بھی اس وفد کو نہ بڑھنے دیا؟ اسی طرح ایک ایک جز کو دہرا کر آخر میں پوچھا کہ کوئی ایک بھی بات ایسی بتائیے جو خلافت کمیٹی کے کرنے کی تھی، اور وہ اس سے قاصر رہی، یا ایک بھی ایسی بات جو شرعاً کرنا بیجا ہوتی، اور اس نے کر ڈالی؟ ——— سارے مجمع پر کامل سکوت چھایا ہوا۔ فرنگی محلی حاضرین جلسہ بھی سب اس

پر احترام و پر عظمت سکوت میں شریک۔ کسی کو کوئی تلخی نہ اپنے عقائد کے خلاف محسوس ہوئی نہ اپنی افتاد کے خلاف، نہ اپنے خاندان کے خلافت۔ آخر میں جناب حسرت موہانی کھڑے ہوئے اور فرمایا "مجھے دونوں بھائیوں کی تقریر سے کامل اتفاق ہے"۔

یہ تھی اس "وہابی" اور "قبہ شکن" محمد علی کی وہ ہولناک وہیب تقریر، جسے لکھنؤ کے ذات شریف "شریفی" حضرات خدا معلوم کن کن غیر شریفانہ طریقوں سے لکھنؤ میں روک رہے تھے! محمد علی اتنا وقت بھی کن مشکلوں سے نکال کر آئے تھے، دوسرے ہی دن دہلی واپس ہوگئے۔ لکھنؤ میں جلسے اس کے بعد بھی برابر دو دن اور ہوتے رہے۔ فضا ہموار ہو ہی چکی تھی۔ اب تقریر کرنا کیا دشوار تھا۔ مولانا شوکت علی اور جمعیۃ العلماء کے دونوں مولوی صاحبان کی تقریریں ہوتی رہیں، محمد علی کے ڈائری نویس کو ان سے تعلق نہیں۔

بڑا فرق محمد علی اور ہم لوگوں میں یہ تھا کہ ہماری نظریں چھوٹے چھوٹے مسائل تک محدود ان ہی میں الجھ کر رہ جاتیں، اور ان ہی کو سب کچھ سمجھنے لگتیں۔ ان ہی جزئیات پر ہمارے ہاں پارٹیاں اور پھر پارٹیوں کے اندر پارٹیاں بن جاتیں، محمد علی کی نظر کہیں زیادہ عمیق اور کہیں زیادہ بلند، ان جزئیات سے بالاتر رہتی، یہی سبب ہے کہ وہ نہ خود کوئی پارٹی بنا سکے اور نہ کسی بنی بنائی پارٹی میں عرصہ تک نباہ سکے۔ ہر شخص انھیں اپنی پارٹی میں کھینچنے کا آرزومند۔ ہر پارٹی اس کو پکڑ کر اپنے میں ملا لینے پر حریص۔ لیکن وہ خود ہر پارٹی سے، اور قومی معاملات میں ہر دوستی سے بلند تر محض حق کا طالب اور حق کا ساتھی تھا۔ جس چیز کو اس نے حق سمجھ لیا، بس اسے دانت سے پکڑ لیا، پھر چاہے اس میں سب ہی کا ساتھ چھوڑ دینا پڑے۔ حق کے معاملہ میں پروا نہ کسی دوست کی نہ عزیز کی، نہ بزرگ کی نہ خورد کی۔ نہ اپنے کسی محسن کی، نہ اپنے مرشد کی۔ لیکن حدود کا لحاظ اس کے

باوجود بھی ——— اب خود اسی موقع سے بڑھ کر، اور کون سی جگہ لغزش قدم کی ہوسکتی تھی۔ بڑے بڑے متین اور ضبط رکھنے والے بھی ایسے موقعوں پہ بے قابو ہو جاتے ہیں۔ یہ ظرف محمد علی ہی کا تھا کہ اس حال میں بھی حدود کو ملحوظ رکھا، اور اپنی ذات سے ایک بات بھی ایسی نہ ہونے دی جس پر ان وقتی جذبات کے ٹھنڈے پڑ جانے پر اور برسوں کی مدت گذر جانے کے بعد آج ان کے کسی نیازمند کو آنکھیں نیچی کرنی پڑیں ——— لکھنؤ کا معرکۃ الآرا جلسہ ختم ہوگیا لیکن وہ قضیۂ اختلاف کہاں ختم ہوا، مسلمانوں کی قسمت ایسی کہاں تھی۔ ابھی تو اس قضیہ کو ہفتوں نہیں، مہینوں چلنا تھا، بلکہ ایک معنی میں تو برسوں۔ اور ایک بڑے محترم بزرگ اور لیڈر کی جان بھی اسی قضیہ کی نذر ہونی تھی!

دلی اس کے بعد اور اس کے قبل اس زمانہ میں جب بھی جانا ہوا، یہی قصے اور قضیے وہاں بھی پھیلے ہوئے پایا۔ ایک جمعہ میں محمد علی کی تقریر بھی اسی موضوع پہ جامع مسجد میں سنی حسب معمول شگفتہ و دلآویز، موثر، مدلل۔ تقریر کا ایک خاص اسلوب (ٹیکنیک) محمد علی نے یہ ایجاد کیا تھا کہ مخاطبین سے برابر سوال پر سوال کرتے جاتے اور ان سے ہر سوال کا جواب لیتے جاتے ——— اسی جلسہ میں کسی نے دور بیٹھے ہوئے غصہ سے پکار کر کہا تھا کہ یہ بھی خبر ہے اس بحث میں شامی[1] نے کیا لکھا ہے۔ محمد علی نے غصہ کے جواب میں مسکرا کر کہا کہ "مجھے نہ شامی سے بحث نہ نجدی سے میرے لیے تو کتاب اللہ کافی ہے، اور اس کے بعد سنت رسول۔ جس دن مجھ پر ان نصوص سے قبوں اور پختہ قبروں کی حرمت ثابت ہوگئی، میں گلابی وہابی نہیں پورا وہابی بن جاؤں گا اور اپنے ہاتھ میں ان کے کھودنے اور گرانے کے لیے پھاوڑا لے لوں گا"۔ اسی تقریر یا کسی اور تقریر میں (کہ وہ بھی بہرحال جامع مسجد ہی کی تھی) اس نامہ سیاہ کا تعارف کرایا کہ یہ سچ کے ایڈیٹر ہیں۔ جن کا مقولہ ہے الحق مُرٌّ (سچی بات کڑوی ہی ہوتی ہے) اور ان کے ساتھ ایک دوسرے ایڈیٹر بھی ہیں مولوی ظفر الملک علوی، ان کا مقولہ ہے المُرّ حقٌّ (کڑوی بات سچی ہی ہوتی ہے)

[1] فقہ حنفی کی مشہور کتاب درمختار کی مستند و ضخیم شرح رد المحتار، علامہ ابن عابدین مصری کے قلم سے، عرف عام میں اس کا لقب شامی یا فتاوائے شامیہ ہے۔

باب (۴۷)

۱۹۲۵ء
سنہ (۱۷)

(نئی اودھ خلافت کمیٹی)

نومبر پورا گزر چکا۔ اور دسمبر کا بھی بڑا حصہ ختم ہو گیا۔ قلم اور زبان کی جنگ ابھی اسی تیزی اور تندی سے قائم۔ ابھی لاہور سے ٹیلیفون محمد علی کے پاس چلا آ رہا ہے کہ فوراً آ جائیے اور سب کام چھوڑ کر آئیے، یہاں کے جلسہ میں قبہ نوازوں کے مقابلہ میں آکر تقریر کیجئے۔ ابھی ایسی ہی طلبی پٹنہ سے تار پر ہو رہی ہے۔ ایک سر و ہزار سودا۔ یک انار و صد بیمار۔ ایک وقت میں کہاں کہاں پہنچے۔ قوم نے جیسے طے کر لیا تھا کہ کلکتہ ہو یا بمبئی، لکھنؤ ہو یا دہلی، ہر درد کے درمان محمد علی ہی ہیں، کہیں بھی کوئی ضرورت پیش آئے، اور وہی دوڑے ہوئے پہنچیں ——— ۲۳ دسمبر ۲۵ء۔ شام کا وقت ہے۔ کانپور میں کانگریس اور خلافت کانفرنس دونوں کے سالانہ اجلاس ہو رہے ہیں۔ دونوں کیمپ ملا کر ایک پورا نیا شہر آباد ہو گیا ہے۔ ہزارہا ہزار کا مجمع، خیموں کا یہاں سے وہاں تک ایک جنگل ہی جنگل۔ ایک پختہ عمارت میں نئے صدر خلافت کمیٹی مولانا ابو الکلام آزاد اور بعض دوسرے اکابر ٹھہرائے گئے ہیں۔ اسی کے ایک کمرہ میں مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ ہو رہا ہے، اور سب سے زیادہ معرکۃ الآرا مسئلہ مجلس کے سامنے زور شور سے یہ چھڑا ہوا ہے کہ صوبہ اودھ کی دو خلافت کمیٹیوں میں سے جائز اور مستند کس کمیٹی کو ٹھہرایا جائے، اور کس کے نمائندے مرکزی مجلس میں قبول کئے جائیں

لیکن یہ دو صوبہ کمیٹیاں کیسی ؟

فرنگی محل کی سرگرمیاں "پاسبانہ" "خدمت حرمین کے مظاہرہ کے بعد کچھ ختم تھوڑے ہی ہوگئی تھیں۔ سعودی شریفی جنگ اسی ہماہمی کے ساتھ ہندوستان میں جاری تھی، اور قبہ نوازی و قبہ شکنی دونوں کے مورچے اسی شدت وحدت کے ساتھ گولہ باری اور آتش افشانی میں مصروف۔ تحریریں، تقریریں، مناظرے، اور مناظرہ کے چیلنج، پوسٹر، اشتہارات، پمفلٹ، تردیدی پمفلٹ، جواب و جواب الجواب کا سلسلہ اسی شد ومد سے قائم۔ صوبۂ اودھ کی جو صوبہ کمیٹی شروع سے چلی آرہی تھی، اس کے صدر و ناظم دونوں فرنگی محلی ہی تھے۔ اور دونوں اپنے مسلک کی اشاعت میں جوش کے ساتھ لگے ہوئے۔ اب یہ عجب ستم ظریفی تھی کہ اُدھر آل انڈیا مرکزی جمعیت خلافت تو سلطان ابن سعود کی حامی و ہمدرد، اور اودھر اس کی اس صوبائی شاخ کے ذمہ دار ارکان سلطان کی مخالفت میں سرگرم، اور خود جمعیت مرکزی سے بغاوت پر کمربستہ! مولوی ظفر الملک صاحب ایسے موقع پر کب چوک جانے والے تھے۔ قواعد و ضوابط سے پوری طرح لیس اور آئین و قانون سے مسلح، انھوں نے نومبر ہی مین جھٹ ایک دوسری اودھ خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھ دی تھی، اور اخبارات میں اس کا اعلان قبل سے کراکر، بارہ بنکی مین اس کی ضابطہ سے تشکیل بھی کردی تھی۔ روح رواں تو وہ خود اور چودھری خلیق الزمان تھے۔ نام کے لیے صدارت اس ڈائری نویس کے ذمہ ڈال دی گئی۔ ادھر وہ قدیم خلافت کمیٹی بھی بہرحال موجود تھی۔ مرکزی کمیٹی کے سامنے سب سے پہلا اور اہم مسئلہ یہی پیش ہوا کہ صوبۂ اودھ کی ذمہ دار اور حقیقی کمیٹی وہ کس کو تسلیم کرے

مولانا شوکت علی نے بہ حیثیت ناظم مجلس مرکزی، تحریک پیش کی کہ قدیم اودھ کمیٹی کا الحاق توڑکر مرکزی سے الحاق جدید اودھ کمیٹی کا منظور کیا جائے۔ بحث شروع ہوئی۔ ہم لوگ یعنی جدید کمیٹی

کے ارکان ابھی کہاں بار پا سکتے تھے، ایک بغلی کمرہ میں بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ جلسہ میں قدیم کمیٹی کے صدر صاحب اور ناظم صاحب، بس دو صاحب یہ، اور تیسرے حسرت موہانی اور چوتھے ایک صاحب صوبہ متوسط کے (کران دونوں صاحبوں کا فرنگی محل سے رشتۂ ارادت بھی تھا) بس ان چار صاحبوں کو چھوڑ کر جلسہ کا جلسہ شوکت صاحب کی تائید میں تھا۔ ڈاکٹر سید محمود، مولوی عبد القادر قصوری، "غازی" عبد الرحمن امرتسری مفتی کفایت اللہ صاحب، سیٹھ یعقوب حسن مدراسی، مولانا داؤد غزنوی امرتسری، آصف علی صاحب بیرسٹر دہلوی، قمر احمد صاحب علیگ (ایڈیٹر "خلافت") عارف صاحب ہنسوی وغیرہ بہ کثرت حضرات نے اپنی تقریروں میں یہی کہا ـــــــ اب آج ۴۸ئہ و ۴۹ئہ میں کوئی کیسے بتائے اور سمجھائے کہ ۲۵ئہ میں ان ناموں کا کیا وزن تھا اور کتنی اہمیت تھی؟ ـــــــ اور مولوی ظفر الملک اور چودھری خلیق الزماں نے جدید کمیٹی کے نمائندوں کی حیثیت سے جلسہ کے سامنے جا کر موثر و مدلل بیانات دیے ـــــــ جلسہ کی کارروائی دلچسپ سہی لیکن جو ڈائری صرف محمد علی سے متعلق ہے وہ اس تفصیل کی متحمل کہاں سے ہو سکتی ہے؟

سب کو اشتیاق و انتظار محمد علی کی تقریر کا۔ توقع کیا معنی یقین تھا کہ محمد علی کی تقریر بڑی گرما گرم اور پرزور ہوگی، اور قدیم کمیٹی والوں کا تار تار الگ کر کے رکھ دے گی۔ لیجئے، تقریر شروع ہوئی، اور سب کے کان لگ گئے کہ مخالفین میں سے ایک ایک کی قلعی کھل کر رہتی ہے۔ لیکن یہ کیا؟ دو منٹ، چار منٹ، چار منٹ، پانچ منٹ تقریر کے ہو گئے، اور نہ آتش بیانی نہ شعلہ افشانی۔ نہ اس پر اصرار کہ ان "دشمنوں" کو فوراً نکال دیا جائے، نہ اس کا مطالبہ کہ ان "دوستوں" کو فوراً لے لیا جائے ایک معتدل سی تقریر، جذبات کو بھڑکانے کے بجائے دھیمی کرنے والی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "قدیم کمیٹی کا الحاق توڑنا لازمی نہیں، اگر کوئی صورت اصلاح حال کی نکل آئے، تو ان لوگوں کی ممبری بھی بدستور قائم رہ سکتی ہے۔" ہمارے فریق کے اہل غلو (اور غلو سے کس فریق کا کون فرد خالی تھا)

ونگ وحیران کر دیجیے! جن کے واسطے یہ سب کچھ کیا گیا تھا، وہ تو وہی اتنے بجھے ہوئے نکلے ——
اتنے "چست" گواہوں کے ہوتے ہوئے کوئی مدعی اتنا "سست" کہیں کا ہے کو ثابت ہوا ہوگا؟

قدیم کمیٹی کی قسمت کا جو فیصلہ ہونا تھا وہ تو بالآخر ہو کر رہا۔ لیکن محمد علی کے یہ الفاظ اپنے جوشِ صفت میں ہم لوگوں کے دل میں بار بار کھٹکتے رہے کہ "الحاق توڑ دینا صحیح طریق عمل نہیں، آئینی کارروائی یہ تھی کہ ان لوگوں کو خود کمیٹی کے اندر (Out vote) کیا جاتا، یعنی ووٹوں کی اکثریت سے شکست دی جاتی" اس اشتعال و ہیجان کے عالم میں عدل و ضابطہ کو اتنا ملحوظ رکھتے تو ان آنکھوں نے محمد علی ہی کو دیکھا۔ ورنہ دنیا تو اس سے کہیں ہلکے موقع پر بھی، بس ہر ممکن طریقہ سے مخالف کو شکست دیدینا ہی جانتی ہے۔

محمد علی مجلس مرکزی کے سامنے تقریر کر رہے تھے کہ اثنائے تقریر میں کہیں یہ فقرہ ان کی زبان سے نکلا کہ "یہ خلافت کمیٹی کا کام قوم کا کام ہے، ملت کی خدمت ہے۔ کوئی موروثی گدی نشینی نہیں ہے۔ جو لوگ اسکے کام کے لیے تیار و مستعد ہوں، وہی اس میں رہیں۔ باقی جو مادہ فاسد اس میں گھس آیا ہے، اسے خارج ہی ہو جانا چاہیے"۔

یہ فقرہ سننا تھا کہ محمد علی کے ایک مرشد زادہ[1]، قدیم اودھ خلافت کمیٹی کے صدر، تڑپ کر اٹھے، اور سر جلسہ یہ کہتے ہوئے کہ "آپ ہمیں مادہ فاسد کہتے ہیں، ہم آپ کو یکسر باطل سمجھتے ہیں" مع اپنے ایک کھدر پوش متوسل خاندانی کے، جو اکتوبر کے جلسہ لکھنؤ کے توڑنے میں بہت پیش پیش تھے، باہر چلے گئے۔

یہ لکھنؤ نہ تھا، کانپور تھا۔ اور مجمع خاندانی معتقدین کا نہ تھا، جلسہ مرکزی خلافت کا تھا، ارکان

---

[1] ان سے مراد جمال میاں صاحب نہیں، جو اس وقت بالکل بچے تھے۔

کی بہت بڑی تعداد فرنگی محل کی طرف سے بھری بیٹھی تھی۔ کتنوں کے چہرے غصہ سے تمتما اٹھے۔ کتنوں نے چاہا کہ فوراً ایک ملامت کا ووٹ پاس کرادیں، اور یہ تو سب ہی سمجھے کہ اب فرنگی محل کی خیر نہیں، محمد علی کی زبان نشتہا پشت کی خبر لے ڈالے گی ـــــ لیکن ہوا کیا؟ محمد علی کی زبان سے صرف یہ فقرہ تو غصہ کے تیوروں سے ادا ہوا کہ "آپ بچے ہیں، بچے ہیں" اور اس دو حرفی جواب کے بعد تقریر اسی اعتدال و توازن کے ساتھ جوں کی توں جاری! یہ معلوم بھی نہ ہوا کہ کوئی ناگوار و اشتعال انگیز واقعہ پیش بھی آیا ہے۔ محمد علی کے "غصہ کرنے" کے واقعات آپ نے بہت سے سنے ہوں گے، اور وہ صحیح بھی ہوں گے۔ بہتر ہوگا کہ "غصہ سننے" کی بھی اس مثال کو اپنی یادداشت میں ٹانک لیجئے! محمد علی تو خیر واقعی غصہ ور تھے، کوئی حلیم سا حلیم انسان بھی ہوتا تو اس موقع پر کیا کرتا؟ کیا محمد علی سے زیادہ کسی حلم و تحمل کا ثبوت دیتا؟

جلسہ کے بعد اور جلسہ کے باہر جدید و قدیم دونوں خلافت کمیٹیوں کے ارکان میں باہم اکثر زور آزمائی ہوتی رہی۔ اور قدیم کمیٹی چونکہ کمزور تھی، اپنی کمزوری کے نتائج بھی اسے برداشت کرنے پڑے۔ لیکن محمد علی کو ایک بار بھی ان آویزشوں میں الجھتے کم سے کم ان آنکھوں نے تو نہیں دیکھا۔

باب (۴۸)

۱۹۲۵ء

سنہ (۱۸)

(خلافت کانفرنس - مسلم لیگ)

یہ نیازمند کانپور ۲۲ دسمبر کی شام ہی کو پہنچ گیا تھا۔ صوبہ خلافت کمیٹی کا صدر تھا، اور وہ بھی نیا نیا۔ خوب خوب خاطریں ہوئیں، اور بجائے خادم کے مخدوم بنا رہا۔ دوسرے دن صبح محمد علی آگئے۔ چند ہی روز قبل کامریڈ میں ان کے قلم سے ایک بڑا لمبا مضمون، گویا ہندوستان سے ایک انگریز سیویلین کا مکتوب کسی دوسرے سیویلین کے نام جو انگلستان میں ہے، نکلا تھا (اس مضمون کا ذکر اسی ڈائری کے باب ۳۱ میں کامریڈ کے ذیل میں آچکا ہے)۔ یہ مضمون محمد علی کے بہترین مقالات میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ اور یہ تو پہلے ہی عرض ہو چکا ہے کہ محمد علی اصلی اہل قلم انگریزی کے تھے نہ کہ اردو کے۔ ساری مشق ان کی انگریزی انشا پردازی کی تھی۔ زبان اور خیالات دونوں کا پورا لطف بس ان کی انگریزی تحریر پڑھنے میں تھا۔ ملنے کے ساتھ اس مضمون کی میں نے دل کھول کر داد دی۔ محمد علی چاہے اسے تحسین ناشناس ہی سمجھے ہوں، تاہم میری دلدہی کے خیال سے تو بہرحال اپنے کو مسرور و مطمئن ہی ظاہر کیا۔

زنانہ ان کے ہمراہ بھی تھا اور میرے بھی۔ خود جس خیمہ میں ٹھہرے ہوئے تھے، اسی کے متصل ایک خیمہ مجھے بھی مل گیا تھا۔ محمد علی بے حد مشغول تھے۔ کانگریس کی صدارت کو ابھی ایک سال ہی تو

گزرا تھا۔ کانگرس والے بے طرح چھٹے ہوئے تھے۔ اور خلافت کے تو سب ہی کچھ وہ تھے۔ وہی مرتبہ حاصل جو بارات میں نوشہ کو حاصل رہتا ہے۔ اس کے علاوہ خدا معلوم اور کتنی چھوٹی بڑی ہی کانفرنسیں ہو رہی تھیں۔ بہتوں کے کارکن انھیں گھیرے ہوئے۔ خیمہ متصل نہ ہوتا، تو مجھے تو باریابی بھی مشکل سے نصیب ہوتی۔ مگر اس قرب و ہمسائگی نے مشکل آسان کردی۔ ہر وقت کے خلا ملا کا موقع حاصل۔ کانگرس کا اجلاس مسز نائیڈو کی صدارت میں بڑے معرکہ کا اجلاس تھا، ہزارہا کا مجمع۔ میرے پاس کانگرس کے لیے ٹکٹ تو ایک کی جگہ دو موجود تھے، ایک ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے (ڈیلیگیٹ منتخب ہونا دشوار ۲۵ء میں بھی تھا، مگر نہ اس شدت سے دشوار جتنا کہ بعد کو ہو گیا) دوسرا پریس ٹکٹ بحیثیت سچ کے ایڈیٹر کے تھا لیکن ان دو ٹکٹوں کے باوجود ہوا یہ کہ صوبۂ متحدہ کے ڈیلیگیٹوں کیلئے جو جگہ پنڈال میں رکھی گئی تھی، وہ ڈائس سے بہت دور تھی، ایسی کہ وہاں تک مقرر کی آواز پہنچنی مشکل تھی۔ (۲۵ء میں لاؤڈ اسپیکروں کا یہ رواج کہاں تھا؟) اتنی دور بیٹھنے پر طبیعت آمادہ نہ ہوئی۔ رہا پریس ٹکٹ تو پریس رپوٹروں کے لیے جگہ بیشک اچھی تھی، لیکن یہاں تقریباً سب وہی لوگ تھے، جو اپنے اپنے روزناموں کے لیے پنسل یا فاؤنٹین پن ہاتھ میں لیے بیٹھے برابر رپوٹ لے رہے تھے۔ سچ کے ناکارہ ایڈیٹر کو ان کے درمیان خالی ہاتھ بیٹھنے کچھ اچھا معلوم نہ ہوا طبیعت اسی شش پنج میں تھی کہ محمد علی اپنے خیمہ میں آتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ سابق صدر کانگرس تھے، اور اس حیثیت سے متعدد اعزازی ٹکٹ ان کی خدمت میں نذر کیے گئے تھے۔ آتے ہی ایک ٹکٹ بلا میری طلب کے میرے سامنے کر دیا، اور اب میں ڈائس نشین تھا —— "کم خرچ بالانشین" سنا تھا، یہاں "بالانشینی" "کم خرچی" کے ساتھ نہیں، بالکل بلا خرچ، مفت ہاتھ آگئی!

دوستوں کو ساتھ لیے بغیر کسی جلسہ میں، دعوت میں، تماشہ میں، وعظ میں، لکچر میں، تنہا جانا محمد علی کے مذہب میں گویا گناہ تھا۔ اور جس طرح وہ کھانا بغیر دو چار شخصوں کو دسترخوان پر

ساتھ بٹھائے تنہا نہیں کھا سکتے تھے، اسی طرح جس چیز سے بھی انھیں لطف آرہا ہو، اس سے دوستوں کو محروم رکھنا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ اور فرمایش اور تقاضا کا انتظار نہ کرتے، خود دوڑ دوڑ کر بلاتے اور گھسیٹ گھسیٹ کر لاتے ——— جس کا معمول دنیا میں زندگی بھر یہ رہا، کیا وہ جنت میں اپنے دوستوں کو ساتھ لائے بغیر، ان کی پروا کیے بغیر، داخل ہو جانا گوارا کرلے گا؟

خلافت کمیٹی کا ایک وفد جس کے ارکان مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد عرفان اور شعیب قریشی صاحب تھے، آخر اکتوبر میں حجاز روانہ ہوا تھا۔ کانپور میں آخر دسمبر میں خلافت کے جلسے ہو رہے تھے اور عین اس وقت شاید مرکزی کمیٹی کا جلسہ ہو رہا تھا کہ وفد حجاز کا ایک طویل تار موصول ہوا کہ سلطان نجد کا قبضہ مدینہ منورہ پر ہو گیا، اور شریفی فوجیں بھاگ نکلیں۔ یہ خبر ظاہر ہے کہ ہم سب کے لیے کتنی مسرت انگیز تھی، لیکن ساتھ ہی کوئی ایسی اطلاع بھی پہنچی (اتنے روز کے بعد اب تفصیل ذہن میں نہیں کہ کس ذریعہ سے) کہ سلطان نجد خود شاہ حجاز ہو جانا چاہتے ہیں، اور شعیب قریشی اور مولانا عرفان کی مخالفت کے باوجود مولانا ظفر علی خاں سلطان کی ہمنوائی پر آمادہ ہیں۔ سقوط مدینہ کی خبر سے مسرت و شادمانی کی جو لہر دوڑ جانی چاہیے تھی، اسے خبر کے اس جزنے اداسی سے بدل دیا۔ لیکن یہ اداسی زیادہ تر محض محمد علی کی اداسی کا عکس تھی، ورنہ ہم عوام کی سمجھ میں آیا بھی نہیں کہ آخر اس میں حزن و تاسف کی کیا بات ہے۔ تقریباً ہم سب کے سب، ایک آدھ فرد کو مستثنیٰ کرکے، بس اسی قدر چاہتے تھے کہ فتح سلطان کو حاصل ہو اور شریفی حکومت و تسلط کے اعادہ کا امکان باقی نہ رہے۔ سلطان کے عقائد سے اکثر افراد کو اتفاق تھا، فتح سلطانی کی تائید کی اصلی اور قوی بنیاد بھی ہم عقیدگی تھی۔ محمد علی کی افسردگی آج دیکھ کر پہلی بار محسوس ہوا کہ محمد علی جو سلطان کی تائید کر رہے تھے، اس سے مقصود سلطان کی ذات یا ان کے عقائد کی تائید نہ تھی، بلکہ اس کی بنیاد صرف یہ تھی کہ ان کے

خیال میں سلطان ملکیت و شخصیت کی بدعت کو مٹا کر جمہوری و شوریٰ حکومت قائم کرنے والے ہیں۔ اور ارضِ حجاز کی خدمت کا موقع اپنے ساتھ سارے عالمِ اسلامی کو دینے والے ہیں۔ آج وہ کاس توقع کو پہنچ رہا تھا، آج امید یہ ٹوٹ رہی تھی۔ اس کا صدمہ محمد علی کو نہ ہوتا تو اور کس کو ہوتا؟

علی گڈھ کی جوبلی کا بھی عین یہی زمانہ تھا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے اپنی مسلسل علالت وضعف کے باوجود علی گڈھ کالج کی ۵۰ سالہ سالگرہ کا جشن بڑی دھوم دھام سے منانے کا تہیہ کیا تھا، اور وہ جشن اسی زمانہ میں ہو رہا تھا۔ یونیورسٹی کا نووکیشن وغیرہ کے علاوہ مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بھی وہیں تھا۔ محمد علی سے بڑھ کر علی گڈھ کا شیدائی اور کون رہ چکا تھا؟ لیکن ساتھ ہی اس وقت سب سے زیادہ ان ہی کا دل بھی علی گڈھ کی طرف سے ٹوٹا ہوا تھا۔ چند سال قبل کا زمانہ ہوتا تو جوبلی میں وہی سب سے پیش پیش ہوتے۔ اس وقت علی گڈھ کی طرف رخ کرتے ان کا دل دکھتا تھا۔ کالج کے در و دیوار انھیں محبوب تھے۔ خاکِ علی گڈھ کے ذرہ ذرہ سے انھیں شیفتگی تھی۔ گھر کے مالک کی اولاد پر اگر گھر کا دروازہ بند ہو جائے، تو وہ اولاد کیسی تڑپ تڑپ کر رہے گی۔ بس یہی حال محمد علی کا تھا۔ لیکن ادائے فرض کا احساس ان کے ہاں بہرحال ہر شے پر غالب تھا۔ مسلم لیگ پر مختلف دور گزرے ہیں، اس وقت اس پر بڑے بڑے خیرخواہانِ سرکار برطانیہ، فلاں "سر" "نائٹ" اور فلاں "خان بہادر" اور فلاں "سی، آئی۔ ای" قابض تھے، اور وہ اس اجلاس میں مسلمانوں کے نام سے بڑے اہم فیصلے صادر کیے جانے والے تھے۔ اکثروں کا خیال یہ تھا کہ محمد علی اس وقت کانگریس میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ابکی انھیں کہاں فرصت کہ کانگریس چھوڑ چھاڑ کانپور سے علی گڈھ دوڑے آئیں۔ اچھا ہے وہ غائب ہی رہیں، یہاں جو جی چاہے گا پاس کرا لیا جائے گا ——

وقت کے وقت لوگوں نے محمد علی کو توجہ دلائی کہ آپ مسلم لیگ میں نہ شریک ہوئے، تو بڑا غضب ہو جائیگا۔ میں تو جلسۂ خلافت کو ختم کر، اور کانگریس کے بھی دو ایک جلسوں میں شرکت کر کرا، کانپور سے سیدھا علی گڈھ جوبلی کے باقی پروگرام میں شریک ہونے روانہ ہوگیا۔ محمد علی دو ایک وقت بعد خدا جانے کن کن مشکلوں سے اپنا پیچھا چھڑا علی گڈھ پہنچے۔

آدھی رات کا وقت تھا، اور رات آخر دسمبر کی، کڑاکے کی سردی رکھنے والی۔ مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سید محمود، اور اور کئی صاحب ساتھ تھے۔ مشہور بیرسٹر عبد المجید خواجہ کے ہاں میں ٹھہرا ہوا تھا، اور ان کا مکان مہمان سرا بنا ہوا تھا۔ وہیں یہ قافلہ بھی آیا، اور سب کو سوتے سے جگایا۔ سیاسی مجلسوں سے اس ڈائری نویس کو زیادہ دلچسپی کبھی بھی نہیں رہی۔ خلافت کمیٹی کی صورت ایک استثنائی تھی۔ مسلم لیگ کا نہ کبھی ممبر رہا، نہ کسی جلسہ میں تماشائی کی حیثیت ہی سے شریک ہوا۔ محمد علی مع اپنے دو چار "احرار"[1] رفیقوں کے جاتے تھے۔ واپسی پر ان ہی کی زبانی حالات سن لیتا تھا۔ چشم دید منظر صرف ایک ہے۔ جلسہ کے اندر نہیں، جلسہ کے باہر۔ محمد علی، خواجہ صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ رات زیادہ آچکی ہے۔ دوسرے دن جلسہ صبح ہی سے ہے۔ رزولیوشن اسی وقت تیار کر لینے ہیں۔ احرار کی ساری پارٹی کا اصرار ہے کہ فلاں مسئلہ پر کل ایک لمبی تحریک پیش ہو، جس کے لیے ضرورت بھی لمبی تیاری کی تھی۔ محمد علی نے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی صاحب مسودہ تو تیار کریں، پھر کاٹ چھانٹ میں کر لوں گا۔ کمرہ میں خاموشی رہی۔ پھر یہ کہا "اچھا میں بولتا جاتا ہوں کوئی صاحب لکھتے جائیں"۔ کمرہ میں سناٹا اب بھی بدستور چھایا رہا۔ آخر میں بمشکل الہ آباد کے ایک نوجوان بیرسٹر قلم ہاتھ میں لیکر بیٹھے کہ محمد علی کے املاء کیے ہوئے الفاظ لکھتے جائیں۔ اور لوگ تو جا جا کر سو رہے

---

[1] خلافت کمیٹی کے ضعیف، مضمحل ہو جانے کے بعد اس وقت (یعنی ۱۹۲۵ء و ۱۹۲۶ء میں) سیاسیات کے میدان میں فعال جماعت، مسلم لیگ کے مدمقابل "جمعیۃ احرار" ہی کے نام سے زندہ تھی۔ ا

محمد علی غریب نے خدا معلوم کب تک جاگ کر کام ختم کیا ——— یہ نظارہ اپنی نوعیت میں انوکھا نہ تھا۔ کتنے ہی حضرات ایسے تھے جو نام اپنی پارٹی کا چاہتے تھے۔ لیکن کام سارا محمد علی ہی سے لینا چاہتے تھے۔ اور محمد علی کی ذات گویا ایک مشین تھی، جس کو نہ آرام کی ضرورت اور نہ جس کو کبھی کوئی معذوری پیش آسکتی تھی۔

باب (۴۹)

سنہ ۱۹۲۶ء (۱)

(ظرف کا امتحان - اشتعال انگیزیاں)

شریفی سعودی جنگ شروع اگست سنہ ۲۵ء میں ہوئی تھی۔ اب جنوری سنہ ۲۶ء آگیا، سرزمین حجاز پر تو کہنا چاہیے کہ اب ختم ہی ہو چکی تھی لیکن ہندوستان کی سرزمین پر اسی شدت اور اسی حدت، اسی جوش اور اسی سرگرمی کے ساتھ قائم، تیغ و تفنگ کے بجائے زبان و قلم سے: جنگ کے پہلو بپہلو اور اطراف و جنوں تھے، لیکن اب ایک عرصہ سے سارے نزاعات سمٹ سمٹا کر صرف دو شخصیتوں کے دامن کے نیچے آگئے تھے۔ ایک طرف مولانا عبد الباری فرنگی محلی اور دوسری طرف مولانا محمد علی۔ دنیا جس جنگ کا تماشہ مزہ لے لیکر دیکھ رہی تھی، وہ یہی "پیر و مرید" کی جنگ تھی۔ محمد علی سے جس کسی کو دل کا بخار نکالنا ہوتا، جھٹ فرنگی محلی لشکر میں شریک ہو جاتا۔ فرنگی محلی کے درپے جو کوئی بھی ہوتا، معاً محمد علی کے جھنڈے کے نیچے آکھڑا ہوتا۔ لیکن یہ خیال دنیا والوں کا تھا۔ ممکن ہے فرنگی محلیوں کا ہو، خود محمد علی نے اب تک ایک دن کے لیے بھی نہ جنگ کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا نہ مولانائے فرنگی محلی کو اپنے حریف مقابل کی حیثیت سے دیکھا، اور نہ اپنے کو اپنے مرشد سے آمادۂ جنگ پایا ـــــــــ محمد علی کا نقطۂ نظر ہی بالکل دوسرا تھا۔ تصریح کئی بار گزر چکی دہرائی کہاں تک جائے؟

پانچ چھ مہینے کی مدت میں کیسے کیسے انقلابات ہو گئے۔ کتنے اچھے دل برے ہو کر رہے۔ کتنے جڑے ہوئے دل ٹوٹ ٹوٹ گئے۔ دوست دشمن بن گئے، اور کتنے بھائی بھائیوں کی عزت کے خواہاں ہو گئے۔ لیکن خود محمد علی کی زبان پر اپنے اپنے پیر و مرشد کے معاملہ میں مہر لگی ہوئی۔ لوگ چھیڑتے، پوچھتے، گدگداتے، ہنستے کہ اب تو مرید کسی طرح مشتعل ہو کر بھڑے، محمد علی کی زبان فرنگی محل پر کھلے اور محمد علی کا قلم اپنے مرشد پر اٹھے۔ لیکن محمد علی نے اپنی بیسیوں تقریروں اور ان سے کم لیکن پھر بھی بہت تحریروں میں ایک لفظ بھی ایسا نہ آنے دیا جس سے مولانا کی توہین نکلتی ہو۔ ہمدرد میں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، کبھی اتفاق سے جب دوسروں کے قلم سے (اور ان دوسروں میں خود یہ ڈائری نویس بھی شامل ہے اور عارف صاحب چیف سب اڈیٹر بھی) کوئی چیز اس قسم کی نکل جاتی تو علم ہونے پر محمد علی سخت ناخوش ہوتے۔ زبانی گفتگوؤں میں بھی اپنا ذاتی تجربہ تو یہی ہے کہ جب کبھی فرنگی محل کی بد زبانیوں یا زیادتیوں کی شکایت شروع کی گئی تو معاً محمد علی یہ جرح کرنے لگے کہ یہ الفاظ کس کے ہیں؟ خود مولانا کے ہیں؟ آپ نے اپنے کانوں سے ان ہی کی زبان سے سنے ہیں؟ اور جب ان سوالات کا جواب اثبات میں نہ دیا جا سکتا، تو فرماتے کہ "بس مجھے پروا نہیں۔ کوئی کچھ بھی کہا کرے، میرا معاملہ تو صرف مولانا سے ہے، کسی اور سے نہیں" ——— ہم لوگ پارٹی والے جب آپس میں بیٹھتے تو کہتے کہ شوکت صاحب کی طرف سے تو اب اطمینان ہے، وہ تو فرنگی محل کو خوب پہچان گئے ہیں، اب نہیں بدلنے کے لیکن ان حضرت (محمد علی) کی طرف سے اطمینان نہیں ہوتا۔ یہ جس وقت بھی پھر ادھر ڈھل جائیں، ان سے کچھ بعید نہیں"

بارہ بنکی کے ضلع میں دریاباد کے پڑوس میں ایک مشہور قصبہ رودولی ہے۔ یہاں سلسلہ صابریہ چشتیہ کے ایک مشہور بزرگ مخدوم شاہ احمد عبد الحقؒ کی درگاہ ایک مشہور و معروف درگاہ ہے۔

وسط جمادی الثانی میں عرس کی تقریب بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ زائرین، شائقین دور دور سے آتے ہیں، اور فرنگی محلی خاندان کی یہ شاخ مولانا عبدالباری صاحب والی تو اپنی حاضری لازمی سمجھتی ہے۔ اس سال عرس دسمبر ۲۵ء کی بالکل آخری تاریخوں میں آکر پڑا۔ عارف صاحب کانپور تک تو کانگرس و خلافت کے جلسوں کے لیے آہی چکے تھے، وہاں سے اٹھے تو سیدھے ردولی پہنچے۔ سماع و قوالی کے بڑے ہی شائق تھے۔ یہاں فرنگی محلی جماعت سے مڈبھیڑ ہوئی، جس میں خود مولانا بھی شامل تھے۔ یہاں کیا کیا گزری، اس کا پورا حال تو اللہ ہی کو معلوم، البتہ عارف صاحب جب دفتر ہمدرد واپس پہنچے ہیں تو فرنگی محل، اور خصوصاً مولانائے فرنگی محلی کی شکایتوں کا طومار زبان پر بھی تھا اور قلم پر بھی۔ ہمدرد میں ان کے قلم سے، اور ایک فرضی نام سے، لکھی ہوئی بڑی مفصل رپورٹ ۷، ۸ کالموں میں دو نمبروں میں شائع ہوئی جس میں یہ تصریحات موجود تھیں:۔

"...... فرنگی محلیوں نے یہاں آکر کذب و افترا کا ایک جال بچھا دیا...... فرنگی محلیوں کی شرکت کو شرکت عرس پر محمول نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس دفعہ تو مولانا عبدالباری، علی برادران اور خلافت کمیٹی کے خلاف جہاد کرنے میں زیادہ تر سرگرم رہے، اور جس قدر آپ سے ہو سکا مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے خلاف خود آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے زہر اگلا اور پروپگنڈا کیا...... مولانا عبدالباری صاحب مع دو قدوائی اور بہت سے فرنگی محلیوں کے جس وقت سے ردولی تشریف لائے اس وقت سے لیکر واپسی تک، اسی جد وجہد اور سعی و کوشش میں مصروف رہے کہ خلافت کمیٹی اور اس کے جملہ ارکان کو عموماً اور علی برادران کو خصوصیت کے ساتھ طرح طرح کے غلط اور جھوٹے الزامات لگا کر بدنام کریں۔ چنانچہ کذب و افترا کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا، جو برادران محترم کو نہ صرف وہابی بلکہ ملحد دکافر مشہور کرنے میں فروگذاشت کیا گیا۔...... علی برادران کی نسبت کذب و افترا کا وہ طوفان برپا کیا گیا کہ الامان والحفیظ۔ اب تو

علی برادران فرنگی محل کے دائرۂ اسلام سے بھی قریب قریب خارج ہیں۔ یعنی اب شرلیفی و سعودی مسلم نہیں رہا، بلکہ راویٔ معتبر کے بیان کے مطابق، بہ قول مولانا عبد الباری کے الحاد و اسلام کا مقابلہ درپیش ہے۔ یعنی خلافت کمیٹی اور علی برادران الحاد پھیلا رہے ہیں، اور فرنگی محل اپنے ناتواں بازوٗن سے اس کا مقابلہ کر رہا ہے...... صرف زبانی پروپگنڈا نہیں کیا گیا، بلکہ ٹریکٹ، پمفلٹ اور ہینڈبل وغیرہ بھی کثیر تعداد میں تقسیم کئے گئے۔"

عارف صاحب دہلی جنوری کے پہلے ہفتہ میں پہنچے۔ مضمون کے دونوں نمبر ۱۲ و ۱۳ر جنوری کے ہمدرد میں نکلے۔ پارٹی والے (اور ان ہی میں یہ ڈائری نویس بھی تھا) پڑھ پڑھ کر پھڑک اٹھے۔ اور عارف صاحب کے "قلم تو ہبب رقم" کی داد دل کھول کر دی (مضمون عارف صاحب کے نام سے نہ تھا۔ صرف "از قلم تو ہبب رقم" تھا۔ عارف صاحب کے نام کا راز خود محمد علی نے دوسرے ہی دن طشت از بام کر دیا تھا) لیکن محمد علی کے دل پر کیا بیت کر رہی ہے؟ کسی مرید کی ارادت و عقیدت پر اس سے سخت بار کبھی کیوں پڑا ہو گا؟ کسی دوست کی دوستی کی اتنی سخت آزمایش کبھی کاہے کو ہوئی ہو گی؟ مولانا عبد الباری پیر و مرشد بھی تھے، اور نہایت عزیز دوست و محبوب بھی۔ برسوں کی دوستی، سالہا سال کی محبت، مدتوں کی عقیدت، ایک عمر کا خلوص، سب کا خاتمہ ایک ساتھ ہو رہا تھا! سارے رشتے دم کے دم میں ٹوٹ رہے تھے! کون سا دل اتنے کڑے امتحان کو آسانی سے برداشت کر سکتا ہے؟ اور پھر محمد علی جو محبت کا پتلا اور سرتاپا دل ہی دل تھا!

مولانا کو چھوڑنا تنہا ایک شخص کو چھوڑنا نہ تھا۔ ایک ہی وقت میں دینی مربی کو چھوڑنا تھا، دنیوی محسن کو چھوڑنا تھا، بہترین رفیقِ کار کو چھوڑنا تھا، مخلص ترین مشیر کو چھوڑنا تھا، محبوب ترین

عزیزہ کو چھوڑنا تھا، عزیز ترین بھائی کو چھوڑنا تھا، اور ان سب کو ایک ہی وقت میں چھوڑنا تھا!
جسم کا جان کو چھوڑنا تھا ——— اس شب میں محمد علی کو نیند کیسے آئی ہوگی؟ اس دن محمد علی کو
کھایا پیا کیسے گیا ہوگا؟ محمد علی نے کبھی ایک غزل کہی تھی، جس کا ہر شعر مزیدار ہے۔ کہا تھا ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اس شاعری کا امتحان اب واقعات کی دنیا میں تھا۔ مرید نے مرشد کا دامن خود مرشد ہی کی فرمائش پر، اللہ کے لیے پکڑا تھا۔ آج وہی دامن اللہ ہی کے لیے ہاتھ سے چھوٹ بھی رہا تھا! ———
ایمان کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو دنیا کی کوئی سی بھی قوت محمد علی کو فرنگی محل سے چھڑا سکتی تھی؟

پھر عارف صاحب محمد علی کی نظر میں کوئی لاغی اور واہی داوی نہ تھے۔ ہمدرد کے سرگرم کارکن اور ذمہ دار رکن تھے۔ مالک ہمدرد کی ہوا خواہی میں ہفتوں سے آگے، اور کم از کم اس وقت تک تو محمد علی کے ایک خاص معتمد علیہ تھے۔ جب وہ اپنی چشم دید شہادت جزم و وثوق کے ساتھ پیش کر رہے ہیں تو محمد علی کیسے نہ اس پر اعتبار کرتے اور کہاں تک اسے جھٹلاتے؟ خصوصاً جبکہ سارے قرائن و قیاسات اور پہلے کی سنی ہوئی حکایات و روایات اس کی عین تائید میں ہوں؟ ——— مہینوں کا اہتمام ضبط ختم ہوا۔ مدتوں کی وضع احتیاط رخصت ہوئی۔ اور عارف صاحب کے مضمون کا پہلا نمبر نکلتے ہی دوسرے دن خود محمد علی کے قلم سے ہمدرد میں تقریباً ۵ کالمون کا مضمون "تقاضائے وفا" کے عنوان سے نکل گیا۔

باب (۵۰)

سنہ ۱۹۲۶ء (۲)

(دوبدو - کڑی آزمائش)

"میں نے ابتک کوشش کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب رہا کہ باوجود فرنگی محلی سرگرمیوں کے ہم لوگ اور تمام کام چھوڑ کر فرنگی محل سے بحث و مباحثہ میں منہمک نہ ہوجائیں۔" مقالہ شروع یوں ہوا۔ لیکن ناگواری اور یاس کی حالت میں بھی اعتدال و اقتضا کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پایا۔ آگے چل کر کہتے ہیں:۔

"عارف صاحب غلطی پر ہیں، اگر وہ اس پروپگنڈا کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ ان کی رائے میں تمام کام چھوڑ کر اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ عارف صاحب میں ہمیشہ مجھے احساس تناسب کی کمی محسوس ہوئی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہم ردولی شریف کے عرس کے پروپگنڈے سے انھیں اس قدر متاثر پاتے ہیں۔"

اجمیر کا "آل انڈیا" عرس، عرس ردولی کے دو ڈھائی ہفتہ بعد ہونے والا تھا۔ عارف صاحب نے خبر دی تھی کہ فرنگی محل اصل تیاریاں وہاں مقابلہ کے لیے کر رہا ہے، اور وہاں ردولی سے بھی کہیں بڑھ کر اور کہیں زیادہ زبردست پروپگنڈا ہوگا، اس لیے اہل خلافت کو وہاں پہنچنا بہت ضروری۔ اس پر محمد علی لکھتے ہیں، اور وہی یہ لکھ بھی سکتے ہیں:۔

"اجمیر شریف کے عرس میں شرکت میں اپنے لیے باعثِ خیر و برکت سمجھتا ہوں۔ اور اگر اس آستانۂ گرامی سے فیض حاصل نہ بھی ہوتا، جب بھی جہاں اتنے مسلمان جمع ہوں پہنچنا ہم جیسے خادمانِ ملت کے لیے یوں بھی بسا ضروری ہے لیکن ہم نہ بھی حاضر ہو سکے (اور خوف یہ ہے کہ میں تو اس بار شاید محروم ہی رہوں) تب بھی خداوند کریم نے جس طرح اچانک ردولی شریف میں کذب و افترا کے تارِ عنکبوت کو پارہ پارہ کرنے کا سامان فراہم فرما دیا، اسی طرح اجمیر میں بھی وہی مسبب الاسباب اس کا سامان فراہم فرما دے گا۔ بیت عنکبوت سب گھروں سے زیادہ کمزور ہے۔ اس کی شکست و ریخت اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔"

بڑا اعتراض عوام (اور ان ہی میں بہت سے خواص بھی شامل تھے) کی نظر میں نقضِ عہد "بیعت" (بیعت اصطلاحی) کا آ کر پڑ رہا تھا۔ اس کے جواب میں یہ لکھنے کے بعد کہ اسلام و خلافت ہی کے لیے ہم انگریزوں سے لڑے، جن میں مل کر ہم جواں ہوئے تھے۔ شریف سے لڑے۔ ترکوں سے لڑنے کو تیار ہو گئے، ہندوؤں سے لڑنے کو تیار ہیں، آخر میں لکھتے ہیں۔

"اسلام و خلافت ہی کے لیے ہم نے علمائے ہند اور صوفیائے ہند سے رشتہ جوڑا تھا، اور کبھی نکث عہد کے ہم مرتکب نہیں ہوئے لیکن اسلام و خلافت ہی کے لیے ہم ایک بار نہیں ہزار بار اُن سے اپنے رشتہ کو توڑ دیں گے، اور صرف اسی خدا سے رشتہ جوڑے رہیں گے، جس سے عالمِ وجود میں آنے سے پہلے ہی ہم نے سوال الست بربکم کے جواب میں بلیٰ کہکر رشتہ جوڑ لیا تھا...... ہم اپنے پیر و مرشد کے پاس فنا فی الشیخ ہونے کی غرض سے نہیں گئے تھے، بلکہ فنا فی اللہ ہونے کی غرض سے۔ اور ہمارے لیے وہی پرانا طریقہ آج بھی موجود ہے کہ فان تنازعتم فی شیٍٔ فردوہ الی اللہ و رسولہ ان کنتم تومنون باللہ و الیوم الاٰخر۔"

معیار کی اس بلندی تک عام مخالفین و موافقین کیا پہنچتے۔ پارٹی والے، اِدھر کے ہوں یا اُدھر کے، روح کی ان گہرائیوں کو کیا پہچانتے ——— اہل نظر خود دیکھ لیں کہ ذرح عارف صاحب کے مضمون کی کیا تھی اور سوختہ دل، تفتۂ جگر محمد علی کے مضمون کی کیا،

ہوشیا! آوابِ دانان دیگر اند

سوختہ جان ورد انان دیگر اند

دنیا جو چاہے سمجھا کرے، جو چاہے کہتی رہے، بہرحال خود محمد علی اپنی زبان سے یہ صدائے حق لگاتے رہے:

"جو کوئی ہم پر نکث عہد کا الزام لگائے، وہ میرے اس عہد کو یاد رکھے جس کو بہ حالت نظر بندی میں نے اپنی سب سے پہلی غزل میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا تھا ؎

عہد اول کو بھی اچھا ہے جو پورا کر دو

تم وفادار ہو تھوڑی سی وفا اور سہی

اور اگر اسی زمانہ کے میرے اس شعر پر بھی نظر رہے تو برا نہیں ؎

سرکش نہیں، باغی نہیں، غدار نہیں ہم

پر ہم پہ تقاضائے وفا اور ہی کچھ ہے

یہ تقاضائے وفا صرف انگریزی حکومت ہی کے مقابلہ میں نہیں بلکہ ہر غیر اللہ کے مقابلہ میں ہے۔ میں نے آج تک ایک لفظ بھی مولانا عبدالباری صاحب کے خلاف نہیں لکھا، اور جو کچھ مولانا صاحب کے متعلق سنا تھا کہ وہ ہمارے خلاف کہتے اور کرتے ہیں، اسے کبھی یاد نہیں کیا تھا، مگر ....

اس "مگر" کے بعد فرنگی محل اور خدام الحرمین پارٹی کی چند حرکتوں کی تصریح ہے اور اس کے بعد "یہ وہ چیزیں تھیں جن کے بعد میں نے مجبور ہو کر فیصلہ کیا کہ انتظار کروں اور دیکھوں کہ مولانا صاحب

جو خدام الحرمین کے صدر اور فرنگی محلی حضرات کے بزرگ....... ان کے افعالِ قبیحہ پر اظہار بیزاری فرماتے ہیں۔ یہی نہیں کہ اظہار بیزاری ابتک نہیں فرمائی گئی بلکہ ......"

اس "بلکہ" کے بعد مزید جرائم کی تصریح ہے، یہاں تک کہ

"اب عارف صاحب تحریر کرتے ہیں کہ ردولی شریف میں جو پروپیگنڈا کیا گیا، اس میں مولانا صاحب خود بنفس نفیس شریک تھے"

محمد علی کے سینہ میں بھی آخر گوشت و پوست ہی کا دل تھا، پتھر کا ٹکڑا نہ تھا۔ پیمانۂ صبر کیا اب بھی نہ چھلکتا؟ ——— آگے جو کچھ لکھا ہے، روشنائی سے نہیں، خون دل سے لکھا ہے۔ طیش و غضب سے بگڑ کر نہیں، حزن و شکستگی سے گھٹ گھٹ کر:۔

"بحمد للہ میں مولانا صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے پیشتر بھی مسلمان تھا۔ آج بھی مسلمان ہوں، اور انشاء اللہ ہمیشہ مسلمان رہوں گا۔ جب آٹھ برس علی گڈھ اور چار برس آکسفرڈ میں رہ کر مجھ میں کفر و الحاد نے سرایت نہ کی، تو اب جبکہ اسلام کی خاطر میں نے علی گڈھ سے بھی منہ موڑا، اور آکسفرڈ پر بھی لات ماردی، کیا خداوند کریم مجھے کفر و الحاد کی طرف لیجائیگا؟ اب موت روز قریب تر معلوم ہوتی ہے۔ اب تو یہی دعا ہے کہ گو زندگی عبادات و ریاضات میں صرف نہ ہوئی، مگر موت اس آخری عبادت و ریاضت میں نصیب ہو جس کا نام شہادت ہے، اور میرا شعر سچا ثابت ہو۔

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر   مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

فاطر السمٰوٰت والارض انت ولیی فی الدنیا والاخرۃ توفنی مسلماً والحقنی بالصّٰلحین

(اے آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے دین و دنیا میں تو ہی ولی ہے، مجھے اسلام پر موت دے اور صلحاء میں مجھے شامل فرما)

مجھے فقط تیری خوشنودی منظور ہے ؎

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف

کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

مجھ سے سب بیزار ہو جائیں، مگر تو اور تیرا رسول بیزار نہ ہوں۔ کسی سے بھی نکث عہد ہو، مگر تجھ سے اور تیرے رسول سے نہ ہو۔ دنیا بھر کی بیعتیں فسخ ہو جائیں مگر وہ بیعت فسخ نہ ہو جو سب سے پہلی بیعت ہے...... خداوندا میں اقرار کرتا ہوں کہ میں تجھ سے راضی ہوں اور تیرے رسولؐ پاک سے اور تیرے قرآن سے اور تیرے رسول کی سنت سے۔ اے کاش تو اور تیرا رسول بھی مجھ سے راضی ہو جائیں۔ اگر تیری اور تیرے رسول کی خوشنودی حاصل ہو جائے تو پھر کیا ہے۔ تب تو تیرا حشر ہو گا اور میں ہوں گا؛ اور میرا یہ شعر میرا طغرائے امتیاز ہو گا ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے　　　یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

محمد علی کو دشمن تو دشمن، دوستوں اور محبوں نے بھی زود رنج اور مغلوب الغضب کہا ہے۔ زود رنجوں اور غصہ وروں کے یہی تیور، یہی شان، یہی زبان ہوتی ہے؟ کسی کی بد زبانی نے "مردود الطریقت" بھی کہہ دیا تھا۔ "مردودوں" کی جبین عقیدت ایسی ہی نورانی ہوتی ہے؟ حالات و حوادث تکوینی تو وہ چیزیں ہیں، جنھوں نے ام المومنین صدیقہؓ اور امیر المومنین مرتضیٰؓ تک کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا کر کے چھوڑا، پھر محمد علی اور ان کے مرشد کی کیا بساط تھی ——

لیکن کیا امیر المومنین جب ام المومنین سے مقابلہ کے لیے نکلے ہیں، تو کیا ان کا دل اسے کوئی خوش آیند مشغلہ یا تفریح سمجھ رہا تھا؟ کیا طبع گرامی پہ شدید گرانی نہیں محسوس ہو رہی تھی؟ محمد علی کے قلب کی حالت اس وقت کی کون بتائے؟ کون بتا سکتا ہے؟

مرید کو چھوڑ دیے، مرشد کا سینہ بھی بہر حال خالی نہ تھا۔ یہ تو شاید وہ موقع تھا کہ بے حس و بیجان پتھر تک میں حرکت پیدا ہو جاتی، تو پھر یہ تو ایک مومن کا قلب، ایک صاحب دل کا دل، ایک صاحب طریق کا سینہ تھا۔ اثر کیسے نہ ہوتا؟ اثر ہوا۔ مگر وہ بات اسی سطر میں اور اسی لمحہ کہنے کی نہیں، اُس وقت تو ظاہری آنکھوں کو یہ نظر آیا کہ اثر محمد علی کی تحریر کا نہیں، عارف صاحب کے مضمون کا پڑا۔ فریقین میں ضدیں بڑھیں، جوش انتقام بھڑکا، اور مقابلہ کی تیاریاں اس عظیم الشان پیمانہ پر شروع ہوئیں کہ گویا آخری اور فیصلہ کن ہی معرکہ ہو کر رہے گا۔ اب تک آویزش سپاہیوں کے درمیان ہو رہی تھی۔ اب سورماؤں کے سورما، دونوں سپہ سالار، خود تلوار سونت سونت کر، ایک دوسرے کے مقابلہ کو بڑھے۔ ایک عظیم الشان، ہولناک اور زلزلہ انگن تصادم اب ہوا اور خوب ہوا۔ ہزاروں لاکھوں سپاہیوں کے ہجوم میں کوئی خوف سے لرز رہا ہے، کوئی شوق و مسرت سے مست ہو رہا ہے، لیکن منتظر سب کے سب، نگاہیں سب کی جمی ہوئی، کان سب کے کھڑے ہوئے ——— ادھر بندے ان سرگرمیوں میں غرق، اُدھر تقدیر ایک دوسرے ہی کھیل، دردناک اور عبرت انگیز کھیل میں مصروف!

باب (۵۱)

سنہ ۱۹۲۶ء (۳)

(مرشد کی آخری گھڑیاں۔ وصال)

۷ر جنوری سنہ ۱۹۲۶ء۔ یکشنبہ، رجب سنہ ۱۳۴۴ھ کی غالباً دوسری تھی۔ یہ ڈائری نویس لکھنؤ میں تھا، اور اپنے ہاں عشا کی نماز اول وقت پڑھ ہی رہا تھا، کہ معلوم ہوا، مولانائے فرنگی محلی پر سہ پہر کے وقت یکایک فالج کا زبردست حملہ ہوا اور مولانا اس وقت سے بیہوش ہیں ——

مولانا کسرتی جسم کے آدمی تھے، توانا و تنومند۔ صحت بہت اچھی تھی، کھلتا ہوا رنگ، اور عمر بھی ابھی پچاس سال کے اندر! —— راوی خود ایک طبیب حاذق تھے، مولانا کی حالت دیکھے ہوئے چلے آرہے تھے، فرمایا کہ حملہ بہت شدید قسم کا ہے، اور زندگی کے لیے اچھا خاصہ خطرناک!

آہ، انسان ضعیف البنیان اور اس کی تدبیریں اور ارادے! کیا کیا تجویزیں ہو رہی تھیں، کیسے کیسے منصوبے بندھ رہے تھے، اور یہ ہو کیا گیا! —— عارف صاحب کا مضمون اپنا کام کر چکا تھا، وہ کام جو ابتک کسی کے بنائے بھی نہ بن آیا تھا۔ نہ چودھری خلیق الزمان کے بنائے نہ ظفر الملک علوی کے، نہ عبد الرزاق ملیح آبادی کے، نہ عبد الماجد دریابادی کے۔ مولانائے فرنگی محلی سے محمد علی کو باغی و برگشتہ کرنے کی کوشش اور تدبیریں ابتک محمد علی کے خدا جانے کتنے نیازمند اور رفیق کر چکے تھے، بعض حبِ علی کی بنا پر، اور زیادہ تر بغضِ معاویہ کی بنا پر، کوئی محمد علی

سے فرط اخلاص دنیاز کی بنا پر، اور کوئی محض فرنگی محل کی ضد اور عداوت پر۔ لکھنؤ ان تخریبی کوششوں کا مرکز نہ تھا، اور اپنے جوار ہی کے حضرات ان کوششوں میں سرگرم۔ یہ ڈائری نویس بھی (اللہ اسے معاف کرے) ان کارروائیوں میں بڑی حد تک تو نہیں، لیکن کسی درجہ میں بہرحال شریک ومعین۔ محمد علی کے تعلقات محبت ("محبت" نہ کہ عقیدت) مولانائے فرنگی محلی سے اس درجہ محکم واستوار تھے کہ کسی کی کچھ نہ چلتی ——— عمر میں بالکل پہلی بار اب یہ اتفاق ہوا کہ گوشت ناخن سے جدا ہوا۔ دوست کا دل دوست سے، عزیز کا دل عزیز سے، مسترشد کا دل مرشد سے ہٹا۔ اور دل کی ٹیسیں لفظ وعبارت کا جامہ پہن کر ہمدرد کے صفحات پر نمودار ہوئیں۔ یہ کامیابی اور کارگزاری کچھ تھوڑی تھی؟ یاروں کی دیرینہ تمنا بر آئی۔ عارف صاحب کو داد بھی ملی اور مبارکباد بھی، زبانی بھی اور اخباری مضمون میں بھی۔

حضرت خواجہ معین الدین حسن چشتی سنجری کا عرس اجمیر میں ۶ رجب کو ہوتا ہے۔ اور جس طرح حضرت کا مرتبہ خواجۂ خواجگان کا سمجھا جاتا ہے، اس عرس کو بھی عرس الاعراس کہنا چاہیے۔ ہندستان کا سب سے بڑا عرس شاید یہی ہے۔ معتقدین کا ہجوم عظیم، زائرین کی ریل پیل، خوش عقیدگی کی حکومت مشائخ اور پیرزادے ملک کے گوشہ گوشہ سے اکٹھا۔ علی برادران اور خلافت کمیٹی پر یورش کا موقع اس سے بہتر اور کہاں مل سکتا تھا۔ ردولی کے عرس کو اور عارف صاحب کے مضمون کو ابھی دن ہی کے ہوئے تھے، غصہ تازہ، جوش بے اندازہ، زخم ہرا۔ ٹھہری یہ کہ خدام الحرمین کا جلسۂ عظیم ان پیمانہ پر وہیں ہو، اور لکھنؤ اور دہلی اور بمبئی اور لاہور، سب کہیں کا جمع شدہ بخار وہیں دل کھول کر نکالا جائے، اور یلغار اس زورکی کی جائے کہ ان "مردود وہابیوں" کا نام ونشان بھی نہ رہ جائے ——— اصل منصوبے تو جو کچھ بندھے ہوں گے، ان کا پورا اور صحیح علم تو ان ہی حضرات کو ہو سکتا تھا

البتہ کچھ اڑی پڑی خبریں اُدھر کی اس کیمپ میں بھی آجاتی تھیں، اور یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ "صوفیانِ باصفا و مرشدانِ بے ریا" نے ایکا کرکے ابکی یہ تہیہ کر لیا ہے کہ اپنی جان لڑا دیں گے، اور نا ہنجار وہابیوں کا قلع قمع کیے بغیر دم نہ لیں گے۔ ان بدبختوں کا سردار و پیشوا محمد علی ہے، اسے زیر کر لیا تو بس فتح ہی فتح ہے۔ اسے گرا لیا، تو پھر مقابلہ پہ کون کھڑا رہ سکتا ہے؟

عرس کی اصل تاریخ ۶ رجب تھی۔ مولانائے فرنگی محلی کا مقدمۃ الجیش کئی دن قبل روانہ ہو چکا تھا، مولانا بہ نفس نفیس ۲ کی شام کو روانہ ہونے والے تھے کہ یک بیک سہ پہر کو یہ واقعۂ فالج پیش آگیا! آج کا دن خاص مشغولیت، تیاری اور اہتمام کا دن تھا۔ خدام الحرمین کی انتظامی کمیٹی کا جلسہ کئی گھنٹہ تک زور شور سے رہا تھا، مولانا اس کے خادم الخدام یا صدر تھے حسرت موہانی سے بھی خاص مشورے ہو رہے تھے ——— محمد علی سے مقابلہ آسان نہ تھا۔ شریفی فوج نے اپنے سب سے بڑے جنرل کی زندگی ہی کو داؤں پر لگا دیا! مولانا کے کان خوب ہی بھر دیے گئے تھے کہ ذرا دیکھیے تو محمد علی کی گستاخیاں، مرید ہو کر شیخ سے یہ زبان درازیاں! ایسا بے ادب ہرگز کسی رو رعایت کا مستحق نہیں۔ خدا کے لیے اٹھیے، اور اس "بے دین" و "لا مذہب" کو ایسا سبق دیجیے کہ دنیا کو عبرت ہو کر رہے!

لکھنؤ میں دوا علاج میں کون سی کسر اٹھ رہ سکتی تھی؟ بہتر سے بہتر طبیب اور نامور سے نامور ڈاکٹر جمع ہو گئے، مولانا کی خدمت اپنے لیے باعثِ سعادت و موجبِ نجات سمجھنے والے، اور کچھ ایسے بھی جو سر تا سر مولانا کے ممنونِ کرم و بندۂ احسان تھے۔ مولانا کا مزاج اس قسم کا تھا کہ شفقت و کرم کا برتاؤ، مرید و غیر مرید، معتقد و غیر معتقد، مخلص و غیر مخلص، سب کے ساتھ یکساں رکھتے تھے۔ درِ فیض سب کے لیے کھلا ہوا۔ جود و سخا کے لیے قید نہ زمان کی نہ مکان کی۔ شام تک اچھے اچھے معالجین

کا مجمع لگ گیا، وہ نازک مزاج ماہرینِ فن، جو دوسروں کے لیے گرانقدر فیس پر بھی قدم مشکل ہی سے باہر نکالتے، یہاں بے بلائے خود ہی حاضر۔ زبانِ حال پر دعویٰ کہ ؎

ہر یکے از ما مسیحِ عالمے ست

ہر الم را در کفِ ما مرہمے ست

سب نے مل کر جان لڑا دی۔ تیمارداری کے سامان بہتر سے بہتر موجود۔ عزیزوں، مخلصوں، مریدوں نے نہ دن کو دن سمجھا، نہ رات کو رات۔ بانسہ، بڑاگاؤں، ستر کھ، پیارہ وغیرہ کے اخلاصمندوں کا نمبر فرنگی محل کے خاص عزیزوں سے بھی کچھ بڑھا ہوا۔ غرض مادی تدبیریں ایک سے بڑھکر ایک جتنی بھی ممکن ہوئیں، سب عمل میں آکر رہیں۔ اور علاج اس معرکہ کا ہوا کہ اچھے اچھے رئیسوں امیروں کا بھی اس سے بڑھ کر نہ ہو سکتا۔ لیکن ؎

ہر چہ کردند از علاج و از دوا

گشت رنج افزوں و حاجت ناروا

یہ فالج طبی اصطلاحی فالج تھا کب؟ ——— اور جو مرض تھا وہ کسی ڈاکٹری، یونانی معالج کے بس کا تھا ہی کہاں؟ ؎

بیخبر بودند از رازِ درون

استعیذ اللہ مما یفترون

نبض اور قارورہ کی دیکھ بھال کرنے والے، روح کی تپک کا علاج کیا کرتے، اور تھرمامیٹر کی ڈگریاں ناپنے والے دل کی کسک کو کیا پہچانتے؟ ؎

رنجش از صفرا و از سودا نبود

بوئے ہر ہیزم پدید آید ز دود

تن کی رنجوری کو سب نے دیکھا۔ دل پر جو گزر گئی تھی، اس سے باخبر کوئی نہ ہوا۔ اوپر کے زخم پر مرہم رکھنے سب دوڑے، اندر کے ناسور کا پتہ بھی کسی کو نہ چلا۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ

تن خوش ست واو گرفتارِ دل ست

اس آزار کا درد کس کو؟ اس تڑپ کی خبر کسے؟ اس بیماری کی مثال ظاہر کی کس بیماری سے دی جائے؟ اور اس کی دوا، اپنے دیس کی کس قرابادین اور "صاحب" کی ولایت کی کس فارماکوپیا میں تلاش کی جائے؟ ؎

نیست بیماری چو بیماری دل
عاشقی پیداست از زاری دل

عشق ہمیشہ لیلیٰ و مجنوں، شیریں و فرہاد، نل ودمن ہی کے درمیان نہیں ہوتا، شمس تبریزی اور جلال الدین رومی کی داستانِ عشق بھی آخر اسی دنیا کی سماعت میں آ چکی ہے!

عارف صاحب کے مضمون کا اثر سب نے دیکھا۔ محمد علی کا مضمون خونِ دل کی روشنائی اور سوزِ جگر کے قلم سے لکھا ہوا بھی آخر اسی ہمدرد میں چھپا۔ اور عارف صاحب کے مضمون سے کہیں زیادہ پڑھا گیا تھا، اس کا اثر کسی نے نہ دیکھا! پارٹی کا نام لے کر جو وار ہوا، اس تلوار کی چمک سب نے دیکھی۔ اللہ کے نام کی گونج میں جو پھانس دل میں چبھی، گھسی، رگ جاں میں اتری، روح کے ریشہ ریشہ میں پیوست ہوئی، اس پر نظر کسی کی نہ گئی۔ خدام الحرمین کے صدر کے جسم کو، زبان کو، قلم کو، سرگرم عمل سب نے پایا۔ محمد علی کے مرشد کی روح کو حرکت میں آتے، غیرت کھاتے بیخود ہوتے کسی نے نہ دیکھا ——— محمد علی کا مضمون، کوئی معمولی، سطحی مضمون تھا؟ "تقاضائے وفا" کا تقاضا کوئی معمولی، رسمی تقاضا تھا؟ ایمان و اسلام کی پکار کوئی معمولی پکار تھی؟

مضمون کی عبارتیں ابھی ایک ہی نمبر اوپر نقل ہو چکی ہیں، دل والے آج بھی پڑھیں اور فیصلہ کریں کہ اُن کا نتیجہ کیا نکلنے والا تھا؟ یہ پکار کیا تھی؟ پکارنے والا کون تھا؟ اور پکارا کس کو گیا تھا؟ واسطہ کس کے نام کا دلایا گیا تھا؟ مضمون ۱۳ جنوری کے اخبار میں دہلی میں شائع ہوا، مولانا پر فالج ۱۷ کو لکھنؤ میں گرا۔ حیرت فالج گرنے پر نہ کیجئے۔ حیرت اس پر کیجئے کہ فوراً کیوں نہ گرا، اور یہ تین چار دن کا وقفہ درمیان میں کیسے پڑ گیا؟

مولانا کا قلب کیا بالکل بے حس تھا؟ آخر ایک صاحب ایمان کا قلب تھا، ایک صاحب ارشاد کا قلب تھا، محمد علی ہی کے شیخ کا قلب تھا، روحانی رہنما کا قلب تھا۔ مولانا صاحب سماع تھے اور صاحب سوز و گداز۔ پیشہ ور قوالوں کی زبان سے کسی کا نام سن سن کر بارہا اپنا ملبوس اور اپنا خرقہ، اپنا پیرہن اور اپنا عمامہ اتار چکے تھے۔ آج اُسی ہیبت والے اور عظمت والے کا نام ایک اخلاص کے پتلے، سرفروش و جانباز سے سنا تھا۔ کیا جامۂ ہستی اتار پھینکنے میں اب بھی رکتے اور جھجکتے؟ محمد علی کے حلقوم سے آواز تو وہ نکلی تھی، جو پتھر کو پگھلا دیتی، فولاد کو گلا دیتی، چٹان کو ہلا دیتی۔ کیا اپنے ہی مرشد کے قلب پر اتنا بھی اثر نہ کرتی؟ فرنگی محل کے یہ آخری دور کا شیخ طریقت بزرگان سلسلہ کے نام پر خدا جانے کیا کچھ لٹا چکا تھا، اللہ کا نام سن کر کیا نقد جان کی نذر دینے میں تخلل کرتا رہ جاتا؟ کیا اس کی روح خشیت سے خدانخواستہ بالکل خالی اور اس کا سینہ انابت سے بالکل بے نور تھا؟ روح تھرتھرائی، جان کپکپائی، اور ناسوتیوں نے اپنی محدود زبان میں ایک اصطلاح فالج کی گڑھ لی ——— یہ فالج ۷۰، ۸۰ گھنٹے کے بعد کیوں گرا۔ حق تو یہ تھا کہ عین اسی وقت قلب ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ اسی لمحہ جگر پانی پانی ہو کر رہ جاتا۔ آنکھیں اس تحریر کے بعد کوئی دوسری تحریر نہ دیکھتیں۔ کان اُس آواز کے بعد پھر کوئی آواز نہ سنتے!

شمس تبریز کی قسمت میں کہا جاتا ہے کہ اپنے عاشق زار مرید و طالب جلال الدین رومی کے

ایک فرزند کی تلوار سے جام شہادت پینا لکھا تھا۔ محمد علی کے مرشد اپنے نصیب میں محمد علی کے قلم سے اپنا شہید ہونا لکھا کر لائے تھے۔ وہ حکایت کتابوں میں پڑھی، یہ ماجرا اپنی آنکھ سے دیکھنے میں آیا۔

______ عاشقوں کی موت وشہادت کے بھی آہ، کتنے ڈھنگ اور کتنے آہنگ ہیں! کہیں غیروں کی تلوار، کہیں اپنوں کا پیار۔ اور شہادت زار الفت میں بلانے کے کتنے حیلے اور کتنے بہانے ہیں، اور بلانے والے کے چہرہ کے کتنے نقاب!

عشقِ معشوقاں نہان ست وستیر | عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر
عشق معشوقاں دو ورخ افروختہ | عشق عاشق جانِ او را سوختہ
کہربا عاشق بشکلِ بے نیاز | کاہ می کوشد دراں راہ دراز
عقل حیراں کایں عجب او را کشید | باکشش زاں سو بدیں جانب رسید!

باب (۵۲)

سنہ ۱۹۲۶ء (۴)

(از پیکرت بساط صفاے خیال یافت
اصل توازقرآن تو بتواں شناختن)

انتقال ۱۹ اور ۲۰ جنوری (سہ شنبہ و چہارشنبہ) کی درمیانی شب میں ہو گیا۔ محمد علی غریب تین سو میل دور، دہلی میں بیٹھے ہوئے، کچھ خبر نہیں کہ لکھنؤ میں آناً فاناً کیا قیامت گزر گئی۔ لکھنؤ سے انھیں خبر کون کرتا؟ کس کو کیا پڑی تھی؟ کرتا تو یہی ڈائری نویس کرتا۔ مخالفت کے عین شباب میں اس وقت اس فرض کا احساس کہاں؟ محمد علی کو شدید و خطرناک علالت کی اطلاع سب سے پہلے چہارشنبہ کو قریب دو پہر کے، سید جالب مرحوم کے روزنامہ ہمدم سے ہوئی۔ اسی وقت لکھنؤ تار دیا، پھر ٹرنک کال کر کے لکھنؤ کے مشہور کارخانہ دار میر احمد حسین کے ہاں سے ٹیلیفون پر خیریت دریافت کی۔ جواب میں انتقال کی خبر پہنچی! انا للہ ——— جو لوگ محمد علی کی حساس طبیعت اور بے پناہ جذبۂ شرافت سے واقف ہیں، وہی اس ناگہانی اطلاع پر ان کے غم و صدمہ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ پیر و مرشد اور بہترین رفیق دوست کی وفات کی خبر بالکل اچانک ملی، اور اب نہ کوئی گنجائش مصالحت باقی رہی اور نہ کوئی موقع آخری خدمت گزاری کا! اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ محمد علی کس طرح تڑپ تڑپ کر، اور کیسا کیسا تلملا کر رہے ہوں گے!

پہلی ٹرین سے مع اپنی بیگم صاحبہ کے روانہ ہو گئے۔ اور لکھنؤ ۲۱ جنوری پنجشنبہ صبح تڑکے پہنچ گئے
تدفین ۲۰ کی دوپہر کو خاندانی قبرستان، باغ ملا انوار میں ہو چکی تھی۔ اور اس دھوم دھام اور
اس اژدہام کے ساتھ کہ لکھنؤ کی تاریخ اس کی نظیر سے خالی ہے۔ اسٹیشن سے سیدھے قبرستان
پہنچے اور مٹی کے ڈھیر سے (سنگ مرمر کا مزار تو بہت بعد کو بنا، اس وقت کچی مٹی کا ڈھیر ہی تھا)
لپٹ کر بے اختیار رونے لگے۔ ع

بہ جنازہ گر نہ آئی بہ مزار خواہی آمد

مصرعہ شاعری کی خیالی دنیا میں نہیں، واقعات کی عملی دنیا میں ایکٹ ہو رہا تھا! ——
اس وقت کی مصوری کون کر سکتا ہے؟ کن لفظوں میں کی جا سکتی ہے؟ دل ایک دن قبل ہی سے
رو رہا تھا، اس وقت آنکھوں سے بھی چشمے ابل پڑے آہ، جو قلب سرتاپا درد تھا، یکسر سوز و گداز
تھا، اجنبیوں اور بیگانوں کے لیے بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا تھا، اس وقت اپنے محبوب ترین
دوست کی قبر پر کھڑا تھا، اپنے مرشد کے مزار پر حاضر تھا! جذبات میں جتنا بھی تلاطم ہوتا سب بجا تھا۔
خدا جانے دل میں کتنے ارمان ہوں گے، کیا کیا آرزوئیں ہوں گی، کیسے کچھ گلے شکوے بھرے ہوں گے،
کیسے کیسے راز و نیاز سینہ سے لب پر آنے کو مچل رہے ہوں گے۔ کتنی ہدایتیں لینی تھیں کتنے مشورے
دینے تھے۔ آہ، کہ یہ سب اب ہمیشہ کے لیے سینہ کے صندوق میں بند کے بند رہ گئے! جیتے رہتے
تو کبھی محبوب صفت مرشد روٹھ جاتے، عاشق زاد مرید منا لیتا۔ کبھی مرید ناز کرتا، شیخ فرط شفقت سے
گلے لگا لیتے۔ یا الہ العالمین، یہ سب بات کہتے، پلک جھپکتے، خواب و خیال بن گیا! ——
بلا وہم و گمان، بالکل دفعۃً اور اچانک۔

لکھنؤ والوں کو کچھ نوٹس مل گیا تھا۔ تین دن تو بہرحال بیماری کی دیکھ بھال، اتار چڑھاؤ
میں لگ گئے۔ محمد علی بیچارہ کو تو گویا بس وہی ایک خبر یک بیک پہنچی، جس کے بعد پھر کوئی خبر

نہیں رہ جاتی ۔ محمد علی جذبات و محبت کا پتلا، حیرت ہے کہ اتنا ضبط بھی کیونکر کر سکا۔ صرف رونے اور لپٹنے پر کفایت کیسے کی۔ بیہوش ہو کر گر کیوں نہ پڑا! کلیجہ پاش پاش کیوں نہ ہو گیا! ——

کشتۂ غمزدۂ خود را بہ نماز آمدۂ

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ (اعراف - ۵)

جو کچھ انکے دلوں میں ایک دوسرے کیطرف سے غبار تھا، اسے ہم دور کر دینگے، اور انکے محلوں کے نیچے دریا جاری ہو جائینگے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ تذکرہ اہل جنت کا ہے، آیت وہین کی ہے ۔ آیت سے بالکل ظاہر ہے کہ جنھیں جنت میں بڑے بڑے درجے نصیب ہوں گے، ان میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوں گے، جو دنیا میں ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے ۔ دنیا میں ایک دوسرے کی طرف سے اپنے سینہ مین رنج و کدورت رکھتے تھے —— گویا یہ باہمی فصل و تفرقہ، کدورت و رنجش نہ لازمی طور پر ان کے کمالات روحانی و فضائل اخلاقی کے منافی ہے اور نہ انعامات جنت کے ۔ اور تفسیروں میں قتادہ تابعیؒ کے واسطہ سے یہ روایت حضرت علی مرتضیٰؓ کی زبان سے نقل ہوئی کہ یہ آیت میرے اور طلحہؓ و زبیرؓ و غیرہم کے حق میں ہے —— اللہ اللہ! ہم ضعفائے امت کی رعایت رب کریم کو کس درجہ ملحوظ ہے، اور ہماری تسکین و دلدہی کے سامان قدم قدم پر کس طرح ہم پہنچا دیے گئے ہیں۔ جب صحابیان رسولؐ، اور ان میں بھی چیدہ و برگزیدہ، عشرۂ مبشرہ تک اس آیت کے تحت میں آجاتے ہیں، تو چودہویں صدی ہجری کے صالحین و ابرار کے لیے کیوں کڑھا جائے، اور ان کے آپس کے اختلافات کتنے ہی شدید ہوں، لیکن بہرحال اگر اخلاص و حسن نیت کے ساتھ ہین، اور نتیجہ محض اختلاف فہم و بصیرت کا ہے، تو ان کے لیے درجۂ قرب و وصول سے محرومی کا اندیشہ ہی کیوں کیا جائے؟

مرشد و مرید کی جنگ ختم ہوئی۔ حبیب و محبوب میں وصال ہو کر رہا، ع

درمیانِ جان و جانان ماجرائے رفت رفت

صلح ہوئی لیکن سنگ مزار کے اوپر!

نزع میں لائے دلآرام کو

عید ہوئی ذوق ولے شام کو

شاعر نے روئے دلآرام کا دیکھنا حالت "نزع" میں بیان کیا ہے، یہاں معاملہ نزع میں نہیں نزع کے بعد کا ہو کر رہا۔

کچی تربت پر فاتحہ پڑھکر فرنگی محل آئے۔ یہاں کے فاتحوں میں شریک ہوئے۔ مولانا کے صاحبزادہ تو اس وقت بالکل بچہ تھے، بھتیجے اور داماد قطب میاں صاحب کی باضابطہ جانشینی ہوئی۔ محمد علی بھی اس تقریب میں شریک رہے۔ اپنی طرف سے اور اپنے بھائی (شوکت علی) کی طرف سے نذر پیش کی۔ ایک ایک سے ادائے تعزیت کی۔ ایک فرنگی محلی عزیز سے یہ کہتے ہوئے، میں نے اپنے کانوں سے سنا:-

"لوگ کہتے ہیں کہ مولانا میں یہ کمزوری تھی اور وہ کمزوری تھی۔ میں کہتا ہوں کہ ان کمزوریوں کے باوجود بھی تو اتنی خوبیاں کسی اور میں دکھاؤ"

غم و الم کے شدتِ تاثر میں یہ توازن مقام قائم رکھنا محمد علی ہی کا کام تھا!

پارٹی والے جب ملنے آئے تو ایک ایک کو سمجھایا کہ بس اب جنگ ختم ہوئی، پچھلی باتوں پر خاک ڈالو جو ہونا تھا ہو کر رہا۔ اب قطب میاں مستحق ہمدردی ہیں، ان کے ساتھ مل جل کر کام کرو، انھیں اپناؤ ـــــ کسی نے یہ سنکر سمعنا واطعنا کہا، اور کسی نے صرف سمعنا۔ کسی نے صرف

ظاہر کے کانوں سے سنا، اور کسی نے دل کے کانوں سے بھی۔

ڈائری نویس کا قلم ورق پر ورق سیاہ کرتا چلا گیا، اور اب جا کر شریفی سعودی جنگ کے صرف ایک رخ کا خاتمہ ہوا، وہ بھی جہاں تک محمد علی کی زندگی کا تعلق تھا، اور ان کی بھی صرف وہ زندگی جو براہ راست میرے علم میں آتی رہی۔ حساب لگائیے تو ۳ راگست سے ۱۲ر جنوری تک کل پانچ ہی مہینے تو ہوتے ہیں یہ روداد زندگی گویا کل ۵ مہینے کی تھی، محمد علی کی تو ساری زندگی ہی مجموعۂ محاربات ہی۔ آج اس سے لڑائی، کل اس سے لڑائی۔ گورنمنٹ برطانیہ سے جنگ، مسلم لیگ سے جنگ، کانگریس سے جنگ، فرنگی محل سے جنگ، "پنجابی ٹولی" سے جنگ، جمیعۃ العلما سے جنگ، پنڈت موتی لال نہرو سے جنگ خواجہ حسن نظامی سے جنگ، ڈاکٹر انصاری جیسے عزیز ترین دوست سے جنگ، "یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے" کی عملی تصویر۔ لیکن اتنی تفصیل کیا معنی، اس کی آدھی بلکہ چوتھائی تفصیل کی بھی توقع آیندہ کسی جنگ سے متعلق نہ رکھیے۔ کچھ تو اس لیے کہ یہی ایک جنگ ایسی تھی جس میں محمد علی کے ایک وفادار نفٹننٹ کی حیثیت سے میں براہ راست شروع سے آخر تک شریک رہا۔ کسی اور جنگ میں شرکت رہی بھی تو یا بالواسطہ اور یا مقدار و حجم میں بہت کم۔ اور کچھ اس لیے بھی کہ اسی معرکہ آرائی کی تفصیل سے محمد علی کی سیرت کے ہر پہلو پر روشنی پڑ گئی، اور ان کا جوہر شرافت ہر طرح نمایاں ہو گیا۔ اب آگے ضرورت کسی مزید منقبت سرائی کی نہیں۔ ——— "ڈائری" یوں ہی اپنے حدود ایجاز و اختصار سے قدم باہر نکال کر "حیات" یا "سوانح عمری" کا بسط و اطناب اختیار کرتی جا رہی ہے!

باب (۵۳)

۱۹۲۶ء (۵)

(نیا دھچکا - خلافت کمیٹی کا مسلک)

"قاہرہ - ۱۰ جنوری - جدہ کا ایک تار مظہر ہے کہ ابن سعود نے حجاز کے بادشاہ ہونے کا مکہ معظمہ میں اعلان کر دیا ہے۔"

رائٹر کا یہ ذرا سا تار ۱۳ جنوری ۱۹۲۶ء کو ہندوستان کے سارے روزناموں میں ایک معمولی خبر کی طرح شائع ہوا۔ محمد علی کے لیے بم کے گولے سے کم نہ تھا۔ ایک مصیبت عظمیٰ کا پیام تھا۔ کیسے نہ ہوتا؟ آخر دسمبر میں کانپور میں ان کا دل سلطان کی طرف سے جو کھٹک گیا تھا، وہ اندیشے پورے ہو کر آج سامنے آ گئے! ان کی تو ایک عمر ملوکیت کے خلاف جہاد کرنے میں گزر چکی تھی، اور حجاز میں بادشاہت کا استیصال، اور اس کے بجائے خلافت راشدہ کے نمونہ پر ایک جمہوریۂ شرعیہ کا قیام ان کی رائے میں عالم اسلام کی آئے دن کی مصیبتوں کا واحد علاج تھا۔ سالہا سال کے غور و فکر کے بعد انھیں سودائے ان کی ایک دوا یہی نظر آئی تھی۔ استیصال ملکیت سے ان کی یہ مراد تھی کہ حجاز میں بادشاہت کسی قسم کی بھی نہ رہنے پائے بلکہ مراد صرف اسقدر تھی کہ آیندہ وہاں کا جو حکمراں ہو وہ اپنی ذاتی اہلیت اور شخصی صلاحیت کی بنا پر چنا جائے، اور اس اہلیت و صلاحیت کی جانچ سارے عالم اسلام کے نمایندوں کے ہاتھ میں ہو۔

یہ نہ ہو کہ چونکہ فلاں شخص فلاں خاندان کا ہے، یا پچھلے فرمانروا کا فرزند اکبر ہے، اس لیے وراثۃً وہی حکمراں بھی ہو جائے۔ خلافت راشدہ کا نام جو بار بار لیتے تھے، اس سے بھی مقصود اسی حقیقت کا اظہار تھا کہ وہاں حکمرانی نہ کسی خاندان کے ساتھ مخصوص تھی اور نہ وراثۃً باپ سے بیٹے کو منتقل ہوا کرتی تھی۔

اسی ملکیت کی جڑ کاٹنے کی وہ کیسی کیسی سعی ابتک خلافت کمیٹی کے ذریعہ سے کر چکے تھے۔ خود سلطان ابن سعود کی زبان سے بار بار اس کے وعدے لے چکے تھے۔ ترکوں کے الغاء خلافت کے بعد بس اسی توقع پر جی رہے تھے۔ اور سلطان کے ان ہی وعدوں پر بھروسہ کر کے خدا جانے اپنے کتنے پرانے رفیقوں، دوستوں، عزیزوں سے لڑائی مول لے چکے تھے۔ اب جو یہ خبر یک بیک ہر وعدہ اور ہر توقع کے خلاف، آئی تو گویا زمین پیروں کے نیچے سے نکل گئی۔ دوسروں نے اس خبر کو عام خبروں کی طرح معمولی طور پر چھاپ دیا۔ اب جو سلطان کے ہم مسلک وہم عقیدہ تھے وہ مسرت سے باغ باغ ہو گئے۔ ہمدرد نے جب یہ خبر چھاپی تو سیاہ ماتمی جدول کے اندر اور دو کالمی جلی عنوان

ایک نہایت اندوہناک خبر

کے تحت۔ اور خبر کے معاً بعد یہ نوٹ بھی درج تھا کہ "ہم اس خبر بد کو جس نے ہمارے قلب کو سخت ترین صدمہ پہنچایا ہے اسی طرح شائع کرتے ہیں جس طرح کہ رائٹر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہے۔" اور اس کے بعد کی عبارت نوٹ میں بہت جلی خط میں کر دی گئی تھی کہ "ہندوستان کے مسلمانوں کو چاہیے کہ خداوند کریم کی کارسازی پر بھروسہ رکھیں، اس سے مایوس نہ ہوں۔ جو کچھ کیا جائے، سوچ سمجھ کر کیا جائے۔ نہ کہ حالت اضطراب و سرگردانی میں۔"

جو لوگ محمد علی کے اصل مسلک کو سمجھ چکے تھے، انھیں ہمدرد کا یہ رویہ بالکل قدرتی اور صحیح

نظر آیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس مسلک کو سمجھ جانے والے تھے ہی کتنے؟

ہندوستان کے مسلمان، اپنے عقائد کے لحاظ سے، دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک سلطان کے دوست، دوسرے سلطان کے دشمن۔ ایک وہ جو سلطان کے ہم عقیدہ تھے۔ ان کے نزدیک سلطان، سلطان اسلام تھا، مرد مجاہد تھا، غازی تھا، مردان حق میں سے تھا، دین حقیقی کا محافظ ومجدد تھا، اور بدعت شکن کہ صدیوں کے مشرکانہ رسوم کو مٹا دیا۔ دوسرے وہ جو عقائد میں سلطان کے مخالف تھے۔ ان کے نزدیک ابن سعود وہابی تھا، ضال تھا، مضل تھا، سو گمراہوں کا ایک گمراہ تھا، کانا دجال تھا، اور اس کا یہ جرم ناقابل معافی اور ناقابل تلافی تھا کہ اس نے مزارات مقدسہ کے قبے گرا دیے تھے، قبور صالحین کی بے حرمتی کر ڈالی تھی، قبہ شکن تھا، گورکن تھا، دشمن رسول وآل رسول تھا——ہندوستان کے ۷، ۸ کروڑ مسلمان کی آبادی کا جزو اعظم انہی دو غالی گروہوں کے درمیان تقسیم تھا۔

محمد علی مع ایک مختصر جماعت علماء کے (اور جمعیۃ العلماء کا بھی اس وقت تک یہی مسلک تھا) ان دونوں گروہوں کے فقہی وکلامی، یا زیادہ صحیح طور پر "فرقہ وارانہ" غلو سے بالاتر تھے۔ وہاں تو دھن ہی دوسری تھی۔ اپنی ذات سے حنفی تھے، صوفی تھے۔ لیکن آنکھیں دیکھ رہی تھیں، اور دل رو رہا تھا کہ اسلام پر وقت کون سا آ کر پڑا ہے۔ جب حملہ عین قلب وجگر اور دماغ پر ہو رہا ہو تو پیر کے ناخنوں کے بچانے کی فکر کون کرے گا، اور سر کے بالوں کی حفاظت کی پروا کسے رہے گی۔ کفر والحاد کی گولیاں تو بلا تفریق وامتیاز "وہابی" و "بدعتی" ہر کلمہ گو کے سینہ پر آ کر یکساں پڑ رہی تھیں۔ اور کبھی یہ پوچھتی بھی نہ تھیں کہ ان میں ابو حنیفہؒ کا ماننے والا کون ہے اور ابن تیمیہ کا نام لیوا کون؟ معتزلی کون کہلاتا ہے، اور اپنی اشعریت پر ناز کس کو ہے؟ معراج جسمانی

کے قائل کون کون ہیں اور اس کے منکر کون کون؟ محرم میں غم امام میں سینہ کوبی کون کرتا ہے اور گیارہویں میں "بڑے پیر صاحب" کے نام کی نیاز کون دلاتا ہے؟ اندرونی اختلافات و نزاعات جو کچھ بھی ہوں، فقہی و کلامی موشگافیاں جزئیات کو جو جو شکلیں بھی دے چکی ہوں، وہاں تو محض مسلمان کا نام کافی تھا۔ جو زبان اپنے کو کلمہ گو کہے، اور مردم شماری کے رجسٹر میں اپنے کو مسلمان لکھائے۔ "فلک پیر" کی طرح فرنگیت کا بت بے پیر تو بس اسی کا دشمن تھا، اور محمد علی اسی کا دلسوز خادم اور غمخوار ہوا خواہ۔ دل میں درد تھا تو بس اسلام کے کلمہ کا، اور تڑپ تھی تو اس کی کہ اغیار کے دست برد سے کسی طرح محفوظ ہو کر سارا عالم اسلامی متحد ہو، اور منکروں کے مقابلہ میں اللہ کا نام لینے والوں کا' اور 'لامحمدیوں' کے مقابلہ میں محمدیوں کا ایک متحدہ محاذ قائم ہو جائے۔ جس نے اس اتحاد پر ضرب لگائی، بس محمد علی اس کے دشمن۔ شریف حسین کا اصل قصور یہی تھا کہ اس نے عین وقت پر خلیفۃ المسلمین سے غداری کر کے قبائے خلافت چاک چاک کر دی۔ مصطفےٰ کمال کی جوانمردی سپہگری سب مسلم لیکن اس کے اس جرم کو محمد علی نے آخر دم تک معاف نہ کیا کہ اسی سفاک نے منصب خلافت توڑ کر ہمیشہ کے لیے مرکزیت اسلام پر ضرب کاری لگا دی! جس کے خیالات یہ ہوں، جو رہتا اور جیتا اور سانس لیتا اس عالم میں ہو، وہ نجدیوں کی رورعایت کیوں کرنے لگا تھا، اور ابن سعود کی مروت میں کیسے آکر رہتا!

خلافت کمیٹی، محمد علی کی تحریک پر، ڈیڑھ سال پہلے اپنا نقطۂ نظر سلطان ابن سعود کے سامنے یوں واضح کر چکی تھی:-

"...... ہندوستانی مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حجاز پر جو تمام دنیائے اسلام کا مرجع ہے کوئی بادشاہ یا سلطان حکومت نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہاں ایک ایسی جمہوریت قائم کرنی چاہیے

جو غیر مسلم اغیار کے اثر سے بالکل پاک ہو۔ ہر مسلمان کو یہ اصول مدنظر رکھنا چاہیے۔ تاکہ جنگ و خونریزی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی یہ رائے ہے کہ اس وقت اراکین حجاز کی ایک عارضی جمہوری حکومت قائم ہو جائے، اور مستقل حکومت کا فیصلہ اسلامی کانفرنس پر چھوڑا جائے۔ اس لیے کہ دنیائے اسلام کو امیر کا تقرر ناقابل قبول ہے۔"

خلافت کی جس مجلس عاملہ نے یہ تجویز پاس کر کے سلطان کی خدمت میں بھیجی تھی، اس میں محمد علی کے علاوہ، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر کچلو، اور شعیب قریشی شامل تھے۔ ان سب کے اتفاق رائے سے ۵ ر اکتوبر ۲۴ء کو دہلی میں یہ تجویز منظور ہوئی، اور ۷ ر اکتوبر کو تار پر روانہ ہوئی۔ ۲۸ ر اکتوبر کو اس کا جواب بھی تار ہی پر مولانا شوکت علی کو وصول ہو گیا تھا:-

"آپ کا تار پہنچا۔ آپ کے اور مسلمانان ہند کے صحیح خیالات کا شکریہ۔ جب تک حسین یا اس کے خاندان کا کوئی فرد مکہ معظمہ میں حکومت کرتا رہے گا، اس وقت تک پبلک کو امن و صلح میسر نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ واقع ہوا، اس کا ذمہ دار صرف حسین ہے۔ جس کے افعال سے اب مکہ معظمہ کو آزادی مل گئی۔ آخری فیصلہ دنیائے اسلام کے ہاتھ میں ہے۔"

محمد علی کیا اب بھی مطمئن نہ ہوتے؟ دل خوش کہ دیرینہ آرزو کے بر آنے کی گھڑی قریب آگئی۔ طبیعت مسرور کہ خوش آیند خواب کی تعبیر پوری ہونے کو آئی ——— ۲۳ ر نومبر ۲۴ء کو نجد کے قاضی القضاۃ عبداللہ بن بلیہد کا روانہ کیا ہوا ایک طویل تار موصول ہوا، جس میں یہ تھا کہ سلطان نے نجد سے مکہ روانہ ہوتے وقت حسب ذیل تقریر کی:-

"میں مکہ معظمہ پر قبضہ کرنے نہیں جا رہا ہوں، بلکہ وہاں کے باشندوں کو مظالم اور ناقابل برداشت ٹیکسوں کی مصیبت سے نجات دلانے جا رہا ہوں ...... اب مکہ معظمہ میں بجز شریعت کوئی سلطان نہ ہوگا .... چونکہ مکہ معظمہ سے جملہ مسلمانان عالم کو تعلق ہے، اسلیے

وہاں کی پالیسی ابنائے اسلام کی مرضی کے مطابق ہوگی، ہم جملہ نمایندگانِ عالم اسلام کی کانفرنس مکہ معظمہ میں منعقد کریں گے، اور ہر اس مسئلہ پر ان کی رائے لی جائے گی جس کی بدولت بیت اللہ گناہوں اور ذاتی اغراض کی تحریک سے پاک رہے ...... حجاز ہر شخص اور ہر نیک بندہ کے لیے کھلا رہے گا۔"

اس نے گویا اور مہر تصدیق لگادی۔ درمیان میں سلطان کے جو جو بیانات اس سلسلہ میں آئے یا شائع ہوئے وہ سب اسی کے موید۔ یہاں تک کہ دسمبر ۲۴ء میں جو دعوت نامہ سلطان کی طرف سے موتمر اسلامی میں شرکت کے لیے جمعیتہ خلافت اور جمعیتہ العلما کے اکابر کے نام آیا، اس نے تو شک و شبہ کی گنجایش ہی نہ چھوڑی، طویل دعوت نامہ کے درمیان یہ عبارتیں بھی تھیں:

"میں اس خدائے بزرگ کی قسم کھا کر جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہتا ہوں کہ میرا مقصد حجاز پر تسلط یا حکومت کرنا نہیں ہے۔ حجاز میرے ہاتھ میں اس وقت تک ایک امانت ہے، جبتک اہل حجاز خود اپنے میں سے ایسے حاکم کا انتخاب نہ کرلیں، جو عالم اسلامی کی بات ماننے والا ہو، اور ان اقوام اسلامی اور طبقات ملی کے زیر نگرانی رہے، جنھوں نے اپنی غیرت و حمیتِ دینی کا ثبوت ہم پہنچادیا ہے، مثلاً مسلمانان ہند ......

ہمارا وہ مطمح نظر جس کا عالم اسلامی سے ہم نے وعدہ کیا ہے، اور جس کے لیے ہم شمشیر بکف رہیں گے۔ مجملاً حسب ذیل ہے۔

(۱) حجاز کی حکومت حجازیوں کا حق ہے۔ لیکن عالم اسلامی کے جو حقوق حجاز سے متعلق ہیں ان کے لحاظ سے حجاز تمام عالم اسلامی کا ہے۔

(۲) ہم ایک استفتاء عام عنقریب جاری کریں گے جس میں حاکم حجاز کے انتخاب اور عالم اسلام کی نگرانی کے متعلق استفتاء ہوگا۔ اس کے لیے وقت کی تعیین بعد میں کی جائے گی، اور پھر ہم اس امانت حجاز کو ان اصول کے ماتحت اس حاکم کے سپرد کر دیں گے۔"

باب (۵۴)

سنہ ۱۹۲۶ء (۶)

(خبر صاعقہ اثر)

محمد علی کیا اب بھی اعتماد نہ کرتے؟ کیا اتنی تصریحات کے بعد بھی غیر مطمئن رہتے؟ اس وقت کے لیے تو یہ کہہ لیجئے کہ جذبات میں تلاطم تھا، آج اتنا زمانہ گزرنے کے بعد، وقت کے اتنے فاصلہ کے بعد بھی ان اعلانات، ان بیانات کو پڑھکر فیصلہ کیجئے کہ محمد علی کا اعتماد کیا کسی سادہ دلی کا، عجلت پسندی کا، بے احتیاطی کا، زود اعتمادی کا، نتیجہ تھا؟ ——— ابھی کل ایک ہی ہفتہ تو ہوا، جب محمد علی نے یہ تار خلافت کمیٹی (زیر صدارت مولانا ابوالکلام) کی طرف سے سلطان کو دلوایا تھا:-

"خلافت کانفرنس کا یہ سالانہ اجلاس (منعقدہ کانپور) آپ کو مدینہ منورہ اور جدہ میں پر امن داخلہ پر مبارکباد دیتا ہے...... تطہیر حجاز کا شکریہ ادا کرتا ہے...... ہم موتمر کی شرکت کے لیے تیار ہیں۔ براہ کرم مطلع فرمایئے کہ اگلی حج کا موسم اس کے لیے موزوں ہوگا۔ ہم اپنے اس رزولیوشن پر قائم ہیں، جو اکتوبر سنہ ۲۴ء میں آپ کو بھیجا گیا تھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے اپنے ربیع الآخر کے مکتوب میں اس سے اتفاق کیا ہے۔"

یہ تار ۴ جنوری سنہ ۲۶ء کو روانہ ہوا تھا۔ ۱۱ جنوری کو سلطان کے اعلان بادشاہت کا وہ تار آگیا، جو پچھلے باب کے آغاز میں درج ہو چکا ہے! ——— کل ایک ہفتہ کے

کے اندر یہ انقلاب روزگار!

گویا کہ دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ!

ہا! چاہا کیا تھا، ہوا کیا؟ سوچا گیا تھا، نتیجہ کیا نکلا! مانگا گیا تھا، ملا کیا! ــــــ دعائیں دنوں کو رو رو کر اور راتوں کو گڑگڑا گڑگڑا کر کی گیا تھیں، اور وہ قبول کس طرح ہوئیں! الٹ ہی دی گئیں!

دعائیں، اس کے قبل بھی، محمد علی کی قبول ہی کون سی ہوئی تھیں؟ بغداد کے لیے، سارے عراق کے لیے، بیت المقدس کے لیے، سارے فلسطین کے لیے، مصر کے لیے، شام کے لیے، ریف کے لیے ہندوستان کے لیے، ان سب کی آزادی اور تسلط اغیار سے نجات کے لیے دعائیں کون سی اٹھا رکھی تھیں؟ خشوع و خضوع میں، تضرع و الحاح میں اپنی والی کوئی کسر اٹھا رکھی تھی؟ اپنے نصیب میں کسی بھی دعا کی مقبولیت لکھا کر لائے تھے؟

اسرار تکوینی کے اتھاہ سمندر کی گہرائیوں کو کوئی ناپ سکا ہے؟ حکمت کاملہ کے دفتر بے پایاں کی شرح بڑے بڑے دانایان راز و محرمان اسرار بھی کر سکے ہیں؟ حکیم مطلق کے کاروبار کی تھاہ کوئی بھی پا سکا ہے؟ یعقوبؑ بن اسحاقؑ خود پیمبر برحق، پیمبر زادہ، پیمبر کے باپ، پیمبر کے پوتے، ہر سمت و جہت سے پیمبری ماحول سے گھرے ہوئے، چہیتوں کے چہیتے، پھر کیا انھیں غم دل بند میں برسوں رلایا، تڑپایا، کلپایا نہیں گیا؟ یوسفؑ بن یعقوب، شاہ بھی تھے اور شاہزادے بھی، حسن و جمال کے پتلے، محبوبوں کے محبوب پھر کیا کنوئیں میں ڈھکیلے نہیں گئے۔ کنوئیں کی تہ میں، تہ بہ تہ تاریکیوں میں ایک مدت تک پڑے نہیں رہے؟ غلام ہو کر نہیں بکے؟ مشرک کی غلامی میں مدتوں نہیں رہے؟ جیل میں چوروں، قزاقوں اور خونیوں کے ساتھ بند نہیں کیے گئے،

نوحؑ اور ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ، یونسؑ اور ایوبؑ، سرداروں کے سردار، مخدوموں کے مخدوم، ان سب کی آزمائشیں کیا کیا نہیں ہوئیں؟ ابتلاء کے کیسے کیسے سخت دور ان پر گزر کر نہیں رہے؟ ان کی دعائیں، دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اور اخلاص و عبودیت میں ڈوبی ہوئی دعائیں، کتنی اور کیسی کیسی، پلٹ کر نہیں رکھ دی گئیں؟ —— عجائب کاروبار ہیں، اور عجیب سے عجیب تر اسرار! جہاں معاملات بڑے بڑوں کے ساتھ یہ ہوں، وہاں چھوٹوں کا ذکر ہی کیا؟ اور جہاں آفتاب و ماہتاب ماند پڑے جا رہے ہوں، وہاں شمع کافوری یا موم بتی زبان اپنی بے رونقی اور پھیکے پن پر کھولے تو کیا کھولے!

ما پدریم دشمن و ماہی کشیم دوست
کس را رسد نہ چون و چرا در قضائے ما!

کہیں عوام تک کی یہ دلدہی کہ

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ — مجھے پکارے جاؤ، مجھ سے دعا کیے جاؤ، میں سب ہی کی سنتا رہتا ہوں

اور کہیں خواص، بلکہ اخص خواص تک کو اس ادب کی تعلیم، کہ

فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّیْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ — اس چیز کی درخواست بھی ہم سے نہ کرو جس کی تم کو صحیح خبر نہیں۔ میں تمہیں نصیحت کیے دیتا ہوں کہ ایسی درخواست کر کے ناواقفوں میں نہ شامل ہو جاؤ۔

کسی کو بشارت یوں دی جاتی ہے کہ ؎

تو چنین خواہی خدا خواہد چنیں
می دہد یزداں مراد متقین

یا ؎

کے صفحۂ قلب پر غم و الم، حزن و یاس کے سیاہ بادل جو چھا کر رہے، ان کے دیکھنے اور پھر دوسروں کو دکھانے کے لیے کوئی آلہ کہاں سے لایا جائے؟

ہمدرد کا کام محض خبر دے دینا نہ تھا، رہنمائی کرنا بھی تھا۔ رہنما کا قلب مضطرب کہ خبر دینے کے ساتھ ہی رہنمائی کا بھی حق پورا پورا ادا کر دیا جائے، لیکن دماغ بیدار و خبردار، کہ مجالس کے آئین و ضوابط کے حدود سے قدم باہر نہ نکلیں۔ خبر کے ساتھ جو نوٹ نکلا، اس کی عبارت ابھی ختم کہاں ہوئی، یہ بھی تو تھی:۔

"ہمیں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد صدر خلافت کمیٹی کی اجازت کا انتظار ہے جوں ہی اجازت آئی، ان شاء اللہ ہمدرد اور دیگر قومی اخبارات میں وہ تمام اطلاعیں شائع کر دی جائیں گی جو ابتک دفتر خلافت کو موصول ہوئی ہیں، جن سے ہر شخص سمجھ لے گا کہ بحمد اللہ خلافت کمیٹی بغیر کسی تذبذب یا تزلزل کے برابر اسی مسلک پر قائم ہے، جو اس نے غور و فکر کے بعد ۵ر اکتوبر ۲۴ء کو اس مسئلہ پر اپنا مسلک قرار دیا تھا۔"

مشہور تھا کہ محمد علی اور مولانا ابوالکلام میں صفائی نہیں، اُن بن کے چرچے ایک ایک کی زبان پر تھے، اس شہرت کی صحت و عدم صحت سے یہاں بحث نہیں۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ محمد علی شدید تاثر کی حالت میں بھی آئین و ضوابط کے حدود سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ غصہ میں کتنے ہی بھرے ہوں، زبان سے الفاظ کی جگہ شعلے ہی نکل رہے ہوں، آئین و ضوابط کے خلاف بہرحال نہیں جانتے تھے۔ کانپور خلافت کانفرنس کے موقع پر یاد ہوگا کہ انتہائی اشتعال کے موقع پر بھی وہ مجلس مرکزی سے قدیم اور خود خلافت کمیٹی کا الحاق توڑ دانے کے حق میں نہ تھے، بلکہ محض ووٹوں کی کثرت سے ان خطاکاروں کو شکست دینا چاہتے تھے۔ وہی صورت اس وقت بھی پیش آئی۔ جدہ کی اس خبر سے

گفت حق گر فاسقی و اہل صنم | چوں مرا خواندی اجابتہا کنم
شاد باش و فارغ و ایمن کہ من | آن کنم با تو کہ باراں در چمن

اور کسی کو ہدایت یوں کی جاتی ہے کہ ؎

حق بفرماید نہ از خواری اوست | عین تاخیر عطا یاری اوست
نالۂ مومن ہمی داریم دوست | گو تضرع کن کہ ایں اعزاز اوست
خوش ہمی آید مرا آوازِ او | واں خدایا گفتن واں رازِ او

محمد علی کے دل پر خبر پاکر کیا گزری ہوگی۔ امیدوں کا سارا قلعہ یک بیک و ہم سے زمین پر گرتا ہوا دیکھ قلب پر بجلی سی گر پڑی ہوگی! جس کی حمایت میں بڑے بڑے پرانے دوستوں، رفیقوں سے لڑ پڑے تھے، حسرت موہانی کا، مولانا عبد الماجد قادری بدایونی کا، فرنگی محل کا، ساتھ چھوڑنا پڑا تھا، جس کی خاطر اپنے پیر و مرشد تک سے جنگ پر آمادہ ہو جانا پڑا تھا، یہ وار اس کے ہاتھ سے ہوا! ——— قدرت کی نیرنگیاں اور شگوفہ کاریاں دیکھیے کہ عین جس وقت محمد علی اپنے مرشد سے جنگ پر آمادہ ہوئے، اسی وقت ان پر غیبی گولا آکر گرا! ان کا خون دل کی روشنائی سے لکھا ہوا مضمون "تقاضائے وفا" ۱۳ر جنوری کے ہمدرد (ص ۳ و ۵) میں نکلا اور ٹھیک اسی تاریخ کے پرچہ میں، نہ ایک دن آگے نہ ایک دن پیچھے، ص ۵ پر یہ ابن سعود کی اعلان ملکیت والی خبر موجود!

فطرت مسکرا رہی تھی کہ یہ بے خبر بندہ اعلان جنگ کس سے کر رہا ہے، اور واقعۃً جنگ کرنی کس سے پڑے گی! اپنا حریف و مد مقابل اس وقت سمجھ کسے رہا ہے، اور واقعی نکلے گا کون؟ ہمدرد میں خبر کے گرد سیاہ چوکھٹا سب نے دیکھا۔ ہمدرد کے مالک اور چیف ایڈیٹر

حد درجہ مضطرب تھے۔ چاہتے تھے کہ دل کھول کر سب کچھ ہمدرد میں لکھ ڈالیں۔ اور ہمدرد، خلافت کمیٹی کا نہیں، ان کا اپنا اخبار تھا، اس میں وہ لکھ ڈالنے پر پوری طرح آزاد تھے۔ پھر بھی تقاضائے احتیاط اس درجہ کا تھا کہ اپنے اخبار کے لیے بھی دل پر جبر کر کے صدر خلافت کمیٹی کی اجازت کا انتظار کرتے رہے۔

باب (۵۵)

سنہ ۱۹۲۶ء (۷)

(پھر میدان رزم۔ "پنجابی ٹولی")

سنہ ۱۹۲۶ء۔ مہینہ فروری یا مارچ کا ہے۔ اور محمد علی سے "غیر مقلد" مقلدین ابن سعود کی مخالفت خوب زوروں پر ہے۔ اخباروں میں سب سے پیش پیش مولانا ظفر علی خاں کا روزنامہ زمیندار ہے، اس کے ایڈیٹر مہر صاحب ہیں۔ دہلی میں مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ حکیم اجمل خاں صاحب کے مکان پر ہو رہا ہے۔ میں حسب معمول دریاباد سے چل کر حاضر ہوا ہوں۔ محمد علی آجکل بیمار اور زیادہ بیمار ہیں۔ لیکن اس ضعف و علالت شدید کے باوجود اپنے کو جلسہ میں کسی طرح لے آئے ہیں، اور ایک کوچ پر لیٹے ہوئے ہیں۔ جلسہ میں کوئی تجویز پیش ہوئی، اور بڑی گرما گرم بحث کے بعد، صدر (مولانا ابوالکلام) نے ووٹ لینے کا حکم دیا۔ "پنجابی ٹولی" (یہ لقب محمد علی ہی کا دیا ہوا تھا) نے فیصلہ سے ناراض ہو کر "واک آؤٹ" (بطور احتجاج جلسہ چھوڑ دینا) کرنا چاہا۔ سب سے پہلے خود مولانا ظفر علی خاں اٹھے، اور پھر ان کے صاحبزادہ اختر علی خاں اور پھر زمیندار کے نفس ناطقہ مہر صاحب۔ ادھر ان تینوں صاحبوں کا اٹھنا تھا کہ ادھر بیمار و ناتوان محمد علی بھی جھٹ اپنے کوچ پر اٹھ بیٹھے اور بے ساختہ بولے:

"غضب ہوا، باپ بیٹے، روح القدس تینوں خفا ہو گئے"

یہ ایک نمونہ ہے محمد علی کی برجستگی اور حاضر دماغی کا۔ غصہ میں بھرے ہوئے ہوں، رنج میں ڈوبے ہوئے ہوں، ضعیف و مضمحل ہوں، غرض یہ کہ کچھ بھی ہو، اور کسی حال میں ہوں، ذہانت ساتھ نہ چھوڑتی، اور بذلہ سنجی منہ نہ موڑتی ـــــــ غصہ کی حالت میں عقلیں ماند پڑ جاتی ساری دنیا کی دیکھیں، محمد علی کی ذہانت ایسے موقع پر اور چمک جاتی۔ اور برجستہ وہ سوجھ جاتی جو دوسروں کو غور و فکر کے بعد بھی نہ سوجھ پڑتی۔

زمیندار ابھی کل تک مسئلہ حجاز میں ہمدرد کا سب سے بڑا حلیف تھا، اب وہی سب سے بڑا حریف بھی بن گیا۔ ہمدرد کے لیے تو خیر، لیکن مالک ہمدرد یعنی ذات محمد علی کے لیے توہین، تحقیر، تعریض کا کوئی دقیقہ اس میں اٹھ نہ رہا ـــــــ مخالفت کے جوش و ہیجان میں حدود کا خیال رہتا ہی کس کو ہے؟

خلافت کمیٹی محمد علی کی رہنمائی میں ابتک اپنے مسلک پر مضبوطی سے قائم تھی۔ اسے نہ وہابی حنفی قضیہ سے دلچسپی، نہ قبہ نوازی و قبہ شکنی سے سروکار۔ اس کے پیش نظر تو صرف یہ مقصد اعظم تھا کہ حجاز کسی طرح بیگانوں کے تسلط سے آزاد ہو کر سارے اسلامی فرقوں کے لیے کھلا ہوا ہے۔ کسی خاص نسل و خاندان کی ذاتی یا موروثی ملکیت اسی لیے اسے بری طرح کھٹک رہی تھی۔ اور اسی کے خلاف وہ سلطان سے عہد و پیمان لے چکی تھی۔ سلطان کے اعلانِ ملکیت کے بعد وسط جنوری میں ان کے نام حسب ذیل تار مولانا ابوالکلام صدر جمعیۃ خلافت کی طرف سے روانہ ہوا:-

"ہم حیران ہیں کہ اخبارات اہل حجاز کے آپ کو بادشاہ منتخب کرنے اور نیز آپ کے اس کو قبول کر لینے کی خبریں شائع کر رہے ہیں۔ ہم متوقع تھے کہ حکومت حجاز کے مستقبل کا فیصلہ آنے والی موتمر کے ذریعہ سے ہوگا جس کو آپ نے مدعو کیا ہے۔ ہم ان غیر متوقع واقعات کے متعلق،

جس نے فکر پیدا کر دی ہے، مستند اطلاع کا تشویش کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں"۔

لب ولہجہ اس سے زیادہ نرم بلکہ مودبانہ اور کیا ہو سکتا تھا، لیکن زبان کی نرمی کہیں حقائق کی سختی کو، اور عبارت کی شیرینی کہیں واقعات کی تلخی کو بدل سکتی ہے؟ کس مُلک نے آجتک لائل کی قوت کے سامنے اپنے لشکر جرار کو بے ہتھیار کر دیا ہے؟ کس فرمانروا نے تاریخ کے طول و عرض میں کہیں بھی بے قوت انجمنوں اور محض کاغذی اور زبانی زور رکھنے والی کمیٹیوں کے ڈر سے تخت و تاج سے دست برداری کی ہے؟ فطرت بشری کبھی اتنی متواضع و خاکسار ثابت ہوئی ہے؟

سلطان نے حجاز میں کیا کچھ کیا یا نہ کیا، اس سے اس ڈائری کو کوئی واسطہ نہیں۔ یہاں تو ذکر صرف اس کا ہے کہ محمد علی پر اثر ان حالات کا کیا کیا پڑتا رہا۔

محمد علی ابھی کل تک چونکہ سلطان کے حامی و ہمدرد تھے، اس لیے "وہابی" تھے، قبہ شکن تھے، بے ادب تھے، گستاخ تھے، آستانوں اور درگاہوں کے اکھاڑ پھینکنے والے تھے۔ اور آج چونکہ سلطان پر معترض و نکتہ چین تھے، اس لیے وہی محمد علی یک بیک "بدعتی" تھے، قبہ نواز تھے، گور پرست تھے، شرک کے حامی و مددگار تھے اور تطہیر حجاز کے دشمن! ؎

تو کہے گبر مجھے، گبر مسلماں مجھکو!

یا یوں کہہ لیجئے ؎

از مذہب من گبر و مسلماں گلہ دارد!

و ز پنجۂ من چاک گریباں گلہ دارد!

سلطان کی موافقت و مخالفت دونوں میں ہندوستان کے بے شمار مسلمانوں نے حصہ لیا۔ اچھے اچھے اکابر وقت و مشاہیر عصر اول سے آخر تک یا سعودی رہے یا شریفی۔ لیکن یہ امتیاز محمد علی ہی کے حصہ میں آیا کہ فتنہ کے پہلے ہلّے میں اُن ہی کو سب نے وہابیوں کا سالار قرار دیا، اور اب ہنگامہ

کے دوسرے دور میں بھی بدعت پسندوں کے سب سے بڑے سرغنہ وہی قرار پائے! ——— یہ صلہ تھا اس عالم میں اس کا، جس نے حق کا معیار بجائے اشخاص و رجال کے مسلک اور اصول کو قرار دیا تھا۔ محمد علی نے اپنے ساتھیوں اور اپنی "پارٹی" کی اس کایا پلٹ پر، بجائے مضطرب ہونے کے سکون و اطمینان کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ

"کل جو لوگ ذاتِ ابن سعود کے ساتھ تھے وہ آج بھی ابن سعود کے ساتھ ہی ہیں، اور کل جو حق کے ساتھ تھے، وہ بحمد اللہ آج بھی حق ہی کے ساتھ ہیں"۔

دن اور تاریخ تو اب یاد نہیں، مہینہ بھی خوب ذہن میں نہیں۔ ۲۶ء کی پہلی سہ ماہی شاید ختم ہو رہی تھی، جب خلافت کی مجلس مرکزی اور مجلس عاملہ دونوں کے جلسے دہلی میں ہوئے۔ مخالفت کا ہنگامہ عین شباب پر تھا۔ جلسہ سے ایک ہی دو روز قبل ہمدرد میں ایک مضمون، خود محمد علی کے قلم سے پنجابی "سعودیوں" کے جواب میں نکلا تھا۔ مضمون میں اتفاق سے ایک ضرب المثل ایسی آگئی تھی، جس سے مولانا ظفر علی خاں کے نام نہاد نسب پر (یعنی اس نسب پر جو مخالفین میں ان کا مشہور تھا۔) صاف تعریض نکل سکتی تھی۔ جلسہ کل صبح کو تھا۔ میں شام کو دہلی پہنچ گیا تھا۔ محمد علی کئی کئی بیماریوں میں مبتلا، اور صاحب فراش۔ مسہری پر لیٹے ہوئے، میں پاس جا کر بیٹھ گیا۔ دو ہی چار باتوں کے بعد اس مضمون کا ذکر چھیڑ کے میں نے کہا کہ "خیر اور تو سب ٹھیک تھا، لیکن فلاں فقرہ سے تو صاف زد ظفر علی خاں کے نسب پر جا کر پڑتی ہے۔ حیرت سے بولے "یہ کیسے"؟ اردو کی عام مثل ہے۔ اس میں تعریض کیسی"؟ میں نے مختصر تشریح کی۔ گھبرا گئے، اور ایک شریف مسلمان کی شان سے بولے "مجھے واللہ اس تلمیح کا آج تک علم نہ تھا آپ کی زبان سے پہلی بار سن رہا ہوں"۔ پھر حسرت و تاسف کے لہجہ میں کہا کہ "اب کیا ہو سکتا ہے؟

مضمون تو چھپ چکا، معذرت چھاپوں تو بات اور زیادہ کھلتی ہے۔ اور جو ابتک میری طرح ناواقف تھے، وہ بھی واقف ہو جائیں گے" ــــــــــ یہ تھی "ضدی" محمد علی کی حق پسندی اور شرافت گستری۔ اپنی غلطی واضح ہو جانے پر ایک بار بھی میں نے محمد علی کو بات کی پچ کرتے اور معذرت میں تامل کرتے نہیں دیکھا۔ پوری کشادہ دلی کے ساتھ ایک ایک سے عذر خواہی پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اور یہی وصف ان کے مرشد مولانا عبد الباری فرنگی محلی مرحوم و مغفور میں بھی تھا۔

دوسرے دن شام کو مجلس عاملہ کا ہوا۔ پانچ سات ارکان کی ایک مختصر سی کمیٹی۔ صدر جلسہ پنجاب کے ایک نامور اہلحدیث مولوی عبد القادر صاحب قصوری۔ (انکی یہ "اہلحدیثیت" ذہن میں رکھیے) تذکرہ کمیٹی میں اسی مضمون کا آگیا۔ موصوف نے محمد علی کی ہوا خواہی کے لہجہ میں کہا کہ "زمینداری کی بدنیتی مسلّم، لیکن آپ بھی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ ابھی اسی مضمون کے فلاں فقرہ کا آخر کیا مطلب تھا۔" محمد علی بولے "مجھے اس تلمیح کی مطلق خبر اس وقت تک نہ تھی، یہ تو کل شام کو عبد الماجد دریابادی نے آکر بتایا۔ میں یہ قرآن مجید کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔" قصوری صاحب بڑے دیندار اور ذی علم تھے، بات کاٹ کر کہا "لیکن خود قرآن کی قسم کھانا بھی تو جائز نہیں۔" محمد علی بجلی کی سرعت کے ساتھ چمک کر بولے "اچھا حدیث کی قسم سہی" ــــــــــ یہ فقرہ کیوں کسی اور کو سوجھنے لگا تھا! کوئی مسکرادیا، کوئی ہنس پڑا، لطف سب نے لیا! ایسے ایسے لطیفے اور چٹکلے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، خدا جانے کتنے گویا محمد علی کی جیب میں پڑے رہتے تھے۔

باب (۵۶)

سنہ ۱۹۲۶ء (۸)

(دیوانۂ خلافت۔ "غیر مقلد مقلدینِ ابن سعود")

عملی سیاسیات سے میں علی العلوم کنارہ کش ہی رہا ہوں۔ سنہ ۲۴ء کے آخر تک میں کسی سیاسی کمیٹی کا ممبر نہ تھا۔ محض ایک تماشائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ سنہ ۲۵ء میں محمد علی ہی کی رفاقت اور کشش کھینچ کر اس حلقہ کے اندر لائی۔ شرکت کی تبلیغ زبانی گفتگوؤں میں بارہا کرتے رہے تھے۔ اکتوبر سنہ ۲۵ء میں مرکزی خلافت کمیٹی کا ممبر منتخب ہوا۔ خلافت کمیٹی کا عروج اس وقت تک ختم ہو چکا تھا۔ اس پر بھی مرکزی کی ممبری ایک بڑے اعزاز کی چیز تھی۔ نومبر سنہ ۲۵ء میں لکھنؤ کے کارکنان خلافت، خصوصاً چودھری خلیق الزماں نے، یک بیک صوبہ اودھ کی خلافت کمیٹی کی صدارت کا بار سر پر رکھ دیا۔ مرکزی کے صدر اس وقت تک حکیم اجمل خاں صاحب تھے۔ اواخر دسمبر سنہ ۲۵ء میں ان کے جانشین مولانا ابو الکلام ہوئے۔ سنہ ۲۶ء میں مرکزی کے جلسے متعدد ہوئے۔ اکثر دہلی میں اور ایک آدھ لکھنؤ میں۔ صدر دفتر بمبئی میں تھا، اور مولانا شوکت علی جنرل سکریٹری تھے۔ لیکن جلسوں کے لیے سہولت کے خیال سے کوئی مرکزی ہی مقام اختیار کیا جاتا تھا۔ تقریباً ہر جلسہ میں شرکت کا اتفاق ہوا، اور اس پر قوت اور اسلامی ہند کے عظیم الشان ادارہ کی کارفرمائیوں کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔

محمد علی کی حیثیت ضابطہ سے بس ایک ممبر کی تھی۔ نہ صدر تھے، نہ سکریٹری نہ اور کچھ۔ لیکن عملاً ساری مجلس کی رہنمائی کی باگ، دیکھنے میں آیا کہ ان ہی کے ہاتھ میں تھی، اصول میں بھی، فروع میں بھی۔ یعنی جمعیۃ کا مسلک عمومی (پالیسی) بھی وہی مقرر کرتے تھے، اور پھر اس کے بڑے بڑے جزئیات بھی ان ہی کے چلائے ہوئے چلتے تھے۔ یہ نہیں کہ وہ اوروں کی سنتے نہ ہوں۔ اور یہ تو اور بھی نہیں، کہ لوگ ان کے سوا کسی اور کی سنتے نہ ہوں، یا ممبر صاحبان سب اپنی اپنی سناتے نہ ہوں۔ بلکہ سب سر جھکائے چپکے سے ان کی ہر بات کو مان لیتے، یا کم از کم یہ کہ ادب و احترام کے ساتھ سن ہی لیتے ہوں۔ جی نہیں، یہ کہاں؟ اس کے بالکل برعکس، اور توقع و انداز سے کے برخلاف، ان آنکھوں نے تو یہ دیکھا کہ ان کی مخالفت بات بات پر ہو رہی ہے، اور ان کی راہ میں رکاوٹ قدم قدم پر پیش کی جا رہی ہے۔ لیکن اب ان کی زبردست قوت استدلال کا کرشمہ سمجھئے، یا ان کی حق گوئی دیانت کا ثمرہ کہیے، یا ان کی وجاہت و شخصیت کا اثر قرار دیجیے۔ بہر حال ہوتا بالآخر عموماً وہی تھا، جو ان کی رائے ہوتی، اور رہنمائی تقریباً ہر موقع پر ان ہی کی صحیح قرار پاتی ــــــ جمعیۃ خلافت کا روح رواں، عرف عام میں شوکت علی کو سمجھا جاتا تھا، اور یہ ایک حد تک صحیح بھی تھا۔ ضابطہ سے سکریٹری بھی وہی تھے۔ لیکن اسی سنہ ۲۲ء میں مرکزی کے جلسے ایسے بھی ہوئے جن میں شرکت تک سے مولانا شوکت علی معذور رہے (ایک بار تو ہندوستان کے باہر برما اسی خلافت ہی کے کام سے گئے ہوئے تھے) اور اس سے جلسہ میں کوئی خاص فرق محسوس ہی نہ ہونے پایا۔ برخلاف اس کے محمد علی کے بغیر مرکزی کا کوئی جلسہ قابل عمل، تو کیا ہوتا، قابل تصور بھی مشکل ہی سے تھا! بغیر ان کے محفل سونی، جلسہ میں سناٹا۔ ادھر یہ آئے اور ادھر جیسے جلسہ میں جان پڑ گئی اور اداسی اور افسردگی کی جگہ رونق، تازگی، شگفتگی اور چہل پہل نے لے لی۔ زبان پر قابو،

دل کے جذبات نے باقی ہی کب رہنے دیا تھا۔ جو کچھ جس کے متعلق دل میں ہوتا، سب بے دھڑک، بے جھجھک زبان پر لے آتے، اور اس میں لحاظ نہ دوسروں کے جذبات کا رکھتے نہ اپنے وقار کا، وقت ایسے موقع پر سب سے بڑھ کر غریب صدر جلسہ کو پیش آتی تھی۔ نہ یہ ہمت کہ محمد علی کو بولنے سے روکے، نہ اس کی سکت کہ جو کچھ محمد علی چاہیں، وہ انھیں کہہ لینے دے۔

یہ اثر و اقتدار خود بخود یا زبردستی نہیں پیدا ہو گیا تھا۔ محمد علی، تحریک خلافت کے پیچھے، اس کے نظام مجلس کے پیچھے، اپنے کو فنا بھی تو کیے ہوئے تھے۔ کانپور کے جلسہ عام میں دیکھا، لکھنؤ کے جلسہ عام میں دیکھا، اور دہلی، کانپور، لکھنؤ کے مرکزی جلسوں میں بارہا دیکھا کہ فلاں اور فلاں لیڈر صاحبان، اور حد یہ ہے کہ خود صدر صاحب اچھے خاصے ہٹے کٹے، اپنے کمرہ میں یا اپنے خیمہ میں خوش گپیاں فرما رہے ہیں اور چند قدم اٹھ کر جلسہ میں تشریف نہیں لا رہے ہیں! خیالی علالتوں کا بنا بنایا عذر ایسے موقع پر خوب کام دے جاتا تھا ——— محمد علی غریب کے لیے ایسی کوئی صورت ممکن ہی نہ تھی۔ خود بیمار ہوں، محبوب ترین عزیز یا عزیزہ بیمار ہو، جلسہ کا وقت شدید سردی میں آدھی رات کا ہو، سخت گرمی میں ٹھیک دوپہر کا ہو، بہرحال جلسہ میں پہنچ ہی جاتے۔ بیماری میں صاحبِ فراش ہو گئے، تو جلسہ یا تو گھر ہی پر طلب کرا لیا، یا پھر جلسہ گاہ تک کسی طرح گرتے پڑتے پہنچ، کوچ پر لیٹ گئے، پیسہ پاس نہ ہوا، تو کہیں سے قرض وام کر کے ریل کا کرایہ دیا۔ لیکن پہنچے ضرور، اور غیر حاضری نہ ہونے دی ——— اتنی فنائیت، یہ اخلاص مندی کہیں بالا بالا جا سکتی تھی؟ اس کا اثر دوسروں پر کیسے نہ پڑتا۔ موافقین کو چھوڑیے، مخالفین تک اس سے غیر متاثر نہ رہتے۔

فرنگی محل اب ساتھ تھا۔ گو مولانا عبد الباریؒ کے اٹھ جانے کے بعد اب فرنگی محل خود

ایک جسدِ بے روح تھا۔ مولانا عبد الماجد قادری بدایونی، حسرت موہانی اور بہت سے بچھڑے ہوئے دوست اب پھر آملے تھے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں خدا جانے کتنے اور جڑے ہوئے دل اب ادھر سے ٹوٹ بھی چکے تھے۔ اسلامی ہند قضیۂ نجد و حجاز کو ابتک حرب عقائد کا ذریعہ بنائے ہوئے تھا۔ محمد علی نے لاکھ سمجھایا۔ ملکیت و جمہوریت کی بحث کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتی تھی۔ بس گھوم پھر کر وہی وہابیت اور ہدم مزارات کا قصہ۔ محمد علی نے سلطان کا ساتھ یہ سمجھ کر دیا تھا کہ وہ جمہوریۂ اسلامی قائم کریں گے۔ اور اب جو ساتھ چھوڑا وہ اس لیے کہ وہ توقع باطل ثابت ہوئی۔ پہلے ہندوستان کے اہل حدیث خوش ہوئے تھے اور مشائخ ناراض۔ اب مشائخ کی خوشی کی باری تھی اور اہل حدیث کی خفگی کی۔ اس وقت خفگی میں سب سے پیش پیش پنجاب تھا۔ مرکزی کے جلسوں میں ارکان پنجاب خاصی بڑی تعداد میں متحد و متفق ہو کر آتے، اور بزم میں جلوہ اچھا خاصہ میدان رزم کا نظر آجاتا۔

ایک روز جلسۂ مرکزی سے قبل شام کو دہلی پہنچا۔ محمد علی پلنگ پر لیٹے ہوئے بیماری سے کراہ رہے تھے۔ پنجاب کے مشہور لیڈر مولوی ظفر علی خاں صاحب کے رویہ سے شدید بیزاری کا اظہار تلخ و تند لہجہ میں ہمدردوں میں کر چکے تھے۔ میری ہمت تنہا عرض کرنے کی تو پڑتی بھی نہیں نے ڈاکٹر سید محمود[1] اور مولینا محمد عرفان[2] اور مولانا حسین احمد صاحب کو پہلے سے ہموار کر کے انھیں اپنے ساتھ لے لیا اور ان کی تائید کے ساتھ، ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ "اتنی سختی مناسب نہیں، جبکہ آپ کی تحریک خلافت خود ہی اتنی سست پڑ چکی ہے۔ اور لوگ خود ہی ساتھ

---

[1] موجودہ وزیر صوبہ بہار۔ اس وقت تک تحریک خلافت کے صف اول کے لیڈروں میں تھے۔ (جنوری ۱۹۵۲ء)

[2] ان کا نام بھی ان صفحات میں بار بار آرہا ہے۔ محمد علی کے مخلص ترین رفیقوں میں تھے۔ ہزارہ (صوبہ سرحد) کے باشندہ۔ اس وقت جمعیۃ العلماء (دہلی) کے رکن رکین اور غالباً سکریٹری تھے۔ بعد کو بمبئی منتقل ہوئے۔ اور مرکزی خلافت کمیٹی کے سکریٹری ہوئے تھے۔ اب مدت ہوئی مرحوم ہو چکے ہیں۔

چھوڑتے جا رہے ہیں"۔ محمد علی ان سب کے خلوص کے قائل تھے۔ اور مولانا حسین احمد صاحب کے تو اس وقت تک معتقد ہی تھے۔ لیکن اب ان کا جوش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھے تو جواب کچھ یوں ہی سا سرسری دیا۔ لیکن مولانا پر ابل ہی پڑے۔ لیٹے سے اٹھ بیٹھے۔ اور چمک کر بولے:۔

"مولانا آپ نائب رسول ہو کر مجھے مشورہ نرمی یا مداہنت کا دے رہے ہیں! میں مداہنت برتوں قوم کے غداروں کے ساتھ؟ کیا آپ ہی نے اپنے وعظوں میں بارہا حضرت عمرؓ کا یہ اسوۂ حسنہ بیان نہیں فرمایا ہے کہ انھوں نے عین معرکۂ جہاد و قتال میں مسلمانوں کے سب سے بڑے سپہ سالار خالدؓ بن ولید صحابی رسول کو ایک دم سے معزول کر دیا؟ آپ کے اصول پر تو خلیفہ ثانی کی بھی یہ سختی اور بیجا سختی تھی۔ میں مرتے مرتے مر جاؤں گا لیکن کسی کو کسی مصلحت سے بھی قومی غداری پر معاف نہیں کرونگا۔ سب میرا ساتھ آج چھوڑ دیں۔ میں نے کام ساتھیوں کے بھروسہ پر نہیں، اللہ کے بھروسہ پر شروع کیا تھا۔ اسے منظور ہوگا تو وہ نئے ساتھی پیدا کر دیگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں دینی مصلحت سے مداہنت برتنے لگوں جسم کا جو عضو فاسد ہو جائے، اسے کاٹ ہی ڈالنا چاہیے"۔

یہ آوازۂ حق سن، سب دم بخود ہو گئے ——— یہاں اس حکایت کے نقل کرنے سے مقصود یہ نہیں کہ محمد علی کی رائے خواہ مخواہ صحیح و صائب ہی تھی۔ مقصود صرف انکی حرارت ایمانی اور جذبۂ دینی کو دکھانا ہے۔ ظفر علی خان بھی علیگڈھ ہی کے گریجویٹ تھے، اور مولانا شوکت علی کے ہم سبق۔ محمد علی کا انکا پرانا یارانہ۔ محمد علی انھیں عزیز ہی نہیں، اپنے بڑے بھائی کی جگہ پر سمجھتے تھے۔ لیکن جہاں معاملہ مفاد ملت و فلاح امت کا آیا، محمد علی نے آنکھیں ہر ذاتی دوستی و مروت کی طرف سے پھیر لیں۔ جس چیز کو انھوں نے حق سمجھ لیا بس اسکے آگے کوئی نہ ان کا دوست تھا نہ عزیز ——— جو شخص اس غم اور ان فکروں میں ہر وقت گھلتا رہتا ہو، وہ جی کب تک سکتا تھا؟ خلاف توقع اور حیرت انگیز اس کا جلد مر جانا نہیں، بلکہ اتنے دنوں تک جیتا رہنا تھا!

باب (۵۷)

سنہ ۱۹۲۶ء (۹)

(سیرت کے اصلی جوہر)

ایک روز دوپہر کا کھانا ہو رہا تھا۔ دستر خوان پر کئی عالم و فاضل اور متعدد بزرگانِ ملت، سب اس وقت تک محمد علی کے مخلص اور بے تکلف جمع تھے۔ اور ایسا اجتماع محمد علی کے دستر خوان کے لیے کچھ انوکھا نہ تھا۔ مسئلہ تصویر کشی اور فوٹو گرافی کا چھڑا۔ محمد علی مسائلِ فقہ میں حنفی تھے۔ لیکن "مقلد" ہونے کے باوجود حقِ اجتہاد اپنے لیے اور ہر مسلمان کے لیے بھی محفوظ رکھتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ

"کسی ماہرِ خصوصی (اسپشلسٹ) کے قائل و معتقد ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اسے محفوظ عن الخطا سمجھ لیا جائے، اور اس کے ہر ہر جزئیہ پر یکساں ایمان لانا لازم رہے۔ یہ تقلید تقلید جامد ہے۔ امام ابو حنیفہ بیشک بہت بڑے فاضل، بہت بڑے مجتہد، بڑے زیرک و دانا، عاقل و فہیم تھے۔ لیکن باوجود اس کے ہو سکتا ہے کہ جہاں ہزار میں سے ۹۹۹ مسائل میں ان ہی کا اجتہاد صحیح ہوگا، وہاں ہزارویں مسئلہ میں مجھ جیسے عامی کا۔ معصوم و غیر خاطی ہونا تو صرف رسول کی شان ہے۔"

خیر معاملہ اس عقیدہ ہی تک رہتا تو غنیمت تھا۔ لیکن محمد علی عمل میں بھی متعدد مسائل

ہیں اپنی ذاتی تحقیق و اجتہاد پر کاربند تھے۔ اور ان ہی میں سے ایک مسئلہ تصویر کا بھی تھا۔ تصویروں کے بڑے شایق تھے، اور شایق ہی نہیں، نقاد و مبصر بھی تھے۔ "آرٹ" کی اس شاخ (مصوری و نقاشی) پر ایسی مبصرانہ تنقید کرتے کہ اچھے اچھے ماہرینِ فن پھڑک اٹھتے۔ سب کمروں میں تصویریں لگا رکھی تھیں بعض بڑی بڑی قیمتی بھی۔ اور ڈرائنگ روم تو پورا نگارخانہ ہی تھا۔ یہاں تک کہ انگریزی مذاق کے ماتحت بعض تصویریں نیم عریاں بھی ——— محمد علی کے تذکرہ میں یہ کبھی نہ بھولیے کہ وہ اتنے جوشِ دینی اور جذبۂ ایمانی کے باوجود بہرحال تھے علیگڈھ اور آکسفوڈ کے گریجویٹ، اور سالہاسال کی مدت دونوں جگہ گزارے ہوئے۔ ———

"صاحبانہ" مذاق کے دوسرے لوگ ایسی تصویریں اپنے نج کے کمرہ (خواب گاہ یا بڈ روم) میں لگاتے ہیں۔ محمد علی کے ہاں چرانے چھپانے کا گزر کہاں۔ رازداری و اخفاء کی تو کوئی مدہی ان کے ہاں نہ تھی۔ عیب و ہنر جو شے بھی تھی، کھلے خزانہ اور علانیہ رہتی۔ یہ تصویریں بھی ان کے دفتر کے کمرہ اور ڈرائنگ روم میں لگی رہتیں۔ اور ان پر ہر آیند و روند کی نظر پڑتی رہتی۔ تصویروں کے اس فاحشانہ پہلو پر جب کبھی میں کچھ عرض کرتا، تو محمد علی برابر یہ کہہ کر میری زبان بند کر دینے کی کوشش کرتے، کہ

"یہ تصویریں بھی کیا کسی بیسوا یا ایکٹرس کی ہیں؟ یہ تو فلاں فلاں تاریخی شخصیتوں کی ہیں۔ فلاں تصویر کے ذریعہ سے فلاں اہم واقعہ کو ظاہر کیا گیا ہے، فلاں تصویر فلاں اہم موقع کی ہے۔ ہرگز ان میں جذباتِ شہوانی کے بھڑکانے کا کوئی پہلو نہیں۔ یہ تو آرٹ (فن کاری) کے بہترین نمونے ہیں۔"

دہلی میرا جب جانا ہوتا، ایک آدھ جھڑپ اسی مسئلہ تصاویر پر ہو جاتی۔ فقہاء کے

دلائل اور اصولِ فقہ کے باقاعدہ مطالعہ کا موقع تو انھیں کبھی ملا نہ تھا لیکن میرے "تقلیدی" معروضات کے جواب میں اپنی ذہانت کے زور سے کچھ نہ کچھ "اجتہادات" کر دیتے، اور حدیث جب میں کوئی پیش کرتا، تو اس کی بھی کوئی نہ کوئی تاویل کر دیتے۔ غرض میری ایک نہ مانتے۔ اور ان کا یہ معاملہ تنہا مجھ عامی ہی کے ساتھ نہ تھا، جن لوگوں کے علم و فضل کے وہ قائل و معترف تھے، مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی، ان کے ساتھ بھی یہی حال تھا ——— ہاں تو جس روز دسترخوان پر یہ منتخب مجمع جمع تھا، میں نے چھیڑ کر یہی مسئلہ نکالا۔ گفتگو بڑھی۔ محمد علی کیا چپ ہونے والے تھے۔ سب سے مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک ایک کو جواب دے رہے تھے۔ بازی ہرتی ہوئی دیکھ میں نے عرض کیا کہ

"اچھا جائز ناجائز کی بحث چھوڑیے، مباح و حرام کو جانے دیجئے۔ اس پہلو کو لیجیے کہ جن لوگوں کی آپ دل سے عزت و حرمت کرتے ہیں، انھیں آپ کے اس عمل سے تکلیف اور ناگواری ہوتی ہے۔ بس ان کی رفعِ اذیت ہی کے خیال سے اسے ترک کر دیجئے۔"

بولے "اتنی خاطر تو بس مجھے اِن مولانا (حسین احمد صاحب) کی عزیز ہے"۔ ان سے نہایت درجہ محبت و یگانگت اس وقت تک تھی۔ کراچی حوالات اور جیل میں ان کا ساتھ ۲۱ء میں رہ چکا تھا۔ ان کی زندگی سے بہت متاثر تھے۔ میں نے عرض کیا کہ "اچھا، مولانا ہی کی خاطر سے"۔ فرمایا،

"ہاں منظور۔ لیکن وہ بھی اپنی زبان سے یہی کہہ دیں۔ فقہی دلائل وغیرہ نہ پیش کریں۔ وہ مجھے معلوم ہیں۔ میں جوابات دینا شروع کر دوں گا۔ بس صرف اتنا کہہ دیں کہ میری خاطر سے انھیں اتار دو"۔

مولانا کو اس کارِ خیر یا کلمۂ خیر میں کیا تامل ہو سکتا تھا۔ زبان سے وہی فقرہ فرما دیا۔

اور بیسیوں تصویریں، صدہا نہیں شاید ہزارہا کی مجموعی قیمت کی، کیسی کیسی نفیس و شاندار، اسی آن کمرہ کی دیواروں سے اتر گئیں! ——— یہ نہ پوچھیے کہ کس دل سے محمد علی نے انکے اتارنے کا حکم دیا۔ اور اس میں کتنا شدید مجاہدہ ان کے نفس کو کرنا پڑا۔ لیکن بہر حال تھے قول کے پکے۔ زبان دے چکے تھے۔ جو کہا تھا، پورا کر دکھایا۔

خط و کتابت محمد علی سے، پابندی کے ساتھ جاری نہ تھی۔ خط ان کے دلچسپ اور پر مغز سب ہوتے۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ لیکن آتے ہی بہت کم۔ پابندی کے ساتھ جواب دینا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ وقت ہی اتنا بیچارہ کو کب نصیب ہوتا۔ مختصر لکھنے کی عادت نہیں، مفصل لکھنے کی فرصت نہیں۔ بس اسی میں خطوط کے جوابات ٹلتے رہتے۔ فروری ۲۶ء میں کئی باتیں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ خط لکھنا ناگزیر ہو گیا ——— ہندوستانی اکیڈمی کے نام سے ایک نیا ادارہ صوبہ حکومت کی سرپرستی میں نیا نیا کھل رہا تھا۔ ارکان اردو اور ہندی دونوں کے اچھے اچھے لکھنے والے منتخب ہو رہے تھے۔ ایک سوال تو اس کے متعلق کرنا تھا۔ کہ اس سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ کی ممبری قبول کرنے کے باب میں آپ کا کیا حکم ہے؟ اگر میں نے انکار کیا۔ تو کوئی گورنمنٹی آدمی منتخب ہو جائے گا، جگہ تو بہر حال خالی رہے گی نہیں۔ دوسرے اودھ خلافت کمیٹی کے بارہ میں لکھنا تھا کہ ابتک اس کی سب چیزیں فرنگی محل کے قبضہ میں ہیں، ان حضرات کو لکھیے کہ ہم لوگوں (جدید عہدیداروں) کے حوالہ کر دیں۔ تیسرے ہمدرد کے اسٹاف کے ایک نوجوان کے لیے عرض کرنا تھا کہ حکیم اجمل خاں کے ذریعہ سے انھیں یورپ جانے کے لیے حیدر آباد سے سرکاری وظیفہ دلوا دیجئے ——— خط گیا، اور جواب مولانا کے بھانجے عثمان علی خان جنرل منیجر ہمدرد و ہمدرد پریس کے ہاتھ کا لکھا ہوا موصول ہوا:۔

۱۳؍ فروری ۲۶ء کوچہ چیلاں۔ دہلی۔

محترم مولانا صاحب۔ السلام علیکم۔

گرامی نامہ ماموں صاحب قبلہ کے نام موصول ہوا۔ ۱۱؍ فروری سے صاحب فراش ہیں۔ بخار رہتا ہے۔ ہلکا ہو جاتا ہے مگر اترتا بالکل نہیں۔ اپنے آپ خط لکھنے سے معذور ہیں۔ اس لیے میں ماموں صاحب کی جانب سے لکھتا ہوں۔

(۱) دنیا میں اگر کوئی چیز ہے جو انسان کو اس کے مصداق بنائے تو وہ اصول پرستی ہے ہم نے بہت سی چیزیں اسی اصول پرستی کی وجہ سے چھوڑ دیں۔ یہ چیزیں ہمارے لیے Temptations[1] ہیں۔ ان ہی سے ہم کو بچنا ہے۔

ان ہی کو چھوڑ کر ہم نے دیگر معاملات میں نااہلوں کو جگہ لینے دی۔ پھر اگر آج نا اہل مسلط ہو جائیں گے تو کیا ہے۔ بالکل شراب کی سی حالت ہے۔ نفع سے زیادہ مضرت اس میں ہے۔ لہٰذا کنارہ کشی ہی بہتر ہے۔ یہ میری صرف رائے ہے۔ "حکم" صرف خدا کے لیے زیبا ہے۔

(۲) خلافت کمیٹی کے متعلق قطب میاں کو خط جا رہا ہے۔

(۳) .... کے متعلق میرا تجربہ یہ ہے کہ وہ حریص زیادہ ہیں۔ جس منزل پر آپ کو وہ پہنچانا چاہتے ہیں، اس کی اہلیت بالکل نہیں۔ صرف خواہش سے کام نہیں چل سکتا۔ حکیم صاحب کا حیدر آباد میں کوئی خاص اثر نہیں۔ البتہ اگر میں مجبور کر دوں تو ضرور لکھ دیں گے۔ مگر میرے لیے یہ ایک قسم کا جھوٹ بولنا ہوگا، جسے میں جائز نہیں رکھتا۔ ابتک جو مواقع آئے، میں نے ان کو کچھ ترقی کرتے نہیں پایا۔ ابتک مزاج میں لڑکپن ہے۔ کامن سنس[2] بالکل نہیں جس سے کچھ کام لیں۔ مواد جمع کر دیا جائے، جیسا بھی اخذ نہیں کرتے۔ شام کے متعلق ان کو کچھ کنگرز دیے تھے

---

[1] ترغیبات۔ فتنہ یا جال۔ "ہم" سے مراد اس سیاق میں نادمان خلافت و تارکین موالات ہیں۔ [2] فہم سلیم

تمام پوائنٹس بتلا دیے تھے، مگر جب مضمون لکھ کر لائے تو کچھ بھی نہ تھا۔ چنانچہ خود ایک مضمون لکھکر بتا دیا کہ اس نہج پر لکھو، مگر پھر بھی ابتک مکمل مضمون نہ دے سکے، دو مرتبہ مضامین پھیر چکا۔ اب تیسری مرتبہ لائے تو ہیں بیماری کے سبب نہ دیکھ سکا۔ آج کسی وقت دیکھوں گا، بشرطیکہ بقیہ مضمون انھوں نے دیدیا۔ میں ان کی ترقی کا خواہاں ہوں اور دل سے، مگر آپ جانتے ہیں کہ جرنلزم (صحافت) کے لیے صرف قلم ہی درکار نہیں، اس کے لیے جو باتیں درکار ہیں وہ آپ پر بخوبی روشن ہیں۔ اس لیے کہ آپ خود بھی اس خارستان کے بادیہ پیما ہیں۔ دعا کیجئے کہ خدا ہم سبھوں کو صراط مستقیم پر قائم رکھے۔

محمد علی"
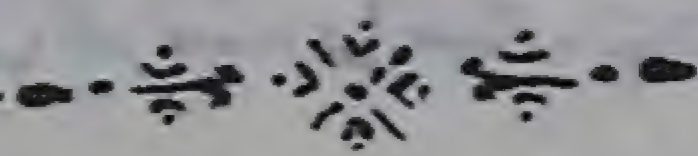
باب (۵۸)

سنہ ۱۹۲۶ء (۱۰)

(حج اور وفد خلافت)

مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے اس زمانہ میں جلد جلد ہوتے رہتے، اور اپنی شرکت بھی ان میں برابر ہوتی رہتی۔ مسئلہ حجاز کل دوسرے مسئلوں پر غالب رہتا۔ ارکان کی تقسیم سلطان ابن سعود کے عقائد کی موافقت یا مخالفت کی بنا پر گویا دو مخالف کیمپوں میں ہو چکی تھی۔ جو ارکان عقیدۃً "قبہ نواز و بدعات دوست تھے، ان میں سے کچھ تو اب باقاعدہ الگ ہو چکے تھے، اور کچھ عملاً کنارہ کشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ جو عقیدۃً "قبہ شکن تھے، اب ان ہی کا دورہ دورہ تھا۔ اور وہ زور و قوت کے ساتھ جلسوں میں شریک ہو رہے تھے۔ ان کی سرداری و علمبرداری کا شرف خاک پنجاب کے حصہ میں آیا۔ محمد علی کی زبان پر ان حضرات کے لیے ایک دلچسپ نام "غیر مقلد مقلدین ابن سعود" تھا۔ اسی لقب سے انھیں اکثر اپنی تحریروں تقریروں میں یاد کیا کرتے۔ اس گروہ کا کہنا یہ تھا کہ سلطان سے بہتر حکمران حجاز کو اور کون مل سکتا ہے۔ اس قدر متبع شریعت، ایسا متمسک بالکتاب والسنۃ، ایسا قامع بدعات! محمد علی کا جواب ہمیشہ یہ ہوتا تھا، اور ان کے اس دعویٰ کی تردید کسی سے کیے نہ ہو پاتی تھی کہ "تمھارا قامع بدعات خود ہی سب سے بڑی بدعت میں مبتلا ہے، اور وہ بدعت ملکیت یا بادشاہت

کی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی اور معروف بدعتوں کو مٹاتا ہے، جن کا بدعت ہونا ہی اکثر صورتوں میں مختلف فیہ ہے۔ لیکن جو بدعت بالکل مسلّم اور ان سب سے کہیں بڑھی ہوئی ہے، یعنی شوریٰ اور جمہوریت کے بغیر شخصی ونسلی حکومت قاہرہ، اسے وہ زندہ کیے ہوئے ہے۔ حجاز سارے عالم اسلامی کا ہے۔ اور اس کی خدمت کا حقدار صرف وہی ہے جو سارے عالم اسلامی کے مشورہ و انتخاب سے، ملت اسلامی کے نائب و نمایندہ کی حیثیت سے تخت نشین ہو، اور فرقہ وارانہ غلو سے خالی الذہن ہو کر سارے عالم اسلامی کے لیے یکساں سہولتیں بہم پہنچائے۔ اس کے خلاف کرنا، خلفائے راشدین کی سنت سے تمسک کرنا نہیں، بلکہ قیصر و کسریٰ کے طریقوں کی پیروی کرنا ہے۔"

بیت اللہ و روضۂ رسول کی حاضری کی جو تڑپ محمد علی کے دل میں تھی، اسے یا تو وہ خود جانتے تھے یا دلوں کے بھیدوں کا جاننے والا۔ لیکن بظاہر یہ بات حیرت انگیز تھی کہ اس ذوق و شوق، اس عشق و محبت، اس سوز و گداز کے باوجود یہ شیدائے اسلام و عاشق رسول ؐ ابھی تک حج و زیارت کی طرف سے غافل تھا۔ ۲۳ء میں جب جیل سے چھوٹنے کے بعد بھوالی پہاڑ پر اپنی بیمار لڑکی کو لیے ہوئے پڑے تھے، تو اس وقت ایک موقع پر میں نے کھل کر عرض کیا کہ حضرت، کیا حج و زیارت کا ارادہ ابھی نہیں؟ جواب ایک حسرت ناک لہجہ میں اور آہ سرد کے ساتھ یہ ملا تھا کہ "کیا جاؤں! کچھ تو وہاں کے لیے کام کر لوں، جب جاؤں۔ ابھی کیا منہ لیکر جاؤں۔ خانۂ خدا اور آرام گاہ رسول ؐ پر اغیار کا قبضہ! ذرا انھیں آزاد کرا لوں، جب جانے کا کچھ لطف بھی ہے۔" ——— آزادی حجاز کا جنون ایک عمر کا جنون رہا!

"تطہیر" حجاز کی خبریں اب حد تواتر کو پہنچ چکی تھیں۔ اخبارات میں روزانہ سرخیاں اسی کی ہوتی تھیں۔ کم از کم برطانیہ کے حلیف شریفیوں کی حکومت تو اب حجاز سے اٹھ ہی چکی تھی۔ اپریل ۲۶ء میں محمد علی حج کا تہیہ کر بیٹھے، اور ہمدرد میں اس کا اعلان بھی کر دیا۔ وسط اپریل میں مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ دہلی میں ہوا، اور محمد علی ہی کے مکان پر۔ اس نے موتمر اسلامی کے لیے جس کی دعوت سلطان کی طرف سے اسی حج کے موقع کے لیے موصول ہو چکی تھی، اپنا ایک نمایندہ محمد علی کو بھی منتخب کیا۔ موتمر نے خلافت کمیٹی سے کل چار نمایندے طلب کیے تھے۔ جلسہ میں نام متعدد اشخاص کے پیش ہوئے، لیکن آخر میں جب رائے شماری ہوئی تو کامیابوں میں شوکت علی اور مولانا سید سلیمان ندوی اور شعیب قریشی کے ساتھ ایک نام محمد علی کا بھی تھا۔ ارکان مجلس میں سے حاضر غالباً ۵۴ سے زاید نہ تھے۔ پنجاب کے ۱۴، ۱۵ اجمبر محمد علی کی شدید مخالفت میں متفق و متحد، اس لیے خیال یہ ہو رہا تھا کہ محمد علی کا انتخاب شاید ہی ہو سکے۔ لیکن انتخاب نہ صرف یہ ہوا، بلکہ بڑی اکثریت کے ساتھ ہوا۔ اور محمد علی نے اپنے اور اپنے بھائی کی طرف سے سرجلسہ اعلان کیا کہ چونکہ ہم لوگ حج فرض ادا کرنے جا رہے ہیں، اس لیے نمایندگی موتمر اسلامی کے لیے اپنے سفر حجاز کے مصارف کا بار خلافت کمیٹی پر نہ ڈالیں گے، اور اپنے ہی مصارف سے جائیں گے ——— یہ تھا وہ محمد علی جسے بعض خوش ظرف معاصرین نے پیسہ کا حریص بھی قرار دیا تھا!

اولوالعزمی محمد علی کی سرشت میں تھی۔ (دوسرے لوگ اسے اسراف سے تعبیر کرتے تھے) حج و زیارت کو چلے تو تنہا نہیں، بیوی کو بھی ہمراہ لیا۔ اپنی بیگم سے محمد علی کو نہایت درجہ محبت تھی۔ پہلے سے بھی قریب کی عزیزہ تھیں، اور محبت شادی کے قبل ہی پیدا ہو چکی تھی (خدا نخواستہ

کسی ناجائز معنی میں نہیں) جوانی بھر عشق کی سی کیفیت رہی۔ سن اتر نے پر محمد علی کہا کرتے تھے، کہ "قبل از وقت ناکارہ سا ہو گیا ہوں، لیکن بیوی کی محبت بجائے گھٹنے کے اور بڑھ گئی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ کوئی بھی سفر انھیں ساتھ لیے بغیر نہ کروں"۔ بہر حال انھیں بھی ساتھ لیا، اور دوہرے مصارف گوارا کیے۔ خود اپنے ہی مصارف کے لیے خدا معلوم کیا سبیل سوچی تھی، چہ جائیکہ یہ دہرے اخراجات! ——— عطیے اور نذرانے، کم از کم نقد کی شکل میں محمد علی اپنے محبوں اور مخلصوں سے بھی، بڑی مشکل سے قبول کرتے تھے۔ اس موقع پر ایک آدھ عالی ہمت مخلص نے، اختلاف مسلک کے باوجود، نقدی سے کچھ خدمت کی، اور ایک حقیر سی رقم کا نذرانہ اس نامہ سیاہ نے بھی پیش کیا، جسے شرف قبول بخشا گیا۔ ۱۰ رمئی کو یہ گرامی نامہ خود محمد علی کے ہاتھ کا نہیں، بلکہ منور علی خاں صاحب رام پوری (جو مولانا کے بزرگ عزیز ہونے کے علاوہ دفتر ہمدرد کے خزانچی بھی تھے) کے ہاتھ کا لکھا ہوا وصول ہوا:۔

دہلی ۸ رمئی ۲۶ء

برادرم۔ السلام علیکم

احمد آباد گیا ہوا تھا۔ پرسوں آیا ہوں۔ آپ کا خط اور .... روپیہ ملے۔ مرض کی حالت میں اب پہلے سے فرق ہے۔ مگر تنہا ہوں، ہر طرح کا کام خود ہی کر رہا ہوں۔ سفر حج کی فکر علیحدہ۔ گھر کی فکر میں جدا گانہ۔ آپ کی محبت کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ۱۰ رمئی کو ارادۂ روانگی ہے۔ اللہ تعالیٰ بخیر پہنچائے۔ آپ کا نام میں نے یادداشت میں لکھ لیا ہے۔ خانۂ کعبہ میں ضرور دعا کروں گا۔ اور مدینۂ پاک میں سلام عرض کر دوں گا۔ بیگم صاحبہ کو بھی ہمراہ لیے جاتا ہوں۔ بچیاں یہاں رہ گئیں

زیادہ سلام۔

محمد علی"

جہاز روانہ ہوا۔ اور اسی جہاز پر خلافت کمیٹی کے پورے وفد کے علاوہ جمعیۃ العلماء کے ارکان وفد بھی تھے۔ قرنطینۂ کامران کے قریب پہونچ کر محمد علی نے خط لکھا، خاصہ مفصل، آگے ملاحظہ ہو۔ تاریخ اندر تو درج نہیں، لفافہ کی مہر پر ۲۴ر مئی درج ہے۔

ضمیمہ باب (۵۶)

[فاضل گرامی مولانا سید سلیمان ندوی، رئیس وفد خلافت، نے مسئلہ آثار و مقابر پر مسلک جمعیۃ خلافت کی اتنی بہتر ترجمانی صحیح شرعی نقطۂ نظر سے بھی فرمادی تھی کہ ان کی تقریر کا مختصر خلاصہ جو دستیاب ہو سکا، اُسے اس نمبر کا ضمیمہ بنا دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے]

مولانا سید سلیمان صاحب نے مسئلۂ مقابر و آثار پر ایک پرزور تقریر کی۔ اور آیات و احادیث، تاریخ و سیر کے حوالہ سے اپنے مدعا کو ثابت کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم یہاں مجلس خلافت کی طرف سے تین باتیں لے کر آئے ہیں۔ اول یہ کہ کتاب و سنت کے ساتھ ان امور میں وسعت دینی چاہیے جس میں خود صحابۂ کرام اور تابعین مختلف تھے۔ مقرر نے اس کی متعدد مثالیں احادیث اور عمل صحابہ سے پیش کیں۔ اور پھر کہا کہ دوسری چیز یہ ہے کہ کتاب و سنت کے اتباع کا سب سے پہلا نمونہ خود حکومت کو ہونا چاہیے۔ یعنی خلیفہ کا انتخاب شرعی ہو اور وراثت سے پاک ہو۔ تیسری چیز مقابر و آثار کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ مین جان لینا چاہیے کہ یہاں دو چیزیں ہیں۔ مقابر اور آثار۔ اور ان دونوں کے احکام الگ الگ ہیں۔ مسئلہ مقابر کی نسبت بناء علی القبور اور تجصیص القبور وغیرہ کی ممانعت آئی ہے۔ گو ایک مختصر فریق کے نزدیک اس کے معنی کچھ اور ہوں۔ اسی بنا پر اگر سلطان تمام دنیائے اسلام کے فیصلہ کا انتظار کرتے تو یقیناً کوئی نقصان نہ تھا۔ اور اس طرح ذمہ داری بجائے

ان کی ذات یا اہل نجد کے تمام دنیا پر بٹ جاتی۔ مآثر سے مراد وہ مقامات ہیں جن کو انبیأ یا صحابہؓ کی طرف کسی حیثیت سے نسبت ہے۔ قرآن اور حدیث و آثار سلف میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ان مآثر پر عمارتوں کے بنانے یا مسجد بنانے سے منع کرتی ہو۔ بلکہ قرآن پاک، احادیث، سیر اور آثار میں ایسے مآثر کا ذکر ہے۔ اسی بنا پر ان عمارتوں کو منہدم کر دینا شدت اور غلو کے سوا کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہم کو معلوم ہے کہ جاہل مسلمان وہاں بعض غیر شرعی اعمال کرتے ہیں۔ ان اعمال کو روکنا چاہیے تھا۔ یا بعض عمارتیں غیر شرعی طور پر یا غیر مستند طور پر بنائی گئی تھیں تو ان کی تصحیح کی جاتی۔ مثلاً مولد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم (جائے پیدائش حضورؐ) کی موجودہ شکل یقیناً صحیح نہ تھی، مگر زمانۂ سلف میں اس کی شکل مسجد کی تھی جس میں نماز پڑھی جاتی تھی مگر موجودہ شکل حقیقی مولد کے کمرہ کی بنائی گئی تھی، جو صحیح و مستند نہ تھی، اس لیے درست کر دینی چاہیے تھی اور غلاف، کٹہرا، سنگ مرمر کی سل وغیرہ ہٹائی جا سکتی تھیں۔ مگر نفس عمارت کو توڑ ڈالنا شدت اور غلو کی انتہا ہے۔ مقامِ ابراہیم، صفا و مروہ، چاہِ زمزم وغیرہ تمام مآثر ابراہیمی ہیں، کیا ان کو بھی منہدم کر دیا جائے گا؟

باب (۵۹)

سنہ ۱۹۲۶ء (۱۱)

(مکتوب حجاز۔ ناکام مراجعت)

جہاز "اکبر"۔ قرنطینۂ کامران۔ بحر احمر۔ (لفافہ کی مہر پر) ۱۴ر مئی ۲۶ء

پیارے ماجد میاں۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جتنی خوشی اپنے اس سفر کی ہے، اسی قدر افسوس آپ کی شرکت نہ ہونے کا ہے۔ یہ دربار وہ ہے کہ باوجودیکہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو اپنے مرحوم بھائی کے شریک نہ ہونے کا افسوس تھا، وہ خود ہر بار حاضری سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہاں ایک حد تک خود غرضی جائز ہے۔ مگر یقین جانیے کہ آپ کے اور میرے دوست قاسم حسین[۱] اور تیسرے دوست مسعود علی صاحب ندوی[۲] کے اور مستورات میں بیگم صاحبہ انصاری[۳] کے شریک نہ ہونے کا سخت قلق ہے۔ سفر خوب لطف سے ہوا۔ میری اہلیہ کو دو تین دن قے آئی اور گھمن تو

---

[۱] قاسم حسین صاحب بدایونی (علیگ) محمد علی کے خاص مخلصوں میں تھے۔ شاید ساتھ کے پڑھے ہوئے بھی تھے۔ پہلے یو۔ پی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ سنہ ۱۶ء میں محمد علی کی دوستی کے سلسلہ میں معتوب ہوئے۔ اس پر استعفا دیکر حیدر آباد چلے گئے۔ آخر میں محمد علی کے ہم مرض ہوئے یعنی ذیابیطس میں مبتلا۔ اور محمد علی کے انتقال کے چند ہی مہینہ بعد خود بھی راہی ملک بقا ہوئے۔

[۲] مولوی حاجی مسعود علی ندوی منیجر دار المصنفین (اعظم گڈھ) [۳] ڈاکٹر انصاری (دہلی والے) کی بیگم صاحبہ

سب عورتوں کو چار پانچ دن رہی مگر مرد اکثر اچھی طرح رہے اور ہم لوگ تو خوب مزے سے کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے تھے۔ عدن سے گزرنے سے ایک دو دن پہلے ہی سمندر میں مطلق جوش نہ رہا تھا، جوش تو پہلے بھی نہ تھا، مگر بعض لوگوں کو ناگوار گزرتی تھی لیکن جب ہوا بند ہوئی تو سب گرمی کے شاکی تھے اور ایک شب تو بہت تکلیف رہی۔

میں نے پہلی بار سمندر کا سفر ½ ۱۹ برس کی عمر میں کیا تھا۔ ۱۱ر جون کو مانسون شروع ہوئی۔ ۱۹ر کو میں نے ساحلِ ہند چھوڑا۔ طغیانی کا زور تھا۔ جو کیفیت شروع کے ۵ دن رہی تھی، اسے اندازہ کرسکتا ہوں کہ اوروں پر کیا گزرتی ہوگی۔ لیکن حج کا شوق وہ شوق ہے کہ ایسی تکلیف پر بھی لوگ گلہ سنجی سے محترز رہتے ہیں۔ میرے کاربنکل کو چلنے سے پہلے آرام ہوگیا تھا، مگر ریل کے سفر میں ایک اور نکل آیا۔ پھر بھی جہاز کا ایک چکر تو روز ہو جاتا تھا۔ اگر اس سے نجات مل گئی ہوتی اور بیوی کی تسلی و تشفی لازمی نہ ہوتی تو میں زیادہ وقت تھرڈ کلاس ہی میں گزارتا۔ کمپنی تو مفت لیجانا چاہتی تھی مگر میں نے کہہ دیا کہ اس سفر کو بلا خرچ کیے ہوئے اختیار نہ کرنا چاہیے۔ اور تھرڈ کلاس میں سب کے ساتھ جانے ہی کی نیت تھی۔ اور اتنا ہی روپیہ پاس تھا، تاہم کمپنی نے تھرڈ ہی کے ٹکٹ سے فرسٹ میں ٹھہرایا۔ جمعیۃ العلماء کو بھی سکنڈ میں ٹھہرایا۔ شوکت صاحب کو کپتان نے اپنے پاس ایک خاص کیبن دیا، جس میں وہ اور بہن[1] رہتے ہیں۔ مگر افسروں کا سارا ڈک (Deck) تھرڈ کلاس والوں سے اتنا بھرا رہتا ہے کہ خود افسروں کو بعض وقت راستہ تک نہیں ملتا۔ افسر بہت خلیق اور با مروت ہیں۔ بالخصوص کپتان جو ایک نیک اور سیدھا آدمی ہے۔ میری اہلیہ اور بہن اور ان سے ملنے والی عورتوں کو کپتان نے اپنا آدھا ڈک دے رکھا ہے۔ اپنے غسل خانہ میں خود اس لیے کم

---

[1] مولانا کی ہمشیر بھی اس سفر حج میں ہمراہ تھیں۔

جاتا ہے کہ مستورات ادھر بیٹھتی ہیں۔ ان کو نقاب نہ ڈالنا پڑے۔ پرسوں رات مجھے سوجھی کہ اہل ہند غیر ہندی مسافروں کی دعوت کریں۔ بالخصوص بخاریوں کی جو باوجود گندے اور پسینے کے باعث سخت بدبودار اونی اور روئی بھرے کپڑے پہننے کے نیک اور سیدھے سادے لوگ ہیں۔ کوئی پانچ سو روپیہ صرف تیس چالیس آدمیوں سے وصول ہو گیا۔

کل یہاں کامران میں قسطنطنیہ والوں کی دیگیں لے کر سامان منگا کر کھانا پکوایا گیا۔ رات پون نبجے خود کھانا کھایا اور کوئی دو بجے سونے کو لیٹا، بہت کھانا بچ رہا اور جنس بھی۔ بنگالی "بھوکے" مشہور ہیں، رات ثبوت مل گیا۔ باوجود سوائے ایک خاتون کے چند مطلق نہ دینے کے ناخواندہ مہمان بن کر آگئے تھے۔ بڑی مشکل سے انھیں ٹالا تھا۔ اب سب کی رائے تھی کہ ان کو کھلوا دیا جائے۔ بسخت ندیدے اور حریص اور اس معاملہ میں بے حیا، ہیں۔ لوٹ مچا رکھی تھی۔ خیر ضیف اللہ ہیں، جب اللہ ان کو مہمان بناتا ہے تو ہم کیوں ناک بھوں چڑھائیں اس سے بھی فارغ ہوئے اب کہ دن کے گیارہ بج رہے ہیں، جہاز پر واپس جا رہے ہیں۔ کوئی بارہ بجے تک لنگر اٹھ جائے گا۔ انشاء اللہ پھر شام کو احرام باندھا جائے گا اور "لبیک اللھم لبیک لبیک لاشریک لک لبیک" کی صدائیں بلند کی جائیں گی اس وقت آپ پھر یاد آئیں گے اور خوشی کے ساتھ قلق بھی ہوگا۔ مگر اب شوق کی بیقراری بڑھ جائے گی۔ دیکھیے کیا کیفیت قلب پر طاری ہوتی ہے۔ اب تک تو اور مسافروں کی دیکھ بھال سے فرصت نہ رہی کہ دھیان اسی میزبان کی طرف کیا جائے جس کے مہمان ہو کر ہم جا رہے ہیں۔ دعا کیجیے کہ عمرہ، حج اور زیارت روضۂ اقدس نصیب ہوں اور قبول ہوں۔ آمین۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔ حکم آگیا کہ اٹھو، چلو۔ آخری کشتی اب جہاز کی طرف جا رہی ہے۔ یہاں ان عربوں سے جو ملازم ہیں، خوب مزے دار باتیں ہوئیں۔ عرب اور باشندگان عرب کی محبت دل میں

اور بڑھ رہی ہے۔ خدا جلد اس قوم کا اور اسلام کا احیا کرے۔ سب کو سلام شوق خصوصاً ظفر الملک
کو کہہ دیجئے کہ دیکھو بھائی ہمارے پیچھے نہایت احتیاط سے کام کرنا۔ قوم کو سنبھالنا اب آپ لوگوں کا کام ہے۔
بچوں کو پیار، گھر میں سلام شوق میری اہلیہ کا سلام بھی قبول فرمائیے اور گھر میں پہنچا دیجئے۔

والسلام - آپ کا پیارا بھائی

محمد علی''

وفد مئی میں روانہ ہوا تھا، اگست میں واپس آگیا۔ ارض حجاز میں محمد علی کو جو کچھ دیکھنا پڑا، خدا جانے ان سے دیکھا کیونکر گیا۔ ہر طرف ملکیت کی قہرمانی، ہر سمت نجدیت کی کرختگی۔ قبریں مسمار، دل غمگین، جمہوریت معدوم، شوریت بے نشان۔ بہت کچھ چیخے، چلائے اور جلسوں میں گرجے، بپھرے روئے (تفصیلات کا اس ذاتی ڈائری سے کوئی تعلق نہیں)۔ اثر کچھ نہ ہوا۔ مرکز اسلام، اور اس طرح بالواسطہ سارے عالم اسلامی کی اصلاح حال کا آخری سہارا اسی مؤتمر سے وابستہ تھا، اسکا یہ حشر ہوا۔ دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔ ایک مرتبہ سخت غش آیا، اور آثار بالکل فالج کے سے طاری ہونے لگے ——— حیرت ہے کہ جو فالج پانچ سال بعد جان لیوا ثابت ہوا، وہ اسی وقت کیوں نہ گر پڑا! اتنی شدید اور دل شکن مایوسیوں کے بعد زندہ سلامت واپس آجانا بس ایک کرشمۂ قدرت ہی تھا ——— لوٹ کر آئے تو نہایت درجہ خستہ و مغموم، شکستہ دل و ملول۔

باب (۶۰)

۱۹۲۶ء
سنہ (۱۲)

(ہمدرد۔ کامریڈ مرحوم)

عارف صاحب گو انگریزی سے ناواقف تھے۔ لیکن تھے کام میں خوب منجھے ہوئے، اور ہمدرد کے لیے بہت مفید۔ کام کرتے کرتے مشاقی آہی جاتی ہے۔ عقائد اور مذہبی مسلک میں البتہ مولانا سے مختلف تھے۔ مولانا کی سی دینی پختگی اور ایمانی جوش کی توقع عملہ کے ہر رکن سے کی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ فروری سنہ ۲۶ء کے تیسرے ہفتہ میں مجھے دفعۃً خبر پہنچی کہ عارف صاحب ہمدرد سے الگ ہو گئے۔ میں نے اپنے تعلقات کے اعتماد پر معاً خط لکھا کہ "یہ غضب عارف صاحب آپ نے کیا کیا۔ کوئی ناگوار صورت پیدا ہوئی تھی تو کم از کم مجھ سے تو مشورہ کر لیا ہوتا۔" جواب ۲ رمارچ کا لکھا ہوا آیا۔ ان کے اور مولانا اور ہمدرد کے تعلقات پر پوری روشنی ڈالنے والا۔ اس لیے تمام و کمال درج ہوتا ہے:۔

"مولانائے محترم۔ وعلیکم السلام۔

جواب میں تاخیر ہوئی۔ اس کی وجہ آشفتہ خاطری تھی جو آج بھی مسلط ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے استعفاء دیدیا ہے۔ بیشک آپ کو شکوہ ہونا چاہیے کہ اتنا اہم معاملہ اور میں نے آپ سے مشاورت نہیں کی۔ مگر مولانا یہ واقعہ بالکل فوری ہوا۔ اور مقامی احباب میں سے

بھی کسی متنفس سے گفتگو اور مشورہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہاں تک کہ رفقائے کار سے بھی میں نے ذکر نہیں کیا۔ بلکہ دوسرے دن اُن سے ذکر آیا۔

واقعہ یوں ہوا کہ مولانا نے ایک مضمون لکھنے کے لیے زبانی ہدایات دیں۔ میں نے مضمون لکھا اور دکھایا۔ حسب معمول پھر اس میں ترمیم و اضافہ کا حکم ہوا جو کیا گیا۔ مگر پھر جب کاپی ان کے پاس گئی تو مزید حک و اضافہ کیا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کاپی پریس میں دیر میں جا سکی۔ اس کے بعد پہلی مرتبہ بالکل غیر متوقع طریقہ پر ایک عتاب نامہ نازل ہوا جس میں بے توجہی، عدم احساسِ فرائض اور تن آسانی کے الزامات کا مورد ٹھیرایا گیا۔ اور نہ صرف یہ بلکہ اس کا بھی اظہار تھا کہ میں انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے پہلے ہی سے اخبار کے لیے بیکار ساہوں گو مفت کی مجھے تنخواہ دی جاتی ہے اور محض میری پرورش منظور ہے۔ اس وقت وہ تحریر میرے پاس نہیں، جب آپ تشریف لائیں گے تو دکھاؤں گا۔ بہر حال وہ ایسی تحریر تھی کہ اس کے بعد میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں مستعفی ہو جاؤں۔ چنانچہ تمام الزامات تسلیم کر کے نہایت نرم اور مودبانہ الفاظ میں میں نے اس مضمون کا استعفا بھیج دیا کہ جب آپ مناسب سمجھیں اور آپ کے حالات اجازت دیں، مجھ کو سبکدوش کر دیجیے۔ اس تحریر کا آج تک کوئی جواب نہیں آیا۔ اور چونکہ مولانا کی صحت اچھی نہیں ہے، اس لیے میں نے دوبارہ یاد دہانی بھی نہیں کی کہ اس حالت میں ان کو پریشانی میں مبتلا کرنا مقتضائے انسانیت و شرافت کے خلاف ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرا اصرار ایسے وقت میں کہ پہلے ہی سے اسٹاف کم ہے اور متواتر دو مہینے کے اشتہار کے باوجود وہ نہیں ملا، مولانا کے لیے کسی قدر ضرور تکلیف کا باعث ہوگا۔ اور میں ذرہ برابر تکلیف دینی معصیت سمجھتا ہوں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ ضرور ہے کہ اب میں بالکل برداشتہ خاطر ہو گیا ہوں۔ اور اس برتاؤ اور سلوک کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا ہے۔ میں

دفتر والوں کی طرف سے پہلے سے شاکی تھا مگر کبھی اس کا خیال نہیں کیا، اور یہ سمجھتا رہا کہ میرا معاملہ تو مولانا کے ساتھ ہے۔ وہ مجھ سے مطمئن ہیں، یہ کافی ہے۔ لیکن مولانا کی اس تحریر نے میرے حواس مختل کر دیے، اور میں ہر وقت یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری حیثیت اس دفتر میں ایک ملازم کی سی ہے اور وہ بھی غیر محفوظ۔ حالانکہ ابتک میں اپنے آپ کو ہمدرد کا اور ہمدرد کو اپنا سمجھتا تھا۔

میں آج آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ آج سے کئی ماہ قبل ڈاکٹر کچلو نے مجھے تنظیم[1] اخبار میں پونے دو سو روپیہ تنخواہ پر علاوہ مکان کے بلایا تھا اور کئی طرف سے مجھ پر زور ڈالا گیا، مگر میں نے لکھ دیا تھا کہ میں اول تو آپ کی پالیسی سے متفق نہیں، اور اگر میری خاطر سے آپ اس میں کچھ تغیر کرنے کے لیے تیار بھی (جس کا اشارہ خط میں موجود تھا) ہوں تو میں ہمدرد کو اور محمد علی صاحب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کا علم میرے رفقا کو ہے، کیونکہ بعض رفیقوں کو میں نے تنظیم کے بلاوے کا خط دکھا دیا تھا۔ یہ اس حالت میں میں نے کیا تھا کہ موجودہ تنخواہ میں میرا کسی طرح گزارہ نہیں ہوتا اور برابر مقروض ہوتا چلا جاتا ہوں۔ مگر کبھی تنخواہ کے متعلق ایک حرف میں نے نہیں کہا، اس لیے کہ ہمدرد کی جب پہلے ہی سے حالت مخدوش ہے تو میں کس منہ سے اضافہ کا مطالبہ کروں۔

بہرحال اب میں شوکت صاحب کا انتظار کر رہا ہوں کہ وہ آ جائیں تو پھر از سر نو میں اس معاملہ کو چھیڑوں اور یکسوئی حاصل کر لوں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو تنخواہ مجھے ہمدرد سے ملتی ہے اور وہ بھی دوسرے مہینہ، اتنی رقم تو میں آزادہ رہ کر اور اس سے بہت کم وقت صرف کر کے گھر پر پیدا کر سکتا ہوں۔ اس وقت بھی مجھے دو تین ماہوار و ہفتہ وار رسائل و اخبارات کام دینے کے لیے تیار ہیں، جن سے سو سے زاید وصول ہوں گے، اور یہ سب کام مشکل سے پندرہ روز

---

[1] ۱۹۲۴ء میں جب تحریک خلافت کو تنزل ہونے لگا تو مسلمانوں میں (خصوصاً صوبہ پنجاب میں) تبلیغ اور تنظیم کے نام سے دو تحریکیں بڑے زور شور سے اٹھی تھیں۔ تنظیم کا مرکز امرتسر تھا، اور اس کے کرتا دھرتا ڈاکٹر سیف الدین کچلو (بیرسٹر) تھے۔ انکے روزنامہ کا نام بھی "تنظیم" تھا۔

کا میرے کرنے کا ہوگا۔

یہ ہیں حالات۔ مفصل داستان زبانی سنیئے گا۔

آپ کا خادم

عارف ہنسوی"

۲۶ء بھی سال غم ہونے کی حیثیت سے محمد علی کے لیے ۲۴ء سے کچھ کم نہ تھا —— اور سال مسرت ان کی ساری پبلک زندگی میں تھا ہی کون سا سال —— سال شروع ہوتے ہی پہلے حجاز سے ان کے لیے نہایت درجہ دل شکن خبریں (بہ سلسلۂ اعلان ملکیت ابن سعود) آنا شروع ہوئیں۔ پھر مرشد اور محبوب مرشد کا انتقال ہوا۔ فروری میں ہمدرد سے عارف صاحب جو اس وقت تک پرچہ کے روح رواں تھے، رخصت ہوئے۔ فروری میں خود بھی سخت بیمار پڑے کئی ہفتہ صاحب فراش رہے۔ اپریل تک یہ سلسلہ چلا۔ پھر مئی میں حجاز جا کر جون و جولائی میں سرزمین حجاز میں اپنی آنکھوں سے ملکیت کے بڑے تکلیف دہ نظارے دیکھے۔ اور اگست میں جب ہندوستان واپس آئے، اس وقت سے لیکر برابر ہندی سعودیوں سے جنگ وجدال ہی میں مصروف رہے۔ خلافت کمیٹی کے اندر بھی اور باہر بھی، اور عین اسی زمانہ میں ایک بڑی ہی شدید اور طویل جنگ دہلی کے مشہور و صاحب اثر اہل قلم اور صوفی خواجہ حسن نظامی سے بھی چھڑ گئی۔ —— یہ نظارہ بھی کتنا حسرت انگیز تھا کہ جس کا کام غیروں سے، بیگانوں سے، دشمنان اسلام سے جہاد کرنا تھا، اسکے بیش قیمت وقت اور قوت کا کتنا بڑا حصہ اپنوں ہی سے مقابلہ کرنے میں صرف ہو رہا تھا!

کامریڈ کا بند ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ جنھوں نے کامریڈ کا زمانہ دیکھا نہیں ہے۔

اب انہیں کیا بتایا جائے کہ کامریڈ کیا چیز تھی، اور کن الفاظ میں سمجھایا جائے کہ اس کے نکلتے رہنے کے کیا معنی تھے۔ اور اس کے بند ہو جانے کے کیا معنی ہوئے۔

اس ڈائری کے نمبر (۳۰) میں کامریڈ کے خاتمہ کا ذکر آچکا ہے۔ آج دو چار سطریں اور سہی۔ ۱۴-۱۵ سال قبل یعنی ۱۹۱۱ء و ۱۹۱۲ء میں کامریڈ کی زندگی گویا سارے مسلمانانِ ہند کی تعلیم یافتہ جماعت کی زندگی تھی۔ ایک روح تھی جو ساری قوم کو زندہ رکھے ہوئے تھی۔ علم و ادب، سیاسیات و اصلاحِ معاشرت، زبان و انشا پردازی، حریت و جمہوریت، شوخی و ظرافت، ہنسی دل لگی، سب ہی کے نمونے، اس کے صفحات میں درج، ہر سامان اس میں موجود۔ اس وقت کامریڈ "مسٹر" محمد علی کا تھا۔ اب محمد علی "مولانا" ہو چکے تھے۔ جیل ہو آئے تھے۔ برسوں کی نظر بندی اٹھا چکے تھے۔ سوٹ، بوٹ، ہیٹ کے بجائے اب کھدر پوش تھے۔ کلام مجید کے نیم حافظ ہو چکے تھے۔ صاحب ریش تھے۔ اُس وقت ۳۰-۳۲ سال کے تنومند جوان تھے۔ اب ۴۵ سے اوپر ادھیڑ سن کے ہو چکے تھے۔ جوان چہیتی بیٹی کی موت، نازبردار و فرشتہ سیرت ماں کی موت، کامریڈ کے مقالہ نگار خصوصی ولایت علی (بمبوق) کی موت، سب اڈیٹر غلام حسین کی موت، شکست خلافت کا جانکاہ غم، غازی عبدالکریم رفیقی کی اسیری کا الم۔ سلطان ابن سعود کے نقض عہد کا صدمہ، ایک نہیں متعدد رفیقوں کی بے وفائیوں کا داغ۔ قومی صدمہ ایک سے بڑھ کر ایک۔ مالی پریشانیاں پیہم و شدید جسم کو گھلا دینے والا مرض، ذیابیطس، تو وہ اگلا سا ہنسوڑ پن بھلا اب کہاں سے لا سکتے تھے۔ پھر بھی کامریڈ ایک زندہ اور زندگی بخش قلم کا پرچہ تھا۔ جب تک خود زندہ رہا، خدا معلوم کتنوں کو زندگی بخشتا رہا۔ ناغہ کر جانے کا معمول تو عین اوج و شباب کے زمانہ میں بھی تھا، اور اب تو ناغوں کی حد ہی نہ رہی تھی۔ قدردان پھر بھی جھوڑنے پر

آئندہ نسلوں میں اس فرق کو سمجھنے والے اور اس تفریق سے لطف اٹھانے والے بھی کم رہ جائیں گے۔

آمادہ نہ تھے۔ جسے ایک دفعہ چسکا پڑ گیا، بس اس کا ہفتہ اور عشرہ اور مہینہ انتظار ہی کرتے گزرتا۔ ۲۲ر جنوری کی تاریخ کا پرچہ، جب ۱۸ر دسمبر کے بعد شروع فروری میں نکلا، تو اس وقت کون جان سکتا تھا، کس کو یہ علم غیب حاصل تھا کہ کامریڈ کی زندگی کی یہ بالکل آخری سانس ہے، اور اس نمبر کے بعد اس کا کوئی نمبر دیکھنے میں نہ آئے گا! ــــــــ رہے نام اللہ کا۔ انسان ضعیف البنیان کی کسی چیز میں ثبات و بقا ہے؟ آج یہ ایک محض قصۂ ماضی اور داستانِ پارینہ۔ اس وقت یہ قصہ کہانی نہ تھا۔ کامریڈ ایک زبردست، متحرک، زندہ و فعال قوت تھا۔ دنیا کو بھول جاتے دیر ہی کیا لگتی ہے ؎

فلک مصروف ہے پیہم نیا نقشہ بچھانے میں
زمیں کو دیر کیا گزرے ہوؤں کو بھول جانے میں

ــــــــ ❋ ــــــــ

باب (۶۱)

سنہ ۱۹۲۶ء (۱۳)

("زرِ عمرِ رفتہ کو آواز دینا")

مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے جلد جلد ہوتے اور عموماً دہلی ہی میں، زیادہ تر محمد علی کے ہاں اور کبھی کبھی حکیم صاحب کے ہاں۔ میں اکتوبر ۲۵ء میں نیا نیا ممبر مرکزی کمیٹی کا بنا تھا۔ کچھ تو تازہ جوش و شوق اور کچھ محمد علی کی ذاتی کشش، ہر بار ۳½ سو میل کے فاصلہ سے دوڑ کر دریاباد سے دہلی آتا۔ محمد علی کام سے پسے ہوئے، مخالفوں سے گھرے ہوئے، قلب رنجور، جسم محنت سے چور چور، میری حاضری سے باغ باغ ہو جاتے، اور کچھ دیر کے لیے گویا چھٹی منانے لگتے ——— ایک مرتبہ غالباً ۲۵ء کا دسمبر تھا، جب میں آیا۔ رات کو پہنچا۔ دوسرے دن محمد علی نے دن بھر کی چھٹی اپنے دفتر سے لے لی، سیر و تفریح کو ترسے ہوئے تھے، کسی سے موٹر مانگ (غالباً ڈاکٹر انصاری سے مانگی ہوگی)، اپنی برقع پوش بیگم صاحبہ اور مجھ کو اور مولانا عرفان کو ساتھ لے، شہر کے باہر نکل گئے۔ پہلے درگاہ حضرت نظام الدینؒ اور پھر قطب صاحبؒ کے ہاں کچھ وقت گزارا۔ ناشتہ کچھ ساتھ تھا، کچھ وہاں خرید کر کھایا پیا۔ مزارات پر فاتحہ پڑھی، مسجد میں نمازیں پڑھیں۔ لوگ ہر جگہ گھیر لیتے تھے۔ یہ بھی مجاوروں سے اور سب سے گھل مل کر باتیں کرتے۔

محمد علی کے ملنے والے سیکڑوں نہیں، ہزار در ہزار تھے، اور دور دور بیٹھے ہوئے عقیدتمند اور

شیدائی تو لاکھوں تھے لیکن سابقہ اور تعلق کے بعد مخلص اور راز دار ہو جانے والے دوست بہت ہی کم تھے، اور آخر آخر تو شاید دو ہی چار رہ گئے تھے۔ بہر حال ان چند میں ایک مولانا محمد عرفان تھے، صوبۂ سرحد کے رہنے والے لیکن اب تو دہلی ہی کے ہو گئے تھے۔ جمعیۃ العلماء کے عہدہ دار تھے۔ محمد علی نے ان سے تنہائی میں خود جمعیۃ اور اس کے بعض اونچے عہدہ داروں سے متعلق جس طرح کھل کر باتیں کیں، اس کی تو مجھے توقع ہی نہیں ہو سکتی تھی ——— بیگم صاحبہ کی معیت و رفاقت کچھ نئی نہ تھی۔ میاں بیوی میں میل محبت شروع ہی سے بہت تھا۔ آخر عمر میں تو کہنا چاہیے کہ عشق کی کیفیت تھی۔ عشق ایسا نہیں جس میں سوزش اور شورش ہو، اور جو تمام تر جوانی کے قویٰ کی پیداوار ہوتا ہے، بلکہ ایسا عشق جس میں ٹھنڈک اور سکون ہوتا ہے، اور عربی میں اس کے لئے لفظ "انس" ہے محمد علی کہا کرتے تھے "اب بغیر انھیں ساتھ لیے مجھ سے کہیں جایا نہیں جاتا۔ جوں جوں سن بڑھتا جاتا ہے، خواہش نفس عنقا ہوتی جاتی ہے۔ اور بیوی کے ساتھ خالص محبت بڑھتی جاتی ہے۔ اور قرآن مجید میں جو آیا ہے کہ بیوی سے تمھیں تسکینِ خاطر حاصل ہو گی، اس کے معنی اب جا کر سمجھ میں آئے ہیں۔"

بیگم محمد علی رہیں ہمیشہ برقع میں، اور پورے شرم و لحاظ کے ساتھ۔ چہرہ نقاب سے چھپا ہوا۔ لیکن رہتیں ہر جلسہ میں، ہر سفر میں، ہر مجمع میں، خلافت کانفرنس میں، برابر ساتھ ساتھ۔ اور جلسوں کی کارروائیوں میں بھی تھوڑا بہت حصہ لے لیا کرتیں۔ عورتوں کے مجمع میں تقریریں بھی کبھی کبھی کر دیتیں، اور دو ایک بار مردوں کے جلسوں میں بھی بول دیں[1] ——— تجدد کے رو میں بہی ہوئی "روشن خیال" بیویاں کاش بی اماں مرحومہ (مولانا کی والدہ ماجدہ) اور ان امجدی بیگم صاحبہ کی مثالوں سے سبق لیتیں کہ قومی کاموں کے لیے بےحیائی کیا معنی، بےپردگی بھی ہرگز لازمی نہیں۔ آئین حجاب کی پابندیوں کے ساتھ بھی سارے قومی کام بے تکلف انجام پاتے رہتے۔

[1] انتقال غالباً [illegible] میں فرمایا۔

محمد علی کی مہمانداری بھی قابل دید تھی۔ میں جب کبھی مہمان ہوتا، خاطرداریوں کو حدِ اسراف تک پہنچا دیتے، کھانے ضرورت سے بھی زائد ہوتے، میری حیثیت سے بھی زاید، اور ان کی جیب کی گنجایش سے بھی زائد۔ حق گوئی و حق نگاری میں تو محمد علی اپنی نظیر آپ تھے ہی، مہمان نواز اور سیر چشم بھی اس درجہ کے کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ کھانا اکیلے کھانا تو جانتے ہی نہ تھے، اور پھر کھانا بھی "نان جویں" اور "نمک طعام" نہیں، دسترخوان اچھا خاصہ چھوٹے موٹے رئیس کا معلوم ہوتا تھا۔ اچھے سے اچھے سالن، قورمہ، قلیہ، کباب کی متعدد پلیٹیں، طرح طرح کے لذیذ پر تکلف نمکین اور میٹھے کھانے۔ کبھی مرغ کبھی مچھلی۔ خشک میوے، تازہ پھل، خود کھاتے اور دوسروں کو زبردستی کر کرکے کھلاتے۔ اس سب کے باوجود ۲۵ئہ میں جب مولانا شوکت علی نے خود ہی یا ان کی تحریک سے "دوشنبہ فنڈ" کھولا، اور یہ قرار دیا کہ ہفتہ میں ایک دن، دوشنبہ کو مسلمان اپنا کھانا صرف چٹنی روٹی رکھیں، اور اس روز کھانے کے خرچ میں جو کچھ بچت ہو، اسے جمع کرکرکے ہر مہینہ یا ہر تیسرے مہینہ خلافت فنڈ کی نذر کرتے رہیں، تو محمد علی نے اس قاعدہ پر سختی سے عمل شروع کردیا۔ کہاں تو روزمرہ شوقینی کا یہ عالم تھا اور کہاں دوشنبہ کے دن واقعی دسترخوان کی حد تک خشک زاہد بن جاتے ——— دوشنبہ کے دن ان کے ہاں کا منظر دیکھنے کے قابل ہوتا۔ داماد، بھتیجے، بھانجے، دفتر کے منشی، یہ، وہ، کھانے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد روزمرہ ان کے دسترخوان پر ہوتی۔ آج کوئی صاحب بیماری کا بہانہ کرکے، کوئی صاحب کوئی اور عذر تراش کے، غرض سب ان کے دسترخوان سے کھسک جاتے؛ اور ان سے چھپ کر الگ الگ اپنے روزمرہ کے کھانوں کا انتظام کر لیتے۔ محمد علی اکیلے بیچارہ اپنے عہد کی پابندی کرتے۔ اور یہ کوئی معمولی مجاہدہ نہ تھا۔

کھانے میں بے احتیاط و بد پرہیز تھے۔ لیکن آخر میں ذیابطیس سے معذور ہوکر مٹھائی وغیرہ

سے ایک حد تک پرہیز کرنے لگے تھے۔ مہمانوں کو پرہیزی کھانے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کے لیے وہی
تر مال اور "مرغن" غذائیں بدستور۔ جاڑوں میں ماش کی کھچڑی ضرور آتی۔ بہ افراط گھی کے ساتھ۔
میں جب جاتا، ہر مرتبہ اصرار کر کر کے وقت سے زیادہ روکنے کی کوشش کرتے۔ چلتے وقت ہمیشہ ایک
معرکہ پیش آتا۔ ہنسی خوشی کبھی رخصت نہ کرتے۔ ایک دفعہ تو ان کی نظر بچا کر، بھاگ کر آنا پڑا تھا۔
میری ٹوپی اور عینک حضرت نے قرق کر لی۔ سمجھے یہ تھے کہ بغیر ان کے سفر کیسے کر سکوں گا۔ مجھ ضدی
کے لیے یہ چیزیں بھی روک نہ بن سکیں۔ جب دوبارہ ملنا ہوا (غالباً لکھنؤ میں) تو لگے معذرت کرنے
کہ "تمھیں عینک کے بغیر سخت تکلیف ہوئی ہوگی"۔ ایک بار عاجز آکر میں نے یہ ٹھان لی کہ اب
ان کے ہاں ٹھہرا ہی نہ کروں گا، ہر دفعہ مورچہ بندی کون کرے۔ پھر جو دہلی جانا ہوا تو اسٹیشن
سے سیدھا خلافت کمیٹی کے دفتر گیا۔ مولوی لقاء اللہ صاحب عثمانی پانی پتی شہر کمیٹی کے سکریٹری
تھے، ان سے کہا کہ "ابکی آپ کا مہمان ہوں، آخر جلسۂ خلافت ہی کے لیے تو آیا ہوں"۔ وہ بیچارہ
بڑی وتحاشی کے ساتھ بولے "میری مجال ہے جو ٹھہرا سکوں، مولانا محمد علی تو مجھے زندہ نہ
چھوڑیں گے"۔ ہار کر اور پچھتا کر پھر وہیں آنا پڑا۔ بہت بگڑے "مجھ سے بھاگنا چاہتے تھے"۔
——— اپنے سے چھوٹوں اور نیازمندوں کے ساتھ اس شفقت و محبت و خلقِ خاطر
کی مثالیں اب کہاں دیکھنے میں آئیں گی۔ محمد علی گاندھی جی نہ طبعاً تھے، نہ عقیدۃً ان کے
مسلک عدم تشدد اور اہنسا کے قائل۔ تشدد کے قائل بھی تھے، اور اس پر عامل بھی۔ متشدد غصہ
میں بھی تھے اور محبت میں بھی۔ اور خدا گواہ ہے کہ اس "تشدد وانہ عدم تشدد" میں کیسی حلاوت
کیسی دلآویزی، کیسی محبوبیت تھی!

ڈائری ۱۹۳۱ء اور شروع ۱۹۳۲ء کی لکھی ہوئی اس مقام پر ختم ہو گئی نظر ثانی کے

وقت ۱۶، ۱۷ سال بعد بہت کچھ بڑھایا اور کچھ گھٹایا۔ کہیں کہیں ادل بدل کی۔ بہ حیثیت مجموعی اتنے حصہ کا حجم سمجھنا چاہیے کہ پہلے سے ڈیوڑھا بلکہ دونا ہوگیا۔ پھر بھی نقشِ اول تو وہی پرانا تھا، جب واقعات حافظہ میں تازہ تھے اور محمد علی کو دنیا سے اٹھے ہوئے سال ہی ڈیڑھ سال ہوا تھا۔ اب آگے سے ڈائری کے اوراق بالکل "نو تصنیف" ہیں ——— اب ۱۹۴۸ء میں نہ شوکت علی زندہ نہ بیگم محمد علی، نہ مولانا کے مخلص دوست مولانا عرفان اور نہ قاسم حسن بدایونی۔ نئے ملک "بھارت" کی فضا بھی ہر مومن کے لیے اتنی ناسازگار اور ماحول بھی اتنا نازک، کہ

بات پر وان زبان کٹتی ہے

اور جی یہی کہنے کو چاہتا ہے کہ

جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی!

———•———

باب (۶۲)

سنہ ۱۹۲۶ء (۱۴)

(مجلس خلافت کی جھلکیاں)

اگست کی کوئی تاریخ تھی، جب معلوم ہوا محمد علی بعد حج پہلی بار لکھنؤ آرہے ہیں۔ دوڑا ہوا لکھنؤ پہنچا ــــــ ایک بار اس سے قبل اخبارات میں یہ پڑھ کر کہ کراچی جہاز فلاں تاریخ کو پہنچے گا، اور اس کے حساب سے وہ فلاں تاریخ دہلی آجائیں گے، فرط شوق میں دہلی بھی جا چکا تھا۔ رات بھر کے سفر کے بعد دہلی پہنچا تھا کہ اسٹیشن ہی پر ہمدرد خریدا اور اس میں یہ خبر پڑھ کر کہ مولانا کراچی میں رک گئے ہیں، معاً پہلی ہی ٹرین سے واپس ہوگیا۔ اور دن بھر کے سفر کے بعد آدھی رات کو دریاباد واپس پہنچا تھا ــــــ محمد علی میں کشش یوں ہی میرے لیے کیا کم تھی، اور اب کی تو وہ حاجی و زائر ہو کر اور سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر واپس آرہے تھے۔ بیوی علیل اور زیادہ علیل تھیں، انھیں چھوڑ کر پچھلی رات کو لکھنؤ چلا، اور دہلی کی ٹرین آنے سے قبل صبح تڑکے لکھنؤ پہنچ گیا۔ اب کی معانقہ حاجی محمد علی سے اور زیادہ طویل اور گرما گرم رہا۔ اسٹیشن سے محمد علی حسب دستور فرنگی محل چلے، وہیں ناشتہ ہوا، اور راستہ بھر خوب باتیں رہیں۔ ناشتہ کے بعد ۹، ۹½ پر قیصر باغ مہاراجہ محمود آباد کے ہاں آئے۔ مہاراجہ سر علی محمد خاں کی ذات بھی عجب، مرکزیت و جاذبیت

رکھے ہوئے تھی۔ بڑے ہمدرد ملت، بڑے فیاض، انتہائی مہمان نواز لیکن بہرحال ایک رئیس اور راجہ، اور مذہباً شیعہ۔ اس وقت تک شاید یو، پی گورنمنٹ کے ہوم ممبر بھی تھے مسئلہ حجاز میں چند ماہ قبل تک تو محمد علی کے مسلک کے اچھے خاصے مخالف اور فرنگی محل وخدام الحرمین کے ہمنوا تھے۔ اور اب بھی پوری طرح محمد علی کے ہم مسلک نہ تھے۔ البتہ ذاتی تعلقات محمد علی سے بہت قدیم تھے۔ مدتوں کامریڈ کی امداد بھی کرتے رہے تھے۔

اب راجہ صاحب کا ڈرائنگ روم تھا، اور محمد علی۔ سیاسیات حجاز و عالم اسلامی پر جو گفتگو انھوں نے شروع کی، دلچسپ بھی اور بصیرت افروز بھی، وہ جلد کیوں ختم ہونے پر آتی۔ اب یاد بھی کسے۔ صرف ایک دو فقرہ نہ بھولنے والا لوحِ حافظہ پر نقش رہ گیا۔ محمد علی ذکر سلطان اور اہلِ نجد کی تنگ ذہنیت اور عدم مسالمت کا کر رہے تھے۔ اس میں بولے، کہ

"میں نے ابن سعود سے کہا کہ حرم مکہ پر حق ہر کلمہ گو اور اہل قبلہ کا یکساں ہے۔ یہ حق تنہا آپ کے فرقہ بلکہ محض اہل سنت کا بھی نہیں۔ یہاں تو اہل ضلالت کو بھی اپنے اپنے طریق پر عبادت کا حق حاصل ہے۔ شیعوں کو میں ضلالت پر سمجھتا ہوں، لیکن انھیں بھی یہاں آکر اپنے طریق پر حج وزیارت کے رسوم ادا کرنے کی آزادی حاصل ہونا چاہیے۔"

شیعہ رئیس سے خود اسی کے مکان پر گفتگو میں شیعیت کو صراحت کے ساتھ "ضلالت" کہہ ڈالنا، یہ حق گوئی اور صاف بیانی محمد علی ہی کا حصہ تھی۔ سامنا لندن میں (وفد خلافت کے موقع پر) برطانیہ کے باجبروت وزیر اعظم لائڈ جارج کا ہو تو، مکہ معظمہ میں سلطان ابن سعود کا ہو تو، ہندوستان میں کسی رئیس کا، کسی حاکم کا، کسی عزیز قریب کا، کسی مخلص دوست کا، کسی محترم لیڈر کا ہو تو، وہ کسی حال میں دل میں آئی ہوئی زبان پر لانے سے نہ چوکتے، اور جو کچھ

بھی اندر ہوتا اسے باہر لانے سے نہ رکتے۔ اس ایک زبان نے خدا معلوم کتنوں سے انھیں لڑا دیا، کتنوں کو ان کا دشمن بنا دیا۔ لوگوں سے اچھی خاصی دوستانہ باتیں خوش مزاجی اور لطائف و ظرائف کے ساتھ کرتے ہوتے، ہنستے جاتے، ہنساتے جاتے، کہ یک بیک جنگ بھی شروع ہو جاتی: یہ منظر ایک دفعہ کا نہیں، بارہا کا دیکھا ہوا ہے ـــــــ ایک حدیث نبویؐ میں حضرت عمرؓ کے فضائل میں ایک جگہ آیا ہے کہ حق گوئی کی عادت نے عمرؓ کا کوئی دوست باقی نہ رکھا۔ اس کی عملی تصدیق، ایک چھوٹے پیمانہ پر، محمد علی کی زندگی سے ہو جاتی تھی!

باتیں راجہ صاحب کے کمرہ میں اسی انہماک کے ساتھ ہو رہی تھیں کہ ایک خبر دینے والے کی اطلاع پر میں باہر نکل آیا۔ دیکھا تو اپنا پرانا ملازم و رفیق ہاتھ میں تار لیے کھڑا ہے۔ تار دریاباد سے تھا۔ ابھی اوپر گذر چکا ہے کہ بیوی کو بیمار اور زیادہ بیمار چھوڑ کر محض محمد علی کے شوق زیارت میں لکھنؤ چلا آیا تھا۔ تار میں یہ تھا کہ ان کی طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی ہے۔ غش پر غش آ رہے ہیں۔ زمین پیروں کے نیچے سے سرکتی معلوم ہوئی۔ "پائے رفتن نہ جائے ماندن" کا صحیح موقع۔ نہ دل کو یہ گوارا کہ محمد علی کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ اور نہ یہی بن پڑتا کہ محبوب بیوی کو اس حال میں اتنی دور پڑا رہنے دوں۔ محمد علی نے تار پر نظر کی، اور معاً بولے "آپ ہرگز نہ رکیے" فوراً روانہ ہو جائیے اللہ بیچاری کو جلد شفا دے۔ یہاں ہم سب لوگ دعا کریں گے ـــــــ میں خود بھی شاید اس سے زیادہ بیتاب نہ ہوا ہوں جتنا بیقرار محمد علی ہو گئے۔ ہمدردی، محبت، غمگساری کا تو یہ شخص پتلا تھا۔ قطب میاں صاحب فرنگی محل (محمد علی کے میزبان) پاس بیٹھے ہی ہوئے تھے: ان بیچارہ نے فوراً اپنا موٹر پیش کر دیا، اور میں اسٹیشن کے لیے ہوا ہو گیا۔ اور اپنے عقیدہ میں تو اسے ایک بڑی حد تک محمد علی ہی کی مخلصانہ دعاؤں کا اثر سمجھتا ہوں کہ بیوی کی جان بچ گئی اور

چند روز بعد صحت حاصل ہو گئی۔

ستمبر میں خلافت مرکزی کمیٹی کا جلسہ حسب معمول دہلی میں ہوا، اور یہ جلسہ بڑے معرکہ کا تھا۔ محمد علی کی مخالفت پر بزرگان پنجاب تیار ہو کر آئے تھے، اور خبر گرم تھی کہ اسی جلسہ میں محمد علی کے پرزہ اڑا کر رکھ دیئے جائیں گے ــــــ اب خلافت کا کون سا جلسہ معرکے کا نہیں ہوتا تھا؟ اور کس میں یہ خبریں گرم نہیں ہوتی تھیں؟ ــــــ جلسہ میں پنجاب کے ایک معزز رکن خلافت نے جو ایک اہل حدیث عالم دین کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے تھے، سوال کیا، کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ آپ کی زمانۂ حج میں مولانا محمد علی نے صحن حرم میں بیٹھ کر سلطان ابن سعود کو گالیاں دیں (یا برا بھلا کہا)؟ سوال سنکر جلسہ بھر کے کان کھڑے ہو گئے۔ اور محمد علی کے ہمدرد و ہواخواہ دل میں فکرمند ہو گئے، کہ دیکھئے اب کیا جواب ان سے بن پڑتا ہے۔ مگر محمد علی بغیر کسی فکر و اندیشہ کے شائبہ کے برجستہ بولے، کہ "جی نہیں، واقعہ یہ ہے کہ سلطان ابن سعود کو گالیاں صحن حرم میں میں نے بیٹھ کر دیں، نہ لیٹ کر، نہ کھڑے ہو کر، نہ اور کسی وضع و ہیئت سے! اس جواب کا ادا ہونا تھا کہ محفل میں قہقہہ پڑ گیا اور معترض صاحب بیچارہ بجھ سے گئے۔

چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ پر بھی لوہے لگ جاتے تھے۔ ایک مستقل پارٹی تل کر آئی کہ محمد علی کی مخالفت قدم قدم پر کرے گی اور یہی ہوا کرتا۔ بے بات کی بات پیدا ہو جاتی۔ نزاع لفظی شروع ہو جاتی، اور پھر نوبت سخت سے سخت ذاتی حملوں کی آنے لگتی۔ یہ حقیقت انتہائی دردانگیز تھی، کہ جو وقت اور جو قوت مفاد ملی کے ٹھوس اور تعمیری کاموں میں صرف ہونا تھا، اس کا بڑا حصہ اس آپس ہی کے سب و شتم، طنز و تعریض کی نذر ہو جاتا ــــــ یہ اور بات ہے کہ تقریباً ہر معرکہ میں آخری بات مولانا اور ان کے مخلصوں اور رفیقوں ہی کی غالب رہتی، اور

عموماً فیصلہ وہی ہوتا جو مولانا کے مدنظر ہوتا۔

مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسوں میں عموماً اس کے صرف ممبر ہی شریک ہوتے لیکن کوئی خاص ممانعت باہر کے لوگوں کے لیے نہ تھی۔ اس لیے کبھی کبھی کچھ غیر لوگ بھی تماشائی کی حیثیت سے آبیٹھتے۔ آج کے جلسہ میں ممبروں کو ایک دوسرے کی زبان سے اپنی تفضیح کے سننے کا اور زیادہ خیال تھا۔ اس لیے دل سب کا یہی چاہتا تھا کہ آج کی محفل اغیار سے بالکل خالی ہو۔ لیکن خود یہ کہنے کے لیے بھی ذرا ہمت کی ضرورت تھی۔ جو ممبر یہ کہتا اس کی بدنامی رکھی ہوئی تھی۔ ایسی ایسی بدنامیوں کی پروا محمد علی کو کب تھی۔ وہی جلسہ سے اٹھ کر گئے، اور وزیٹر حضرات سے کہا کہ "آپ لوگ براہ کرم باہر تشریف رکھیں، ہم لوگ آج کے جلسہ میں کسی غیر کی موجودگی نہیں چاہتے"۔ بیٹھے ہوؤں سے کوئی اٹھ جانے کو کہے تو طبعاً یہ چیز گراں ہی گزرتی ہے، چہ جائے کہ ہم لوگوں کو جو تکلیف کے عادی ہیں اور ایسی فرمائش کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اتفاق سے دو کھدر پوش سب سے قریب بیٹھے ہوئے تھے، اور وہی براہ راست اس حکم کی زد میں آئے۔ ان دو میں سے ایک صاحب جامعی تھے، اور مولانا سے قرب و تخصیص کا تعلق رکھنے والے۔ قدرۃً ان پر اس حکم کی تعمیل گراں گزری۔ اور قریب تھا کہ چہرہ کے آثار انقباض احتجاج کی کوئی عملی شکل اختیار کریں کہ معاً ان کے رفیق نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا، اور بڑی خندہ جبینی کے ساتھ انھیں لیے باہر چلے گئے ______ ان رفیق صاحب کے چہرہ پر عجیب قسم کی نورانیت برس رہی تھی۔ داڑھی کے بالوں کے سیاہ ہونے کے باوجود نورانیت۔ (نورانیت سفیدی کے مرادف نہیں)، "نورانیت" کا لفظ بے محل و مبالغہ آمیز معلوم ہو رہا ہو تو جانے دیجیے، شرافت رکھیے۔ خوب سفید براق کھدر کی شیروانی پہنے ہوئے

چہرہ پر نوعمری کے باوجود خاصی اور خوشنما ڈاڑھی۔ دبلے پتلے، کسی قدر کشیدہ قامت، بشرہ پر
ذہانت، متانت، انکسار و خودداری کے آثار بہ یک وقت نمایاں۔ میرے باہر نکلتے ہی
ان سے تعارف ہوا۔ معلوم ہوا، جامعہ کے نامزد شدہ پرنسپل۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ایم، اے
پی، ایچ، ڈی ہیں۔ جرمنی سے ڈگری لے کر ابھی ابھی واپس آئے ہیں۔ جو شخص آگے چل کر
ملک و ملت میں بڑائی اور بڑی بڑائی حاصل کرنے والا تھا، اس میں بڑائی کی صلاحیتیں اس وقت
سے نمایاں تھیں ——— کیا ہرج ہے اگر اس ڈائری کے اوراق میں محمد علی ہی کے ضمن اور
ذیل میں محمد علی والوں سے بھی بے تکلف تعارف ہو چلے!
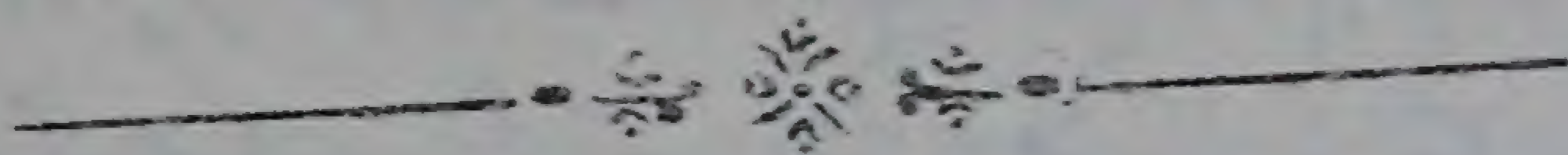
باب (۶۳)

سنہ ۱۹۲۶ء (۱۵)

(حربِ عقائد کا تماشہ)

محمد علی کی زندگی ہی مخالفتوں میں کٹی تھی۔ آج اس سے جنگ، کل اُس سے جنگ۔ سِن جوں جوں بڑھتا گیا، مخالفتوں کا ہجوم بھی ترقی کرتا رہا۔ سنہ ۲۶ء میں یہ مخالفتیں پورے شباب پر پہنچ گئیں۔ سلطان ابن سعود والیِ حجاز سے حجاز کے معاملہ میں مولانا کو اختلاف ہوا، اور سلطان چونکہ اتفاق سے حنبلی تھے، یعنی عقائد و فقہیات میں بڑی حد تک اہلِ حدیث کے ہم مذہب، اس لیے ہندوستان کے اہلِ حدیث نے سلطان کے مخالف کو اہلِ حدیث کا مخالف سمجھ لیا۔ اور اب صورت یہ ہوئی کہ ہندوستان کے سارے اہلِ حدیث محمد علی کی مخالفت کو اپنا فرض سمجھنے لگے ——— گویا محمد علی بھی کوئی زبردست "بریلوی" یا کسی حزب الاحناف کے صدر یا مقلدوں کے کوئی امام و مقتدا تھے! حالانکہ اس غریب کو مذہبیات کے ان جزوی اختلافات کی طرف توجہ کی بھی کہاں فرصت تھی! لیکن یہ الزام ان پر تھپ گیا تھا۔ اور اب خود ان ہی کے الفاظ میں تمام "غیر مقلد مقلدینِ ابن سعود" ان پر ہر طرف سے نرغہ کیے ہوئے تھے۔ اخبارات ان کے مخالف، جلسوں میں ان کی مخالفت، فتوے ان کے خلاف نکل رہے ہیں۔ اس مخالفت کی سیاسی امامت پنجاب کے مولوی ظفر علی خان صاحب کے ہاتھ میں، جو خود بھی کوئی

پیشہ ور مولوی نہیں، بلکہ علی گڑھ ہی کے اولڈ بوائے اور گریجویٹ اور مولانا شوکت علی کے ہم سبق تھے! لاہور کا کثیر الاشاعت روزنامہ زمیندار ان ہی کا تھا، اور وہ ہمدرد کو حریف سمجھ کر ہر وقت اسے نیچا دکھانے کی فکر میں۔ اب ہمہ وقت ظفر علی خاں کی آویزش محمد علی سے۔ ہر محفل میں یہی تذکرے ہر جلسہ میں یہی چرچے ——— پچھلے نمبروں میں ان معرکہ آرائیوں کے کچھ ہلکے سے نمونے تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ اب زیادہ سن کر اور دیکھ کر کیا کیجیے گا۔

اُدھر کے غالیوں کے جواب میں ادھر بھی اہل غلو کی کمی نہ تھی۔ اور بیسیوں جوابی انجمنیں ادھر بھی قائم ہو چکی تھیں۔ لکھنؤ کی انجمن خدام الحرمین نے ایک بڑا سا استفتاء مرتب کر کے فتوی یہاں تک دیدیا تھا کہ جب حالات ایسے پرخطر اور ناخوشگوار ہو جائیں جیسے کہ سعودی حکومت نے کر رکھے ہیں تو حج کے لیے سفر کر کے جانا بھی درست نہیں رہے گا، اور جن پر حج واجب ہو چکا ہے وہ اپنے فریضہ کو اصلاح حال کے وقت کے لیے ملتوی کر سکتے ہیں ——— فرنگی محل کے مشہور عالم مولانا عبد الباری صاحبؒ شروع سال میں انتقال کر چکے تھے، اس لیے اب غالیوں کو قابو میں رکھنے والی کوئی شخصیت رہی بھی نہ تھی۔ جو جس کے قلم نے چاہا بے تکان لکھ ڈالا۔ بڑوں کے اٹھ جانے سے چھوٹوں کی یہ حالت ہو ہی جاتی ہے ——— محمد علی ہرگز اس حد تک نہیں گئے تھے۔ ان کا کہنا صرف یہ تھا کہ اگر سعودی حکومت نے اپنی زیادتیوں کی اصلاح نہ کی اور ہر کوشش ناکام رہی تو بہ طور آخری چارۂ کار کے ایک حربہ یہی ہے کہ عالم اسلامی کو التوائے حج کا مشورہ دیا جائے، اور اس طرح حکومت سعودیہ پر معاشی بار اور مالی دباؤ ڈال کر انھیں راہ راست پر لایا جائے۔ لیکن عام مخلوق احتمال اور وقوع کے ان باریک فرق کو کیا سمجھتی اور کون چاہتا تھا کہ وہ سمجھے۔ ایک شور مچ گیا کہ محمد علی حج کو روک رہے ہیں! اب فتووں کی

کی دیر تھی۔ جو حج سے روکے وہ یصدون عن سبیل اللہ کا مصداق ہے۔ اور اس کے گنہگار نہیں بکافر ہونے میں کیا شبہہ ہے؟ محمد علی اسلام پر مر مٹنے والا، اور دین کی خاطر زندہ رہنے والا اب مرتد تھا، خارج از ملت تھا، بیگانۂ اسلام تھا۔

اس کشمکش اور چپقلش سے مولانا کے نیازمند بھی کب بچ سکتے تھے۔ اور پھر یہ نیازمند خصوصی جو اتفاق سے اودھ خلافت کمیٹی کا صدر بھی تھا۔ مولوی ظفر الملک علوی (اللہ ان کی مغفرت فرمائے) بھی ان ہی لوگوں میں تھے جو حمایت ابن سعود میں غلو رکھتے تھے، اور ہماری خلافت کمیٹی کے خاص رکن بھی تھے۔ ان سے آویزش ناگزیر سی ہوگئی اور پھر سچ (صدق کا پرانا نام) کے مہتمم اور عقل کل بھی وہی تھے، مجھ سا عافیت پسند بھلا جھگڑوں بکھیڑوں کا کہاں عادی۔ جی میں یہی آیا کہ سچ کی ایڈیٹری اور خلافت کمیٹی کی صدارت دونوں ہی سے استعفاء داخل کر دیا جائے۔ اکتوبر کے آخری ہفتہ میں مولانا کو خط لکھا کہ ان دونوں باتوں کی اجازت مرحمت ہو۔ اور مسئلہ التوائے حج میں بھی اپنے مسلک کی ذرا وضاحت فرما دی جائے۔ ہمدرد کے اسٹاف کے ایک صاحب کے ہاتھ ۴ نومبر کا لکھا ہوا خط موصول ہوا۔ اس میں یہ الفاظ تھے:۔

(۱) التوائے حج کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ حال ہی ہمدرد میں جو آرٹکل لکھا گیا ہے اس کے بعد غالباً اب ان سوالات کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر اب بھی اس مضمون میں کوئی بات رہ گئی ہو تو آپ اور سوالات لکھیں، ان کا جواب دیدیا جائے گا۔

(۲) اودھ خلافت کمیٹی کے استعفٰے پر بہت ناراض ہوئے۔ فرماتے ہیں کہ یہ وقت نہیں کہ آپ اس طرح علیحدہ ہو جائیں۔ مخلصین کو "دل شکن" اور "حوصلہ فرسا" تجربات ہوتے ہی رہتے ہیں، تو پھر کیا ان سے گھبرا کر کام چھوڑ دیا جائے؟

(۳) مولانا نے سیج گے بند کرنے کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اور اسی مذاقیہ لہجہ میں ذکر فرمایا جو گذشتہ مرتبہ مرکزی کمیٹی کے جلسہ سے واپسی کے وقت تھا۔

(۴) مولانا آج کانپور جا رہے ہیں، ۸ رنومبر کو واپس آجائیں گے۔"

کانپور میں اس وقت سالانہ جلسہ ندوۃ العلماء کا تھا، مجلس ندوہ کا شمار اس وقت تک ملک کی مشہور مجلسوں میں تھا، اور گو اس کی شہرت کا شباب مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا، پھر بھی اس کے نام میں خاصی کشش تھی۔ اور گمنامی سے تو یہ ادارہ اب بھی بہت دور تھا۔ سالانہ جلسہ اسی کا تھا، اور کانپور کے نامی گرامی تاجر چرم حافظ محمد حلیم نے بڑی اولوالعزمی کے ساتھ سب کی مہمانداری کا انتظام کیا تھا۔ جلسۂ ندوہ کی صدارت ایک بڑے امتیاز کی چیز سمجھی جاتی تھی اور اس سال انتخاب کا قرعہ دہلی کے طبیب نامور اور وقت کے مشہور سیاسی لیڈر حاذق الملک حکیم محمد اجمل خان صاحب کے نام پڑا تھا۔ مولاناؒ کی شرکت کے بغیر اس وقت مسلمانوں کا ہر جلسہ سونا اور بیکار تھا۔ بڑے اصرار سے مولانا کی طلبی ہوئی، اور مولانا کچھ اپنے اس طبعی تقاضے سے کہ مسلمانوں کے ہر ادارہ، ہر مجمع تک تبلیغ و پیام رسانی کا موقع بہر حال مل جائے، اور کچھ دوستوں کی مروت سے بھی مجبور ہو کر کہ "از درون دل دوستاں جہل است و کفارۂ یمین سہل" اپنے سو کام ہرج کر کے بہر حال دہلی سے کانپور آئے، اور جلسہ میں تقریر کی، اور حسب معمول جلسہ بھر پر چھائے رہے۔

مدعو مولوی ظفر علی خاں صاحب بھی تھے۔ اور پبلک کو شوق ان کے اور مولانا کے مقابلہ کے دیکھنے کا ——— قوم میں "تماشہ پسندی" کا ذوق اس قدر رچا ہوا ہے کہ مرغ بازی کی سیر نہ کی، اور بٹیروں کی پالی نہ دیکھیں، لیڈروں کی ٹکر کا تماشہ دیکھ لیا ——— جدھر دیکھیے یہی سرگوشیاں کہ "اب کیا ہوگا، ادھر مولانا آگئے، ادھر ظفر علی خاں بھی تو آرہے ہیں"۔ "ندوہ کے

جلسہ کو ظاہر ہے کہ سلطان ابن سعود کی مخالفت یا موافقت سے نفیاً اثباتاً کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن ہم لوگوں کے دماغوں کی رسائی اصولی بحثوں تک کہاں۔ یہاں تو مزہ بس اسی میں آرہا تھا کہ دو مشہور شخصیتوں کی آپس میں ٹکر ہو، اور ہر عامی کو اس پر رائے زنی کا موقع ملے!

مولوی ظفر علی خاں صاحب ہی تک بات رہتی، جب بھی غنیمت تھا۔ حرب عقائد تو وہ بلا ہے، اور اپنے جزئیات عقائد میں غلو کا فتنہ تو وہ ابتلا عظیم کہ جو لوگ ابتک مولانا کے خاص مخلصین میں سے تھے لیکن ساتھ ہی عقائد میں ہم زبان سلطان کے تھے، وہ تک بھی اب مولانا سے برگشتہ ہو گئے تھے، اور ان ہی مخلصین میں سے دارالمصنفین اعظم گڈھ کے بعض ندوی اکابر بھی تھے۔ مجھ جیسے نیاز مند طرفین کے لیے بڑا سخت وقت یہ تھا۔ سچ بھی چونکہ اپنے نرم انداز میں مولانا کا ساتھ دے رہا تھا۔ یہ حضرات خود سچ اور مدیر سچ سے بھی بدگمان ہو چلے تھے۔ ان اکابر سے اور مولانا سے آج عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی۔ اور خیال تھا کہ شکایتوں کا دفتر کھلے گا، اور نوبت خاصی تلخیوں کی آجائے گی۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہاں تک نوبت نہ آنے پائی۔ اور معاملہ معمولی گلے شکووں پر ختم ہو گیا ——

مولوی ظفر علی خاں صاحب کی آمد تو یاد نہیں پڑتی۔ مولانا نے بعد ظہر کے جلسہ میں تقریر کی حسب معمول پر زور اور دلچسپ۔ اور تقریر کے بعد ہی لکھنؤ کے لیے اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ یہ خاکسار بھی ہمرکاب ہوا۔ مولانا کو چلتے چلاتے عموماً دیر ہو ہی جاتی تھی، کچھ ایسی ہی صورت آج بھی پیش آئی۔ اور جب بھاگا بھاگ اسٹیشن پہنچے ہیں تو گاڑی آئے ہوئے کچھ دیر ہو چکی تھی، اور انجن پانی لے رہا تھا۔

———— • ————

باب (۶۴)

سنہ ۱۹۲۶ء (۱۷)

(زندہ دلی کا کرشمہ نئی فتنہ سامانیاں)

شروع نومبر کا سہ پہر، وقت آخر عصر کا، کانپور کا لق ودق اسٹیشن۔ جی آئی پی کا جھانسی لکھنؤ میل چھوٹنے کو ہے، کہ دو شخص موٹر پر بھاگا بھاگ اسٹیشن پہنچتے ہیں، اور جھٹ پٹ ٹکٹ لے لوا، اور اسباب کچھ قلیوں اور کچھ والنٹیروں (رضاکاروں) کی مدد سے درجہ میں پھینک پھانک ایک سکنڈ کلاس میں جا داخل ہوتے ہیں۔ دو انگیز بمبئی سے بیٹھے چلے آرہے ہیں۔ دونوں نووارد ٹھیٹھ ہندوستانی اسلامی لباس میں ملبوس۔ کھدر پوش، عبا پوش۔ ڈاڑھیاں رکھائے ہوئے، ایک جو مخدوم تھا وجیہ اور جامہ زیب، دوسرا جو کچھ خادم سا تھا، کریہ المنظر اور بد قطع۔ دونوں صاحب بہادران نوواردوں کا کینڈا دیکھ کچھ ہنسے، کچھ مسکرائے۔ عجب نہیں جو یہ سمجھے ہوں کہ سکنڈ کلاس میں بلا ٹکٹ گھس آئے ہیں۔ یا ریل کے بابو شاہی روزمرہ میں "وِد آؤت" (With out) والے ہیں۔ خوش قطع نووارد نے اس برتھ پر قبضہ جمایا، جس پر "صاحب" پہلے سے جمے ہوئے تھے۔ گاڑی چلی اور گنگا کا پل بات کہتے آگیا۔ ادھر پہیوں سے گھڑ گھڑ کی آواز نکلی، ادھر صاحب بہادر دونوں دیسی آدمیوں کی طرف دیکھ، چھیڑ کی ادا سے مسکرائے اور منہ بنا کر بولے (So This is mother Ganges) یہ گنگا مائی ہیں! طنز کا زور لفظ (mother) پر تھا،

اور طرز ہند و عقیدہ پر تھا، جو "صاحب" کے خیال میں عام ہندوستانی عقیدہ تھا۔ پاس کا کھدر پوش
سعاً چائے کی پیالی منہ سے ہٹا، اور انگریزی زبان میں، انگریزی کے لب و لہجہ میں بولا "اچھا تو
آپ سے یہ رشتہ ہے؟ مرد آدمی یہ دریا کو مائی اور موسی، اماں اور خالہ کہنا کیا معنی؟" یہ تڑاق سا
جواب پا "صاحب" سناٹے میں آگئے ———— یہ تڑپڑ جواب دینے والا محمد علی تھا،
اور اس کا ساتھی کہئے یا تابع مہمل کہیے یہ ڈائری نویس۔

"صاحب" بیچارہ کو بھی گمان نہ تھا کہ یہ چہرہ پر داڑھی اور سر پہ پٹے رکھائے ہوئے، اور جسم
پر ڈھیلی ڈھالی عبا پہنے ہوئے ہندوستانی کچھ انگریزی جانتا ہوگا، چہ جائیکہ اتنی انگریزی کہ ایسا
شستہ اور برجستہ جواب دے سکے! کچھ دیر غوطہ میں رہے۔ پھر ادھر سے منہ پھیر، اپنے ہم جنس رفیق سفر
سے گفتگو کرنے لگے۔ اتفاق سے موضوع گفتگو تھا کرکیٹ۔ ولایت سے مشہور ٹیم ام، سی، سی، ہی
نئی نئی ہندوستان آئی ہوئی تھی۔ دونوں صاحب بہادر لگے آپس میں گفتگو کرنے کہ فلاں کھلاڑی
ایسا ہے اور فلاں ایسا۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ محمد علی سے نہ رہا گیا۔ بول اٹھے "دخل در معقولات
معاف۔ آپ رائے زنی میں بڑی زیادتی کر رہے ہیں۔" اور لگے تفصیل و تشریح کرنے کہ فلاں
میں یہ خوبی ہے اور فلاں میں یہ خرابی ہے۔ ہوتے ہوتے تبصرہ نفس کرکیٹ پر شروع ہو گیا۔
اور گویا انگلستانی کرکیٹ کی تاریخ بیان ہونے لگی، فلاں سنہ میں گیند پھینکنے کا انداز یہ تھا،
اور فلاں زمانہ میں بیٹ مارنے کا یہ۔ فلاں شہر کی زمین پر گیند یوں لڑھکا کھاتا ہے اور فلاں شہر
کی زمیں پر دوں۔ بولنے والا اب گفتگو کیوں کر رہا تھا، یہ کہیے کہ کرکیٹ کے فن پر کوئی انسائیکلوپیڈیا
کا آرٹکل فرفر سنا رہا تھا۔ صاحب بہادر حیرت سے دم بخود، کہ یہ عبا قبا والا ملا تو کرکیٹ بازوں
کا بھی استاد نکلا! ایک مرتبہ گھبرا کے بولے "آپ کو بڑے معلومات کرکیٹ کے متعلق ہیں"

انھوں نے کہا کہ "ایک تجھی کو کیا، ہر علی گڑھی کو ایسے ہی معلومات ہوتے ہیں۔" "اچھا تو آپ علیگڈھ کے پڑھے ہیں، کپتان رہے ہوں گے؟" "جی نہیں، میں تو معمولی کھلاڑی تھا، کپتان بڑے بھیا (big brother) تھے۔" یہ big brother کی اصطلاح مولانا شوکت علی کے لیے محمد علی ہی کی چلائی ہوئی تھی، اور سارا انگریزی پریس اس سے واقف ہو چکا تھا۔ صاحب نے اپنے نزدیک بڑی پہیلی بوجھی، اور پکار اٹھے،

You Talk like Mohammad Ali

"یہ تو آپ محمد علی کی زبان بول رہے ہیں"! یہ جھٹ سے بولے

I am Mohamm Ali

"زبان کیسی، میں خود ہی محمد علی ہوں"۔ صاحب کی حیرت اب دیکھنے کے قابل تھی۔ آنکھیں پھٹی اور نظر اسی کھدر پوش کے چہرہ پر جمائے ہوئے بولے "ارے وہی محمد علی، جو مشہور علی برادران میں سے ہیں؟" انھوں نے جھک کر جواب دیا۔

Yes. The yoanger and more sharp-tounged of The Tow

"جی ہاں، وہی جو دونوں میں چھوٹا اور زیادہ زبان دراز ہے"۔

صاحب کو ابھی اپنی حیرت کے دور کرنے میں دیر سکنڈوں کی نہیں منٹوں کی لگی۔ بےچین اور بےقرار، بیٹھے پہلو بدل رہے ہیں، اور ٹکٹکی ہے کہ محمد علی کے چہرہ کی طرف لگی ہوئی۔ محمد علی نے یہ جو دیکھا، تو صاحب بہادر کو اور چھیڑنا شروع کر دیا۔ بولے، "یہ میرا نام سن کر اتنی گھبراہٹ کیوں؟ کیا یہ خیال ہے کہ علی برادران جہاں کسی انگریز کو دیکھ پاتے ہیں، تو بس اس پر جھپٹ پڑتے ہیں؟ تو اطمینان رکھیے۔ اطمینان دیکھ لیجئے (ہاتھ دکھا کر) یہ میرے ناخن تک ترشے ہوئے ہیں۔

محمد ملہ کا تو خیال بھی دل میں نہ لایئے"۔ صاحب کے ہاتھ میں ٹائمس آف انڈیا کا پرچہ تھا۔ بمبئی کا یہ مشہور انگریزی روزنامہ (Sheppard) نامی ایک انگریز کی ایڈیٹری میں مولانا کا خاص طور پر مخالف تھا، اور روز کوئی نہ کوئی شگوفہ چھوڑتا رہتا تھا۔ اسے محمد علی کی طرف بڑھا کر بولے۔

"اچھا ان الزامات کا کیا جواب جو یہ روز آپ پر لگاتا رہتا ہے"۔ محمد علی نے پرچہ کو چھوا نہیں۔ بولے "اسے آپ ہی پڑھیے۔ میں پرچہ کو نہیں، پرچہ کے ایڈیٹر کو خوب پڑھ چکا ہوں۔ یہ آکسفرڈ میں میرے زمانہ میں تھا۔ مجھ سے پیچھے، آتا جاتا، اس کو اس وقت بھی کچھ نہ تھا اور نہ اب ہے۔ (بھیڑیوں کے) گلے تو آپ نے بھی بغیر گلہ بان کے دیکھے ہوں گے۔ لیکن گلہ کے بغیر گلہ بان کا نادر وجود ان ہی حضرت کا ہے" —— یہ سارا لطیفہ تھا (shepherd) اور (Sheppard) کی تجنیس لفظی پر! —— گفتگو اس کے بعد آکسفرڈ پر چلی، پھر عام انگریزی معاشرت، خصوصاً نسوانی بے حجابی پر، یہانتک کہ لکھنؤ اسٹیشن آگیا۔

محمد علی تبلیغ سے کسی وقت بھی چوک جانے والے نہ تھے۔ کچھ نہ سہی، اس انگریز کے سامنے انگلستان کی معاشری زندگی ہی کے مکروہ پہلو پیش کر دیے

سنہ ۲۶ ختم ہو رہا تھا، اور دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں، اور محمد علی کانگریس میں شرکت کے لیے گوہاٹی (آسام)، گئے ہوئے تھے، کہ دہلی میں مشہور آریہ سماجی لیڈر شردھانند جی کو ایک پرجوش دوینہ ار مسلمان قاضی عبدالرشید نامی نے قتل کر دیا۔ شدھی کی تحریک، اور مسلمانوں کو مرتد بنانے میں یہ سوامی جی بہت آگے آگے تھے، مسلمان ان سے جلے ہوئے اور ان کے خلاف بھرے ہوئے تھے، یہانتک کہ ایک نے ان پر ہاتھ صاف کر ہی دیا۔ شردھانند جی کی حیثیت ایک مذہبی ہی پیشوا کی نہ تھی، وقت کے نامور سیاسی لیڈر بھی تھے۔ انتقام کی آگ جو ہندوؤں میں عموماً اور

آریہ سماجیوں میں خصوصاً بھڑکی، اس سے معلوم یہی ہونے لگا کہ اب کسی چوٹی کے مسلمان لیڈر
کی بھی جان گئے بغیر نہ رہے گی۔ اب مسلم لیڈر تھا کون، جسے چھوٹے بڑے سب غیر مسلم بھی مسلم
لیڈر سمجھ رہے ہوں؟ اس کا جواب کچھ مشکل نہ تھا۔ ہر شخص نے محمد علی ہی کو سمجھا۔ اور ایک دو دن
نہیں، ہفتوں یہی دھڑکا محمد علی کے سارے نیازمندوں کو لگا رہا کہ دیکھا چاہیئے ان کی شہادت
کی خبر کب آجاتی ہے۔ جب خاصی مدت گزر لی، تب اطمینان ہوا ——— دسمبر یا جنوری
تھا، جب خلافت کی مرکزی کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی کے جلسے ہوئے، اور یہ طے پایا کہ خلافت کا
آئندہ سالانہ اجلاس لکھنؤ مین آخر فروری مین منعقد کیا جائے، انتظامات کی ذمہ داری،
کیا یہ حیثیت صدر اودھ خلافت کمیٹی اور کیا یہ حیثیت صدر مجلس استقبالی، اسی ڈائری
نویس کے سر پڑی۔ اور اپنے مذاق طبیعت کے بالکل برعکس ان انتظامی ذمہ داریون کو
منظور کرنا پڑا، زیادہ تر محمد علی ہی کی خاطر سے اور ان ہی کی مروت مین! اپنے دنیا کے دوستون،
رفیقون، بزرگون مین اسوقت محبوب ترین ہستی اگر تھی تو محمد علی ہی کی تھی۔

———•———

باب (۶۵)

سنہ ۱۹۲۶ء (۱۷)

(از مذہب من گبر و مسلمان گلہ دارد)

سنہ ۱۹۲۶ء۔ آخری سہ ماہی کی کوئی تاریخ۔ مولانا آج سہ پہر کو دہلی سے لکھنؤ آرہے ہیں۔ یہ حسب دستور دریاباد سے چل کر، لکھنؤ اسٹیشن پر ان کے استقبال کو حاضر۔ گاڑی سے اترتے ہی بھرے پلیٹ فارم پر مجھ پر برس پڑے۔ "کیوں صاحب! یہ سچ میں ایسے مضمون آنے لگے جو مجھے اور حسن نظامی کو ایک درجہ پر رکھ رہے ہیں"________ خفگی کے پورے الفاظ سننے سے قبل اصل قصہ تو سن لیجئے! عین جس وقت ظفر علی خاں صاحب، اور پنجاب خلافت پارٹی اور ہندوستان کے اہل حدیث کے نرغہ میں مولانا گھرے ہوئے تھے، کہ دوسری جنگ پوری شدومد اور انتہائی تلخی اور تندی کے ساتھ دہلی کے مشہور و معروف خواجہ حسن نظامی سے چھڑ گئی۔ خواجہ صاحب کے ہاں سے بہت معقول اجرتی کام ہمدرد پریس کو ملتا رہتا تھا۔ مولانا کو اپنے جوش حق گوئی میں مالی نقصانات کی پرواہی کب ہوتی تھی۔ اس جذبۂ حق گوئی کے آگے تو وہ اپنا سب کچھ نثار کر دینے کو جیسے ہر وقت تلے بیٹھے رہتے تھے۔ محمد علی کے ہاں جوش اور جوش غضب بہت تھا لیکن وہ بہرحال اپنے کو معین حدود کے اندر مقید کیے ہوئے تھے۔ فریق مقابل قیود و حدود سے ہر طرح آزاد تھا۔ علاوہ اور رسالوں اور پرچوں کے ایک مستقل روزنامہ خواجہ صاحب نے

"غریبوں کا اخبار" کے نام سے محمد علی کی مخالفت میں نکال دیا اور چند روز تک خوب اس میں روزانہ ایک نئی پھلجھڑی چھوڑتے رہے۔ مثلاً کبھی یہ کہ میں دہلوی ہوں خالص دہلوی اور یہ محمد علی رامپوری ہیں، بیرونی ہیں، آفاقی ہیں۔ میں سید ہوں، اور فلاں فلاں بزرگ میرے اجداد میں ہیں، محمد علی کا نسب نامہ اس کے مقابلہ میں بالکل مجہول ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور دنیا کی شاید کوئی بڑی سی بڑی معصیت ایسی نہ ہو، جس کا انتساب مولانا کی جانب نہ کیا گیا ہو۔

سچ (صدق کا نقش اول) میری ادارت میں شروع ۲۵ء سے نکل رہا تھا۔ اس کی سچی باتوں کے ذیل میں اس وقت کسی ہفتہ یہ لکھ دیا گیا تھا کہ مسلمان لیڈروں کے درمیان باہمی جنگ کب تک جاری رہے گی؟ اور ایک دوسرے کی کمزوریوں سے قطع نظر کرنا اور آپس میں رواداری و فراخ دلی کا برتاؤ کرنا آخر کب آئے گا؟ ملت کی یکجہتی کے لیے لازم ہے کہ اختلاف خیال و مسلک کے باوجود سب مسلم اکابر آپس میں متحد عمل ہوں، اور ایک دوسرے پر گند گی اچھالنا چھوڑیں۔ خواجہ صاحب کے حلقہ میں ایک بڑے مخلص و سنجیدہ شخص واحدی صاحب تھے۔ انھوں نے اس مصالحانہ مضمون کو الگ ایک ورق پر چھاپ کر دلی میں اس کی بہ کثرت اشاعت کی۔ خواجہ حسن نظامی کا نام بھی لکھنے والے کے ذہن میں لکھتے وقت نہ تھا۔ لیکن دلی کی فضا میں اس کا تعلق اسی "عمل ختم خواجگی" سے سمجھا گیا۔ اور خیال یہ پھیلایا پھیلا یا گیا کہ سچ نے نرم، شستہ اور مہذب انداز میں ہمدرد و صاحب ہمدرد کو ٹوکا ہے ——— خفگی اسی سلسلہ میں تھی۔ اور اب وہ ڈانٹ پوری کی پوری بھی سن لیجیے، جو مدیر سچ پر اودو روشن مین لکھنؤ اسٹیشن کے بھرے پلیٹ فارم پر پڑ رہی تھی:-

"یہ آپ بھی ان ہی لوگوں میں ہو لیے، جو آج تک حضرت علیؓ اور معاویہؓ میں فرق نہ کر سکے

یہ ٹھیک خوارج کی ذہنیت ہے۔ جنھوں نے کبھی تحقیق کی زحمت گوارا نہ کی کہ حق پر کون اور ناحق پر کون؟ مگر آپ نے بھی ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکنا شروع کر دیا۔ محض صلح کرو، صلح کرو، کی رٹ لگا دی یہ نہ دیکھا کر کون کس پر کتنی زیادتی کر رہا ہے۔ مجھے اگر آپ ناحق پر پاتے ہیں تو ضرور ٹوکیے، کھلے اور صاف لفظوں میں ٹوکیے، لیکن پہلے تحقیق کیجیے، میرا جرم بتایئے۔ یہ کیا کہ سب کو ایک درجہ پر رکھ دیا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی تحریر سے وہ گروہ کتنا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ آپ کی نیت جو کچھ بھی ہو، بہرحال آپ نے ایک حربہ تو اپنے سیدھے پن سے ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ لوگ وہ اشتہار ایک ایک کو دکھاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ لو، سچ تک نے محمد علی کا ساتھ چھوڑ دیا۔ آپ سے ہرگز اس کی توقع نہ تھی۔"

محمد علی سے اب ایک عالم سے جنگ تھی۔ حکومت کے باغیوں میں تو وہ تھے ہی، اور یہ جنگ مستقل تھی۔ ہندو لیڈر بھی اب ان سے پھٹے پھٹے نظر آتے تھے۔ مالوی جی وغیرہ اور لبرل پارٹی کے لیڈروں کا ذکر ہی نہیں، پنڈت موتی لال نہرو تک سے اب صفائی نہیں رہی تھی۔ ایک مدراس کے سری نواس آینگر سے بس اخلاص کے تعلقات باقی رہ گئے تھے۔ محمد علی کہتے تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے پر ایک وہی آمادہ ہے۔ مسلمانوں کے اندر سلطان ابن سعود کے سارے ہمدرد مخالف۔ اور اب آخری اور حدود سے تجاوز کر جانے والی مخالفت خواجہ صاحب کی پارٹی کی طرف سے ——— چند عنوانات محض نمونے کے طور پر اس عدالت کی لگائی ہوئی فرد جرم کے سنیے گا؟

(۱) ایک فرضی، اور تمامتر گڑھی ہوئی تصویر جس میں پنڈت مدن موہن مالوی کے آگے "رامپوری" محمد علی کو سجدہ کرتے دکھایا گیا تھا!

(۲) ایک یہ گندہ اتہام کہ "رامپوری" محمد علی اپنے غسل خانہ کو روضۂ رسول (یا مسجد نبوی) سے زیادہ پاک وصاف کہتے ہیں۔

(۳) یہ دعویٰ بڑے شد ومد اور اہتمام کے ساتھ کہ "رامپوری" محمد علی چندہ کی بڑی بڑی رقمیں کھا گئے ہیں۔

(۴) یہ الزام بڑے وثوق اور حزم کے ساتھ کہ "رامپوری" محمد علی ہندو کانگریس سے تنخواہ پا رہے ہیں!

محمد علی ایڈیٹر اور جرنلسٹ (صحافی) جس پایہ کے بھی ہوں، ضرور نہ تھا کہ ہر شاطرانہ پروپگنڈا کے بھی مقابل بن سکیں۔ ہفتوں نہیں مہینوں ان کی ہر ممکن سے ممکن اور زیادہ سے زیادہ تفضیح کا سامان دھڑلے سے جاری رہا، اور کوئی دقیقہ بہرعام ان کے ساتھ تمسخر و استہزا کا اٹھ نہ رہا ——— داستان بڑی تلخ، لیکن ساتھ ہی بڑی عبرت انگیز اور بصیرت آموز بھی ہے۔ جی میں بار بار آتا ہے کہ اس کی تفصیلات آئندہ نسلوں کے لیے کچھ تو اور درج کر دی جائیں لیکن ایک بار پھر اس حقیقت کو ذہن کے سامنے تازہ کر لیجے کہ یہ محمد علی کی کوئی سوانح حیات نہیں۔ یہ تو صرف ان نقوش و تاثرات کا مجموعہ ہے جو ڈائری نویس کے ذاتی علم میں پیش آتے رہے۔ اور اس قضیہ سے ڈائری نویس کا تعلق تو بس اتنا ہی ہے کہ ایک مرتبہ خواجہ صاحب کو رنج کا خط لکھا، اور دو مرتبہ سچ میں نوٹ دیے۔ نوٹوں پر اصل مبحث پر کوئی رائے نہیں ظاہر کی گئی تھی۔ نرم اور مصالحانہ انداز میں خواجہ صاحب سے صرف یہ گذارش کی گئی تھی کہ

تمھیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے!

ذرا اپنے انداز بیان کو دیکھئے، اور خدا کے لیے سوچئے کہ آپ کس پستی پر اترتے آتے ہیں۔ ان نیازمندانہ معروضات کا اثر الٹا پڑا، اور میرا شمار بھی خواجہ صاحب نے اپنے باغیوں میں کر لیا!

مولانا کے ہاں بھی جوابات کی کیا کمی تھی! اُدھر کی ہر پھبتی کا جواب ادھر بھی پھبتی ہی سے دیا جاتا۔ مولانا محمد علی اگر اب "رامپوری کلال" تھے تو خواجہ حسن نظامی بھی اب "علی حسن غیاث پوری" تھے۔ خواجہ صاحب

نے ذہانت کا سارا زور صرف کر کے لکھا کہ محمد علی رامپوری کی بات اب سنتا کون ہے؟ جدھر جاتے ہیں، لوگ چندا ماموں کہہ کر ان کا استقبال کرتے ہیں۔ انھیں اب چندہ دیتا کون ہے؟ مولانا کب چوکنے والے تھے۔ جواب اسی ردیف و قافیہ میں دیا۔ بولے کہ "خواہرزادگی کی بو نہ گئی۔ چندا ماموں ہی یاد رہا۔ چندا ابا کہہ کر پکارا ہوتا تو بات بھی تھی"۔

اہل حدیث جہاں کہیں بھی تھے پنجاب میں ہوں یا بنگال میں، مولانا سے کد جاری رکھے ہوئے تھے۔ حالانکہ ان غریب کو تقلید و عدم تقلید کے مناقشوں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ مرکزی خلافت کمیٹی کا ہر جلسہ بجائے بزم کے ایک رزمگاہ کا منظر پیش کرتا۔ اور وقت و قوت کا بیشتر حصہ ان ہی باہمی الجھاؤوں کی نذر ہو جاتا۔ لکھنؤ میں جو میٹنگ ۲۶ء کی آخری سہ ماہی میں ہوئی، اس میں علاوہ پنجابی نمایندوں کے کلکتہ کے ممبر بھی آئے اور اتفاق سے یہ بھی اہل حدیث تھے۔ مولانا نے کہا کہ اب مقابلہ پر پنجابی ٹولی کے ساتھ بنگالی ٹولا بھی آگیا! لکھنؤ کی میٹنگ بڑی ہی پرشور ثابت ہوئی۔ ایک وقت تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب زبان سے گزر کر نوبت ہاتھ پیر کی آجائے گی۔ اشتعال کا باعث جو فقرہ ہوا، وہ منسوب مولانا شوکت علی کی جانب تھا، لیکن آئی گئی مولانا محمد علی کے سر ہوئی۔ غصہ سے بھرے ہوئے پنجابی ممبروں نے انتقام کی لپیٹ میں مولانا محمد علی کو ہی لیا۔ میں خود بھی بڑا غصہ ور ہوں لیکن اس خاص موقع پر اللہ نے مدد فرمائی میرے ہوش و حواس درست رہے، ایک جوان عمر پنجابی ممبر صاحب کے پیروں پر گر کر ہاتھ جوڑ جوڑ کر انھیں کسی طرح ٹھنڈا کیا۔ خواجہ حسن نظامی یا ان کی پارٹی کو ان کمیٹیوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لیے ان جلسوں پر تو ان کا کوئی اثر تھا نہیں، البتہ ان کمیٹیوں سے باہر اور اخبار میں محمد علی کو ان کے حملوں کا بھی جواب دیتے رہنا پڑتا تھا۔ عجیب لطیفہ تھا، کہ ایک ہی وقت میں ایک طرف تو محمد علی اس لیے بدنام ہو رہے تھے کہ وہ سلطان ابن سعود کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس لیے "امنٹی وہابی" ہیں، بدعتی ہیں، اہل توحید و سنت کے مخالف ہیں، گور پرست ہیں، وقس علیٰ ہذا۔ اور دوسری طرف اسی زور شور سے

یہ پروپیگنڈا جاری تھا کہ محمد علی بزرگوں کے منکر ہیں، مزارات اولیا کے دشمن ہیں، وہابی ہیں، قبہ شکن ہیں!

از مذہب من گبر و مسلمان گلہ دارد!

خواجہ صاحب کے مقابلہ میں محمد علی جو "علاج بالمثل" کر رہے تھے، اس سے ہم نیاز مند حزبہ ہو رہے تھے لیکن کہنے کی ہمت کس میں تھی۔ اتفاق سے ایک روز اسی خلافت کمیٹی کے شب کے اجلاس میں چودھری خلیق الزماں آگئے۔ اب تحریک خلافت سے ان کی عملی دلچسپیاں بہت کم ہو گئی تھیں، لیکن بہرحال مرکزی کمیٹی کے ممبر اب بھی تھے۔ اور محمد علی کے ہمپایہ تو نہیں، تاہم ایک چھوٹے لیڈر تو یہ اس وقت بھی تھے۔ اور محمد علی کے مخلصوں میں اب تک تھے۔ انھوں نے کہا، میں کہہ لوں گا۔ اور کہہ بھی گذرے۔ اس وقت کے مکالمہ کا دھندلا سا نقش آج بھی ذہن میں محفوظ ہے۔

چودھری صاحب: یہ آپ حسن نظامی کو کیوں جواب دیے چلے جاتے ہیں۔ آپ اپنی پوزیشن کا خیال کیجیے۔

مولانا: پوزیشن کیسی؟ تمھیں پبلک کے مذاق کا اندازہ نہیں۔ جواب نہ دیا جائے تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ بات سچی ہے۔ اور عوام میں زہر برابر پھیلتا جاتا ہے۔

چ: میں تو بازاری لوگوں کا مقابلہ کبھی نہ کرتا کوئی اگر مجھے نخاس کے چوراہہ پر گالی دے تو کیا میں بھی گالی دینے لگوں؟

م: تم مقابلہ اس لیے نہ کرتے کہ تمھیں کرنا نہیں آتا۔ میں تو کر سکتا ہوں۔ میں نخاس کے چوراہہ ہی پر اسی زبان میں جواب دوں گا۔

——— کوئی اور اس سے جو چاہے نتیجہ نکالے۔ میرے دل پر تو محمد علی کی سچائی ہی کا نقش اور گہرا ہوا۔ ڈپلومیسی اور تصنع کے فن سے کسی درجہ میں بھی آشنا نہ تھے۔ اچھا یا برا جو کچھ بھی دل میں ہوتا، بس ٹھیک وہی زبان پر بھی آتا۔

باب (۶۶)

سنہ ۱۹۲۷ء (۱)

(خلافت کمیٹی کا آخری سنبھالا)

خلافت والون بیچارون کو اب پوچھتا کون تھا۔ سارا جوش و خروش سنہ ۲۱ء و ۲۲ و ۲۳ء مین ختم ہو چکا تھا۔ بچا کھچا اثر سنہ ۲۴ء و ۲۵ء تک ساتھ دیتا رہا۔ اب نہ کہین خلافت کانفرنس ہوتی تھی۔ نہ کہین خلافت کے ممبر ہی باقی رہ گئے تھے۔ ایک خواب شیرین تھا، جسے دیکھنے کے بعد مسلمان عرصہ ہوا اسے بھلا ہی چکے تھے۔ شوکت علی غریب بمبئی مین مرکزی خلافت کمیٹی کو سینہ سے چمٹائے بیٹھے تھے ——— برسون کے بعد، اسی طرح بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ چڑھ کر مد کے بعد جزر، اور عروج و کمال کے بعد زوال شکست کی مثال سنہ ۴۷ء مین آل انڈیا مسلم لیگ کی شکست و ریخت مین دوبارہ نظر آئی ——— بہر حال، آخر سنہ ۲۶ء مین مرکزی خلافت کمیٹی نے طے کیا۔ کہ خلافت کانفرنس کا اجلاس ایک بار پھر ہو، اور ابکی اس کے ضمیمہ کے طور پر موتمر عالم اسلامی کا اجلاس بھی رکھا جائے۔ خلافت کے صدر، کراچی کے سیٹھ عبداللہ ہارون طے پائے، اور موتمر کے صدر حکیم اجمل خان۔ مقام اجلاس کے لئے قرعہ انتخاب لکھنؤ کے نام پڑا۔ اور تاریخین آخر فروری کی قرار پائین۔ جلسہ گاہ کے لئے سٹی اسٹیشن کے سامنے بلند باغ روڈ اور جگت نرائن روڈ کے جنکشن پر رفاہ عام کلب کے نام سے جو عظیم الشان عمارت ہے،

اس کا انتخاب ہوا۔ شہر میں اشتہار تقسیم کرنے کے لیے ہمارے والنٹیروں (رضاکاروں) کی ٹولی جب اکوں پر اور پیدل، باجہ بجاتی ہوئی نکلی، تو مجھے وزیر گنج کی ایک بوڑھا کا فقرہ نہیں بھولتا۔ سڑک پر یہ مختصر سا جلوس دیکھ، پکار کر بولی "اے لو، خلافت پھر نکلی"! ——— عوام کے دل سے اس کا تصور تک مٹ چکا تھا۔ اب جو نام سنا، تو جیسے بھولا ہوا خواب یک بیک پھر یاد پڑ گیا۔

یاد ہوگا کہ اودھ خلافت کمیٹی کا صدر یہ خاکسار ہی تھا۔ اب جو یہ کانفرنس کا ڈول پڑا، اور اس کی استقبالی کمیٹی بنی، یاروں نے اس استقبالیہ کی صدارت بھی اسی خاکسار کے سر منڈھ دی۔ وہی پہلی ہی صدارت میرے لیے مذاق طبیعت کے کب موافق تھی، یہ دوسری تو سرتاسر ایک عملی اور انتظامی قسم کی خدمت تھی، ہر وقت کی دوڑ دھوپ کی طالب۔ اور سب سے بڑھ کر چندہ وصول کرنے کی مہم! اس پر اپنے تجربے قلم بند کرنے بیٹھوں، تو خود ایک مستقل مقالہ تیار ہو جائے۔ بہرحال میں نے یہ ساری ذمہ داریاں اپنے مذاق کے خلاف جو قبول کیں، تو اس کی تہ میں زیادہ تر دخل اسی جذبہ کو تھا کہ محمد علی کی خوشی اسی میں ہے۔ محمد علی ضابطہ سے مرشد نہ تھے لیکن ان کی رضاجوئی اپنے کو ایسی ہی مقصود و مطلوب رہتی، جیسی مریدوں کو اپنے مرشد کی ہوتی ہے۔ محمد علی آئے حسب دستور بیگم محمد علی بھی ہمراہ تھیں ——— مہمانوں کا قیام اب کی بار باغ گونگے نواب میں مرحوم ممتاز حسین بیرسٹر کی لق و دق کوٹھی میں رکھا گیا۔ اور یہیں مرکزی کمیٹی کے جلسے بھی ہوتے رہے۔ مولانا بھی یہیں رہے۔ یہاں سے رفاہ عام کا فاصلہ قریب کے راستہ سے بھی ایک میل سے اوپر ہے۔ مہمانوں کو اتنی دور سواریوں پر وقت سے پہنچانا، مہمانداری کی عام ذمہ داریوں پر ایک اور اضافہ تھا۔ خیر، کام تو سب کے سارے دوسرے ہی لوگ انجام دیتے رہے، جن میں سے چند کے نام شکر گزاری کے ساتھ آج تک یاد ہیں، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی مرحوم، شیخ سعید الرحمن قدوائی، بیرسٹر

معین الدین انصاری (سکرٹری استقبالی کمیٹی) جو بعد کو رام پور ہائی کورٹ کے جج اور پھر چیف جسٹس ہو گئے تھے[۱]، سید ذاکر علی جو بعد کو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر آگرہ سے صوبہ اسمبلی کے ممبر ہوئے۔ مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی (سکرٹری خلافت کمیٹی دہلی) جو بعد کو مدتوں حیدر آباد میں شبینہ مدرسوں کا کام کرتے رہے۔ منشی محمود علی (ڈھی والے) اور سب سے بڑھ کر خود مولانا شوکت علی لیکن نیکنامی ضابطہ کی صدارت کی بنا پر خواہ مخواہ اپنے حصہ میں آگئی۔ مولانا شوکت علی چندہ وصول کرنے کی گویا مشین تھے، اور اس فن میں لاثانی۔ بڑے لوگوں کے ہاں جہاں جہاں گئے یہ خاکسار بھی "تابع مہمل" کی طرح ساتھ لگا رہا۔ فطرت بشری کے تجربے خوب خوب حاصل ہوتے رہے۔

محمد علی کو اپنی بیوی کے ساتھ بڑی ہی محبت تھی۔ اپنی ماں، اپنے بھائی، اپنی بچیاں کس کے ساتھ انھیں محبت کم تھی؟ ہر سفر میں بیگم محمد علی کو ساتھ رکھنا چاہتے تھے، اور اب کی تو لکھنؤ میں قیام کئی دن کا تھا۔ ایکی تو بہر حال ساتھ آتیں ہی۔ آئیں اور فرنگی محل میں اتریں، جہاں ان کی مہمانداری پردہ کے انتہائی اہتمام کے ساتھ بڑی اولوالعزمی کے ساتھ ہوتی رہتی۔ لکھنؤ میں ایکی ان کی آمد و رفت بھی مختلف گھرانوں میں رہی۔ ہم لوگوں کا جو مکان لکھنؤ میں ہے (خاتون منزل مرزا حیدر، مرزا روڈ پر، قیصر باغ بھانجے کے قریب) وہاں میری والدہ ماجدہ[۲] سے ملنے آئیں (بیوی سے ملاقاتیں تو خلافت کانفرنس کے عین جلسہ میں ہو چکی تھیں، جہاں پردہ کا پورا انتظام تھا) اور ان سے مل کر اپنی خوشدامن بی اماں مرحومہ کو یاد کیا کیں۔ محمد علی خود سب مہمانوں کے ساتھ باغ گونگے نواب میں مقیم تھے۔ ایک روز دوپہر کو جب اجلاس کانفرنس میں دوپہر کی چھٹی ہوئی، تو بیگم صاحبہ بھی بجائے فرنگی محل جانے کے یہیں آگئیں۔ وہ منظر آج تک نظر کے سامنے پھر رہا ہے۔ جاڑوں میں دوپہر کے

---

[۱] ان سطور کی نظر ثانی کے وقت (جنوری ۱۹۵۲ء میں) آناؤ میں سشن جج ہیں۔ [۲] وفات اپریل ۱۹۲۱ء میں پائی۔

وقت ایک خیمہ کے اندر جس کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، محمد علی تھک کر اور چور ہو کر فرش زمین پر لیٹے ہوئے ہیں۔ اور ان کے متصل یہ برقع پوش بیگم صاحبہ بیٹھی ہوئی ہیں یلتسکنو۲۱ الیھا کی زندہ تفسیر، ازدواجی لطف، محبت، غم گساری و رفاقت کا جیتا جاگتا نمونہ ——— لوگ اپنے لیڈروں کی زندگی کو صرف ان کی پبلک زندگی کے جلسوں، جلوسوں، تقریروں، نعروں تک محدود رکھتے ہیں، اور شاید یہ سمجھتے ہیں کہ ان بڑوں کے پہلو میں دل ہوتا ہی نہیں ہے۔ کسی اور بڑے کا حال جو کچھ ہو، لیکن محمد علی تو اپنے آقا و سردار کی سچی پیروی میں ایک شفیق بھائی، ایک سعید فرزند ایک نرم دل پڑوسی، ایک محبت کرنے والے باپ، ایک محبت کرنے والے شوہر تھے۔ ذکر یہ بیچ میں ان کی شخصی اور خانگی زندگی کا آ گیا۔ اور پھر اسی خلافت کانفرنس کے مجمع اور بھرے ہوئے جلسہ کی طرف واپس آئیے۔

بارات کے دولہا ابھی بھی دونوں بھائی رہے۔ تحریک خلافت کا اب دم واپسیں تھا۔ خلافت خود بھی اب مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں ختم ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں خلافت کمیٹی کی زندہ لاش کا سہارا یہی دونوں بھائی تھے۔ اتفاق سے نہ خلافت کانفرنس کے صدر منتخب آ سکے اور نہ موتمر عالم اسلامی کے صدر منتخب سیٹھ صاحب کی قائم مقامی بہار کے مولوی حاجی محمد شفیع داؤدی مظفر پوری نے کی۔ یہ علی برادران ہی کی طرح کے ایک بڑے پرجوش دیندار مسلمان تھے۔ ایک زمانہ میں اپنے صوبہ کے نامور ایڈوکیٹ تھے۔ اب وہ کامیاب وکالت چھوڑ چھاڑ، نیم فقیرانہ لباس اختیار کر کے اپنے کو خلافت کمیٹی اور دوسری ملی تحریکوں کے لیے وقف کیے ہوئے تھے، اور علی برادران کے خاص الخاص مخلصوں میں تھے۔ حکیم صاحب کی جانشینی[1] ڈاکٹر انصاری صاحب کے حصہ میں آئی۔

---

[1] انتقال غالباً ۱۹۲۶ء میں فرمایا۔

ڈاکٹر صاحب پر نیشنلزم کا رنگ بہت گہرا چڑھ گیا تھا۔ اور اسی نسبت سے اب ان کو علی برادران کے ساتھ خلوص بھی اس درجہ کا باقی نہیں رہا تھا جو کسی زمانہ میں تھا ——— ڈاکٹر انصاری کو قومیات وسیاسیات کے میدان میں لانے والے ۱۳ءء میں ان کی قیادت میں طبی مشن ترکی بھجوانے والے محمد علی ہی تھے۔ لیکن سیاسیات میں کون پچھلی رفاقتوں کو اتنا یاد رکھتا ہے؟ ——— خلافت کے جلسے دو ڈھائی دن زور شور سے رہے، اور ایک دن موتمر کا بھی جلسہ رہا۔ رنگ محمد علی کے سامنے کسی کا بھی نہیں جمتا تھا۔ دونوں صدر محترم بھی محمد علی کے آگے پھیکے ہی رہے۔ خلافت کے جلسہ میں کچھ ہندو حضرات بھی اس خاکسار کی دعوت پر شریک ہوئے۔ ایک نام پنڈت کشن پرشاد کول (ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی واڈیٹر "ہندوستانی") کا اب تک یاد ہے۔ ان کو شریک دیکھ میں نے مولانا سے عرض کیا، کہ "آج تقریر مذہبی سے زیادہ سیاسی رہے، جلسہ میں کچھ ایسے لوگ شریک ہیں جو آپ کے صرف مذہبی جوش کے قائل ہیں۔ مجھے یہ دکھانا ہے کہ آپ سیاسی تقریریں بھی کس معیار کی کر سکتے ہیں"۔ اس فرمائش پر خوب ہنسے۔ اور بولے "خوب خوب فرمائشیں آتی رہتی ہیں۔ ایک صاحب یہ کہتے ہیں کہ محمد علی نے مذہب کیا جانیں ایک سیاسی آدمی ہیں۔ دوسرے صاحب یہ فرماتے ہیں کہ یہ مذہبی قسم کے ملا آدمی ہیں، سیاست سے انھیں کیا واسطہ۔ اب میں کس کس کو خوش کیا کروں"؟ بہرحال تقریریں حسب توقع سب سے زیادہ پرزور، پرمغز اور جاندار محمد علی ہی کی رہیں۔

وہ تقریریں اور اس وقت کی تجویزیں، تحریکیں، اب حافظہ میں کہاں۔ اگر ہوں بھی تو آج کی دنیا کو ان سے دلچسپی ہی کیا۔ وہ دور اپنی زندگی، اپنے تمام جزئیات کے ساتھ ختم کر چکا تھا۔ اب ذیل میں اپنا پورا خطبۂ صدارت مجلس استقبالیہ درج کیے دیتا ہوں۔ اس سے ایک

اجمالی نقشہ اس وقت کی سیاست کا، اس وقت کے مسائل کا، نظر کے سامنے آجائیگا ۔۔۔۔۔

خطبہ کے پڑھتے وقت، اور اس کے خاتمہ پر لوگوں نے خوصلہ افزائی کے خیال سے داد خوب دل کھول کر دی۔ لیکن سب سے بڑی اور سب سے قیمتی داد یہ تھی کہ ایڈریس کے خاتمہ پر معاً محمد علی نے لپک کر گلے لگا یا۔ اور پیشانی پر بوسہ دے دے کر داد کے بڑے فیاضانہ الفاظ صرف کر ڈالے۔
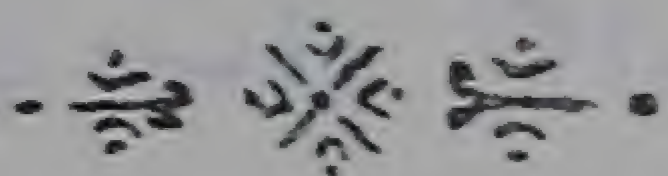
ضمیمہ باب (۶۶)

(باز گو از نجد و ز یاران نجد)

خطبۂ صدارت مجلس استقبالیہ جو ۲۶ فروری ۱۹۲۷ء کو لکھنؤ (عمارت رفاہ عام) کے چودھویں اجلاس آل انڈیا خلافت کانفرنس میں پڑھا گیا۔

قوم اور ملک کے خدمت گزارو! وطن و ملت کے سرفروش سپاہیو! دور دراز سے زحمتِ سفر اٹھا کر آنے والے جلیل القدر مہمانو[1]!

ایک نامور مگر اجڑے ہوئے شہر کے باشندوں کی طرف سے، اپنے تہی مایہ اور بے مقدرت میزبانوں کی جانب سے، ایک بے بضاعت، اور نااہل فرد کی زبان سے تحیۂ و سلام اور برکت و رحمت کی دعاؤں کا تحفہ قبول کرو!

جس سرزمین پر ہم سب اس وقت جمع ہیں اس کی قسمت بھی قسامِ ازل نے کچھ عجیب رکھی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی پرقوت حکومت سیکڑوں برس تک قائم رہی۔ لیکن لکھنؤ کو دار السلطنت بننا کب نصیب ہوا؟ اس وقت جبکہ خود سلطنت میں انتشار و اختلال پوری طرح پیدا ہو چکا تھا، مسلمانوں کی مرکزیت پارہ پارہ ہو چکی تھی اور بابر و اکبر، شاہ جہان و اورنگ زیب کے محض افسانے رہ گئے تھے۔ ملک ہند میں مسلمانوں کے علوم اور شعر و ادب

[1] جلسہ میں نمایندے دہلی، پنجاب، بہار اور مدراس تک کے موجود تھے۔

کا نقارہ صدیوں تک بجتا رہا، لیکن فرنگی محل کے علم و فضل اور لکھنؤ کی شاعری کا آفتاب کب چمکا؟
اس وقت جبکہ خود مسلمانوں کے علم و ادب کا آفتاب ہندوستان میں لب بام آچکا تھا۔ آل انڈیا
خلافت کانفرنس کے اجلاس سالہاسال سے ملک کے مختلف گوشوں میں ہو رہے ہیں، کلکتہ،
بمبئی، دہلی وغیرہ کا ذکر نہیں۔ بلگام و کوکناڈا جیسے دور افتادہ مقامات تک یہ فخر حاصل کر چکے
لیکن اب تک اس شرف سے اگر کوئی محروم رہا تھا تو وہ یہی شہر لکھنؤ تھا[۱]۔ آج جب یہ سعادت
اس کی قسمت میں آرہی ہے تو ہر شخص خود دیکھ رہا ہے کہ روز عید کی شام کے آثار نمایاں ہیں،
سرور شب کے اتار کا وقت ہے اور اہل بزم تھک تھکا کر انگڑائیوں پر انگڑائیاں لے رہے ہیں!
خیر یہ اپنا اپنا ظرف ہے اور اپنا اپنا نصیب! کسی کو شب کے بناؤ سنگار دیکھنا مبارک اور
کسی کے نصیب میں سحر کی بگڑی اداؤں کا آنا مبارک! ؎

ہر کسے خمے کشیدہ در مجلسِ وصالش
چوں دورِ خسرو آمد جام و سبو نماندہ!

لیکن ساقی سے بدگمانی کی مجال نہیں۔ طبیعت میں کیف اور قلب میں ذوق اگر موجود ہے
تو بڑے سے بڑا خم اور چھوٹے سے چھوٹا جام سب برابر ہیں۔

یہ پہلو لکھنؤ کی بدقسمتی کا تھا، لیکن خوش قسمتی کا پہلو لیجیے، تو انجمن خدام کعبہ جسے خلافت کمیٹی کا
نقش اول کہنا چاہیے، اسی سرزمین پر گنتی کے چند آدمیوں اور برائے نام سرمایہ کے ساتھ قائم ہوئی
تھی اور اسی کے کارناموں نے آج سے چودہ پندرہ سال قبل ملک کے طول و عرض میں غلغلہ
ڈال دیا تھا۔ پھر ۱۹۱۹ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے نام سے جو عظیم الشان کانفرنس منعقد

[۱] لکھنؤ میں خلافت کے اور جلسے تو اس سے پیشتر بارہا ہو چکے تھے۔ "آل انڈیا کانفرنس" کے انعقاد کا اس شہر
میں یہ پہلا موقع تھا۔

ہوئی تھی اور جس نے خلافت کمیٹی کی باضابطہ بنیاد رکھی تھی وہ نہ صرف اسی شہر میں بلکہ ٹھیک اسی عمارت[1] کے اندر منعقد ہوئی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۲۱ء میں جناب مولانا محمد علی صاحب کے زیر صدارت اودھ خلافت کانفرنس کا جو اجتماع عظیم ہوا تھا وہ بھی اسی شہر میں، اسی عمارت کے احاطہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس بنا پر صوبہ اودھ کا اجڑا ہوا دار السلطنت اگر آل انڈیا خلافت کانفرنس اور جمعیۃ الخلافۃ کے وطن ہونے کا فخر اپنے لیے حاصل کرنا چاہے تو شاید یہ فخر فخر بیجا نہ ہو۔ چودھویں رات کا چاند بدر کامل ہوتا ہے، خدائے پاک ہماری کانفرنس کے اس چودھویں اجلاس کو بھی ماہ شب چہاردہم کا حسن وجمال، نور کمال نصیب کرے اور وہ جمال وکمال جو مستقل طور پر ہمیشہ کے لیے اسے ماہ شب چہاردہم بنائے رہے۔

لکھنؤ کی پچھلی خدمات کے سلسلہ میں اودھ کی اس ممتاز ہستی کا نام بھی حسرت وماتم کے ساتھ آنا ناگزیر ہے جو خلافت کانفرنس کانپور کے اجلاس کے چند ہی روز کے بعد عالم عنصری سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئی۔ یعنی مرحوم ومغفور مولانا عبد الباریؒ فرنگی محلی[2]۔ ان کے قومی کارنامے آج کسی یاددہانی کے محتاج نہیں۔ تحریک خلافت کے سلسلہ میں ان کی ذات ایک مرکز کا مرتبہ رکھتی تھی۔ آج اگر وہ زندہ ہوتے تو اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودے کو اپنے ہی شہر میں پروان چڑھتے دیکھ کر کس قدر مسرور ہوتے اور ان کی ذات گرامی سے ارکان مجلس استقبالی کو آج ہر قسم کی کس درجہ اعانت ملتی! کارساز حقیقی کے لطف وکرم سے کیا عجب ہے کہ اس وقت بھی اس کے فرشتہ خدائی لاسلکی (وائرلیس) کی مدد ان کی روح کی آنکھوں اور کانوں کو یہ سب کچھ دکھا او یہ سب کچھ سنا رہے ہوں۔ خدائے آمرزگار ٹھنڈی رکھے اس خادم دین کی تربت کو اور

---

[1] عمارت موسوم بہ رفاہ عام کلب وجلسۂ تہذیب لائبریری، سٹی اسٹیشن کے مقابل۔

[2] مولانا محمد علی کے مرشد، مشاہیر وقت میں ممتاز

رحمتیں نازل کرے اس کی روح پر!

بزرگو، دوستو اور عزیزو! آج مختلف سمتوں سے یہ صدائیں بلند ہو رہی ہیں کہ "اب خلافت کمیٹی کی ضرورت کیا باقی رہی؟ اور اگر کچھ ضرورت ہو بھی تو کیا یہ ضرور ہے کہ اس کو اسی نام کے ساتھ باقی رکھا جائے"؟ حیران ہوں کہ ان سوالات کا کیا جواب دوں! اس سے بڑھ کر حیرانی یہ ہے کہ یہ سوالات کسی مسلمان کے دماغ میں پیدا کیونکر ہوئے! جس انسان کو خلافت سے عار آتا ہے درحقیقت اسے خود اپنے وجود سے عار آنا چاہیے کہ انسان کی حیثیت اس کائناتِ ارض میں بجز خلیفہ کے اور کچھ نہیں۔ یہ کسی فقیہ کا فتویٰ نہیں، کسی مورخ کی رائے نہیں، کسی بشر کا قول نہیں بلکہ اس وقت جب نہ آدمؑ کا وجود تھا اور نہ بنی آدمؑ کا۔ نہ بشر کا نہ ابوالبشرؑ کا، اس وقت سب کے پیدا کرنے والے، سب کو نیست سے ہست کرنے والے نے صاف صریح اور غیر مشتبہ الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اِنّی جَاعِلٌ فِی الاَرضِ خَلِیفَۃ۔ یہ نہیں ارشاد ہوتا کہ انسان کو حاکم پیدا کیا جائے گا، عالم پیدا کیا جائے گا، شاعر پیدا کیا جائے گا، فقیہ پیدا کیا جائے گا، مجاہد پیدا کیا جائے گا، بلکہ یہ اور صرف یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اسے روئے زمین پر خلیفہ بنا کر پیدا کیا جائے گا۔ انسانوں کے مختلف طبقے اور گروہ شروع سے قائم ہیں اور آخر تک قائم رہیں گے، کوئی شاہ ہوگا کوئی گدا کوئی امیر ہوگا کوئی فقیر، کوئی حاکم ہوگا کوئی محکوم، کوئی ذہین ہوگا کوئی غبی، کوئی صحیح ہوگا اور کوئی مریض، کوئی بڑا ہوگا کوئی چھوٹا، یہ سارے اختلافات ہوتے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے، لیکن منصبِ خلافت سے دست برداری کسی لمحہ اور کسی آن ممکن نہیں۔ ہر انسان اول میں بھی خلیفہ ہے اور آخر میں بھی۔ جسمِ خاکی میں جس وقت روح داخل ہوتی ہے اپنے ہمراہ منصبِ خلافت لیکر داخل ہوتی ہے اور جب تک خود روح نہ نکل جائے کوئی قوت اس منصب سے انسان کو بیدخل نہیں

کر سکتی۔ یہ لقب ہندوستان کی مرکزی خلافت کمیٹی کا گڑھا ہوا نہیں، مولانا شوکت علی کا ایجاد کیا ہوا نہیں، بلکہ اس بڑی سرکار کا بخشا ہوا ہے جس کے یہاں سے ہمیں خود جامۂ انسانیت اور خلعتِ جز عطا ہوا ہے۔ طبیعتیں اگر اس خطاب سے اکتا گئی ہوں تو اس خطاب کی واپسی اسی سرکار میں کرنا چاہیے جہاں سے یہ مرحمت ہوا تھا۔

خلافت اس وسیع معنی میں انسانیت کے ہم معنی ہیں لیکن محدود و مخصوص مفہوم میں اس کا اطلاق خاص محلِ نعمت پر ہوتا ہے، قرآن پاک کی آیات کریمہ میں استخلاف، خلفاء و خلائف وغیرہ کا استعمال ایسے ہی مواقع مدح پر ہوا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک نبی جلیل القدر حضرت داؤدؑ کو جو نبوت کے حلہ نورانی کے ساتھ ہی حکومت کے خلعت مادی سے بھی سرفراز تھے اور نظام حکومت نشائے ربانی کے مطابق قائم کئے ہوئے تھے۔ خطاب کر کے ارشاد فرمایا جاتا ہے۔ ﴿یا داؤد انا جعلنٰک خلیفۃ فی الارض﴾ اے داؤد ہم نے تمھیں روئے زمین پر اپنا خلیفہ بنایا! اللہ اکبر! مرتبہ خلافت کی بلندی دیکھنا! منصب نبوت پر سرفرازی کے بعد ہی خلعتِ بقا ملتا ہے تو خلافت کا!

اس بڑی خلافت کو انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد جن بزرگوں نے زندہ رکھا اور بموجب ارشاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک نیز جمہور امت کے متفقہ فیصلہ کے مطابق افضل ترین امتی گزرے ہیں، ان کے لیے سب سے بڑا تعظیمی لفظ جو استعمال ہو سکتا ہے وہ "خلیفۃ الرسول" اور بعد ختم نبوت جو سب سے بڑا مرتبہ کسی باخدا انسان کو مل سکتا تھا اس کا نام شریعت کی زبان میں خلافت ہی ہے۔ ہم اہل سنت اس سب سے بڑی فضیلت میں چار ہستیاں شریک سمجھتے ہیں، ان چاروں کو "خلفاء راشدین" کہتے ہیں۔ فرقہ شیعہ کے نزدیک اس کے حقدار صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے لیکن وہ بھی سب سے زیادہ زور ان کی "خلافت بلافصل" ہی پر دیتا ہے۔

ایک طرف یہ منصوصات ہیں، تصریحات ہیں، کتاب اللہ ہے، سنت انبیائے کرام ہے، اسوۂ صحابہ ہے، اور دوسری طرف لے دے کے یہ دلیل ہے کہ چونکہ "ترکوں نے اپنے سر خلافت کی ذمہ داریاں لینے سے انکار کر دیا ہے اس لیے سرے سے تحریک خلافت ہی کو فنا کر دینا چاہیے"۔ گویا اگر کل ترک خدانخواستہ اپنے دین سے مرتد ہو جائیں تو ہم سب کے ارتداد کے لیے بھی یہ دلیل کافی ہو جائے گی کہ جب اتنی بڑی محافظ اسلام قوم نے اپنا دین بدل دیا تو ہم کب تک اس کے دین کی حفاظت کر سکتے ہیں اب دونوں پہلو آپ کے سامنے ہیں اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ دونوں میں سے جو پہلو زیادہ قوی، زیادہ معقول اور زیادہ تشفی بخش معلوم ہو، انتخاب کرے۔

پوچھا جاتا ہے اور طنز و بدردی کے لہجے میں پوچھا جاتا ہے کہ اب تک خلافت کمیٹی نے کام کیا کیا ہے؟ یہ سوال ہم سے کیا جاتا ہے! اس کا جواب ہم دیں! اس کا جواب اگر لینا ہے تو انگریزی عدالتوں کے در و دیوار سے پوچھو، پولیس کے رجسٹروں سے پوچھو، جیلخانوں کے دروازوں اور پھاٹکوں سے پوچھو، لوہے کی بنی ہوئی ہتھکڑیوں اور ڈاکوؤں اور خونیوں کے سروں میں پڑنے والی بھاری بھاری بیڑیوں سے پوچھو، اس کا جواب مصر سے لو، فلسطین سے لو، حجاز سے لو، ٹرکی سے لو، افغانستان سے لو، جاوا سے لو، ہر آزاد اور نیم آزاد اسلامی ملک سے لو، ساری دنیائے اسلام سے لو اور اس پر بھی تشفی نہ ہو تو اللہ کے پاک فرشتوں کی زبان سے سنو۔ اور انھیں آپس میں یہ چرچا کرتے ہوئے سنو کہ جب آزمائش کا وقت آیا اور جب خلافت اسلامیہ کے لیے خطرہ کی گھڑی آئی، جب اسلام کی زیست و موت کا سوال درپیش ہوا تو اس وقت اللہ کے نام پر اس کے آخری رسول کے پیام پر، اس کی شریعت کے احترام پر، اپنے مال لٹا دینے والے، اپنی عزتیں اور شہرتیں قربان کر دینے والے، اپنا عیش و آرام نثار کر دینے والے، اپنی دنیا تاراج و برباد کر دینے والے، اپنی جانوں کو اپنی ہتھیلیوں پر رکھ کر لبیک کہنے والے، بیڑیاں پہننے کے شوق میں

طوق وزنجیر کے ذوق میں، ننگے اور بھوکے رہنے کے اشتیاق میں، پھانسی کے تختہ پر چڑھنے کی تمنا میں، سینہ پر گولیاں کھانے کی طلب میں، میدان میں ایڑیاں رگڑتی ہوئی لاشوں کو بے گور وکفن چھوڑ کر جانے کے ارمان میں جو خاک کے پتلے سب سے پہلے آگے بڑھے، وہ غلام ہندوستان کے غلام مسلمان، وہ مجبور ہندوستان کے مجبور امتیان رسول، وہ اسی ظلمتکدہ کے بسنے والے خدمت گزاران خلافت ہی تھے! زود فراموش انسان، حیلہ باز انسان اور صبر وانتظار سے گھبرا جانے والا انسان ممکن ہے، ان واقعات کو آج بھول جائے یا قصداً بھلادے لیکن اوراق لیل ونہار پر، روئے زمین کے ذرات پر صحیفۂ کائنات کے ایک ایک صفحہ پر جس وقت تک ابراہیم خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی فداکاری، ابراہیم ذبیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قربانی اور حسین بن علی رضی اللہ عنہ کے ذوق شہادت کے واقعات ثبت ہیں، اس وقت تک ان نامور سرداروں کے ادنیٰ سپاہیوں، خلافت اسلامیہ کے خدمت گزاروں اور تحریک خلافت کے علمبرداروں کی حقیر وناچیز کوششوں کا نقش بھی صفحۂ ہستی سے مٹ نہیں سکتا! انسان اگر آج بھلانا چاہتا ہے تو بھلادے لیکن وہ علیم وخبیر، وہ لطیف وبصیر جس کی ذات سہو ونسیان سے منزہ ہے اور جو انسانی نگاہوں سے اوجھل، پتھروں کے اندر رہنے والے کیڑوں تک کی خبر گیری کرتا رہتا ہے، اپنے عاجز ودرماندہ، بے کس وبے بس بندوں کی اس فداکاری کو بھول نہیں سکتا اور اکیلے اسی کا یاد رکھنا بس ہے۔

بزرگو اور عزیزو! خلافت کمیٹی کو اپنی بساط ومقدرت کے موافق آج خلافت راشدہ کی جانشینی کرنا ہے، اس لیے اس کے پھیلاؤ میں ساری دنیائے اسلام آجاتی ہے۔ ہندوستان بھی اور ہندوستان کا باہر بھی۔ لیکن اس کا اصلی اور مرکزی تعلق قدرۃً اسلام کے مرکز، ارضی سے ہے، اس ارض خلک مرتبہ سے جس پر اللہ کے سب سے اچھے اور سب سے سچے بندہ کے نقش قدم

نسبت ہیں)، اس رشکِ عرش سرزمین سے جو تئیس ۲۳ سال تک خدا معلوم کن کن قابلِ بیان اور
ناقابلِ بیان تجلیات کی جلوہ گاہ رہی ہے۔ اس خطۂ پاک سے جو آج بھی اللہ کے سب سے زیادہ
پیارے اور چہیتے، سب سے زیادہ دلارے اور لاڈلے کا آخری آرام گاہ ہے۔ وہاں کی ادنیٰ سے ادنیٰ
خدمت ہماری سب سے بڑی سعادت اور اس کے مرکز کے ساتھ ہمارا خفیف سا لگاؤ بھی ہماری سب سے
بڑی عبادت ہے۔ وہاں کے حالات کی معمولی ناخوشگواری سن کر بھی ہمارا دل اگر قابو میں نہ رہے
ہمارے ہوش و حواس اگر درست نہ رہیں، فرطِ اضطرار و اضطراب سے اگر ہم بیخود ہو جائیں تو
خدارا ہم پر بے عقلی و بے دانشی کا الزام نہ لگائیے اور اگر لگائیے بھی، تو کم از کم ہم سے یہ توقع تو
نہ کیجیے کہ اس الزام کے دفع کرنے کے لیے ہم اپنے اس قدرتی اور قلبی تعلق میں ایک ذرہ برابر
بھی کمی نہ آنے دیں گے۔ ہندوستان پر اگر کوئی مصیبت آئی تو وہ یقیناً ہماری مصیبت ہوگی۔
ٹرکی و مصر: افغانستان و مراکش میں ہمارے بھائیوں کو کوئی دکھ پہنچا تو وہ دکھ بھی عین ہمارا
دکھ ہوگا۔ لیکن خدا نخواستہ اگر اس مرکزِ اسلام، قبلۂ دین، مرکزِ ایمان کو ادنیٰ سا بھی گزند پہنچا
تو یہ ہمارے جسم کا صدمہ نہ ہوگا بلکہ خطرہ ہوگا ہماری جان کا، پامالی ہوگی ہماری روح کی،
حملہ ہوگا ہمارے ایمان پر۔ سیکڑوں ہندوستان اور ہزارہا افغانستان، صدہا مصر اور
بے شمار ٹرکی قربان ہیں اس ارضِ پاک کے چپہ چپہ پر، نثار ہیں اس دیارِ حبیب کے ذرہ ذرہ پر!
کارلائل کا شمار اگر یہ کہہ کر بھی کہ "برطانوی قوم کو برطانیہ کی سلطنت چھن جانا قبول ہے لیکن
شیکسپیر سے دست بردار ہو جانا قبول نہیں"۔ داناؤں میں باقی رہ سکتا ہے تو ایک مسلمان بھی
ارضِ حجاز کے متعلق اس والہانہ عقیدت کو بیان کرنے سے نادانوں کے زمرہ میں نہیں آجاتا۔
لیکن اگر یہ نادانی ہے تو اس نادانی پر ہزاروں دانائیاں قربان اور اگر جنون ہے تو اس
جنون پر ہزاروں خردمندیاں تصدق! اللہ سے بصد عجز و تضرع دعا ہے کہ وہ ہماری اس

نادانی، بے عقلی اور جنون کو بجائے دور کرنے کے اور ترقی دیتا رہے۔

من لذت درد تو بہ درماں نہ فروشم		دشوار بدست آید و ازاں نہ فروشم

آج اس ارض نور کے مطلع پر ملکیت و استبداد کا جو سیاہ بادل چھایا ہوا ہے اس کو جائز و مناسب تدبیروں سے دور کرنا اور سرزمین قبلہ کو پھر تمام اہل قبلہ کے سپرد کر دینا خادمان خلافت کا پہلا اور سب سے بڑا فرض ہونا چاہیے۔ یہ جائز و مناسب تدبیریں کیا اور کیونکر اختیار کی جائیں اس کا فیصلہ کرنا قوم کے اہل حل و عقد کا فرض ہے۔ ان طریقوں کے اختیار کرنے میں اختلاف رائے و خیال کی پوری گنجایش ہے۔ لیکن نفس اس فریضہ کی اہمیت سے انکار یا اس میں تردد و تامل تصور میں نہیں آتا کہ کلمہ گویانِ اسلام کا کوئی بھی فرقہ کر سکتا ہے! کہا جاتا ہے کہ "اصلاح مفاسد کے لیے صرف حجاز کا کیوں انتخاب کیا جاتا ہے، بے شمار مفاسد دوسرے ممالک اسلامیہ میں بھی تو آخر موجود ہیں"! میرے بھائیو اور بزرگو! کاش ان الفاظ کو زبان سے نکالنے کے قبل ان کے معنے کو سوچ لیا جاتا! جسم کے کسی حصہ میں پھانس لگ جائے تو تکلیف و اذیت کس کو نہ محسوس ہو گی لیکن اگر خدانخواستہ قلب میں نشتر گھسا جا رہا ہے تو کیا اس غریب اور بدنصیب سے یہ سوال کیا جائے گا اور اس کے جواب پر اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ ہاتھ پیر کی پھانسوں کو چھوڑ کر قلب کے نشتر سے کیوں اسقدر بیقرار ہوا جا رہا ہے! محبت و عقیدت ہم کو دنیا کے ہر نیک اور خدا پرست انسان سے ہے، خواہ وہ کسی زمانہ اور کسی قوم کا ہو کہ اسلام کی یہی تعلیم ہے، لیکن قلب کو جو تعلق جگر گوشۂ عبداللہ اور نور بصر آمنہ (روحی فداہ) کے ساتھ ہے وہ کسی بزرگ، کسی ولی، کسی نبی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ کیا قیامت ہے کہ ہم کو مشورہ یہ دیا جا رہا ہے کہ حجاز کے مفاسد موجودہ کو ان کی حالت پر چھوڑ دو اور اس وقت تک انتظار کرتے رہو جب تک سارے عالم اسلام کی اصلاح نہ ہو جائے۔ دوستو اور عزیزو، ان گذارشات اور معروضات کا یہ مطلب نہیں کہ حجاز کی موجودہ حکومت کے خلاف فوراً اعلان جنگ

کر دیا جائے وہ حکومت تو بہر حال مسلمان ہے فوری اعلان جنگ تو ہم کافر اور غاصب حکومتوں تک کے خلاف نہیں کرتے۔ فریضہ ہمیشہ بطور نصب العین (آئیڈیل) کے ہوتا ہے، اور اس نصب العین کے حصول کے ذرائع کا دار و مدار ہمیشہ اپنی صلاحیت و استعداد اور حالات گرد و پیش کی موافقت اور عدم موافقت پر ہوتا ہے۔ مقصد گزارش صرف اس قدر ہے کہ اس فریضہ کو بطور نصب العین کے سامنے رکھ کر تمام امور متعلقہ پر سنجیدگی و خلوص اور محبت برادرانہ کے ساتھ غور کر کے فیصلہ متفقہ یا بڑی اکثریت کے ساتھ صادر ہو۔ اس پر پوری قوت و دیانت کے ساتھ عمل کیا جائے۔ خدا کے فضل سے موتمر کا ایک بہت موثر آلہ ہمارے ہاتھ میں آگیا ہے، اس سے پورا فائدہ نہ اٹھانا ایک بہترین خداداد موقع کو ہاتھ سے ضائع کر دینا ہوگا!

ارض حجاز کی اس خدمت کے ساتھ ہی ساتھ خود اپنے وطن میں کام کرنے کے نہایت وسیع میدان موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ "خلافت کمیٹی کو اب باہر کا خیال چھوڑ کر گھر کی خبر لینا چاہیے اور سارا کام اب ہندوستان ہی میں کرنا چاہیے"۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ دونوں کام ایک دوسرے کے منافی کیوں قرار دے لیے گئے ہیں! کیا حقوق اللہ اور حقوق العباد ایک دوسرے کے منافی ہیں؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص اللہ کے لیے نمازیں بھی پڑھتا ہے، روزہ بھی رکھتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے کنبہ والوں اپنے ہمسایوں کی خدمت بھی کرتا رہے، اور یہ دونوں قسم کے کام اسی چوبیس گھنٹہ والے دن رات کے اندر ہی انجام پاتے رہیں؟ توفیق الٰہی اگر یاوری کرے اور ہم خلوص و نیک نفسی کے ساتھ تھوڑی سی ہمت بھی اپنے اندر اور پیدا کر لیں تو یہ مشکل کیا ہے کہ ایک طرف موتمر کے ذریعہ سے ہم خدمت حجاز میں بھی لگے رہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ دوسری طرف اپنے ملک میں، اپنی تعلیمی تنظیمی، معاشری، سیاسی، دینی ہر قسم کی کوششوں کو بھی جاری رکھیں۔ ہر ہر مقام پر لڑکوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے رہیں، بے روزگاروں کو روزگار سے لگا

رہیں، دوکانیں کھلوائیں، چرخہ اور کھدر کی ترویج کرتے رہیں، اپنے ہم قوموں کو مختلف حرفوں اور پیشوں کی جانب مائل کریں، شریفوں کے دماغ سے محنت اور چھوٹی قسم کی دکانداری کے ذلیل سمجھنے کا خیال نکلوائیں۔ ہر ہر بستی کے مسلمانوں کی مردم شماری کرا کے معذوروں اور اپاہجوں کو مالی امداد دیتے رہیں اور کاہلوں کو کسی کام سے لگائیں۔ اس قسم کے تعمیری کام سیکڑوں کی تعداد میں ہندوستان کے اندر کرنے کے موجود ہیں۔ ملک کی آزادی کے لیے جد و جہد کرنا ان سب سے اہم ہے۔ ہندوستان کے ۳۲ کروڑ باشندوں کا ایک غلام کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے رہنا کا واقعہ ہمیشہ تاریخ عالم کے نادر واقعات میں درج رہے گا، لیکن اس سے بڑھ کر حیرت انگیز اور شرمناک یاد اس واقعہ کی رہے گی کہ ان ۳۲ کروڑ میں سے ۷ کروڑ وہ نفوس تھے جن کا دینی و ایمانی نعرہ تھا کہ (ان الحکم الا للہ) حکومت بجز خدا کے اور کسی کی نہیں۔ جن کی کتاب مبین میں صاف صاف یہ ہدایت موجود تھی کہ (وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکَافِرُوْنَ) جو خدائی قانون کو چھوڑ کر کسی اور قانون کو مانتے اور اس کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں وہ کافر ہو جاتے ہیں اور جنھیں شروع سے بتا دیا جاتا تھا کہ (وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَھَا) اللہ کی رسی مضبوط تھامنے کے لیے اللہ سے اپنا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے کے لیے لازمی ہے کہ خدا پر ایمان رکھنے کے ساتھ غیر خدائی حکومتوں سے سرکشی، طاغوتی سلطنتوں سے بغاوت اور شیطانی قوتوں سے یکسر بیزاری اختیار کر لی جائے۔

ملک میں آج بہت سی انجمنیں مفید مقاصد و اغراض کے ساتھ قائم ہیں، جمعیۃ خلافت ان میں سے کسی کی بھی رقیب، حریف نہیں۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ غیر مسلموں کی بھی ہر مفید و کارگذار انجمن کی جانب اتحاد و اشتراک کا ہاتھ بڑھانے کے لیے ہر وقت تیار ہے۔ عبرت کا مقام ہے کہ وہ مسلم جو دنیا میں دوسروں کی رہنمائی اور رہبری کے لیے آیا تھا جس کا

مقصد آفرینش یہ تھا کہ بھٹکی ہوئی دنیا کو اپنی روشنی میں چلائے، آج وہ اس کو غنیمت سمجھ رہا ہے کہ دوسروں کے دوش بدوش کام کر سکے! اسے تو وہ بصارت و بصیرت عنایت کی گئی تھی کہ وہ دنیا کو راہ دکھائے، آج وہ خود دوسروں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی کا سہارا ڈھونڈھ رہا ہے! کاش آج آزادی کی جنگ نیز اپنی قوم کی شیرازہ بندی میں ہم دوسروں کے لیے چراغِ ہدایت ثابت ہوں۔

لیکن یہ ساری تعمیری، تخریبی، ملکی و سیاسی، تعلیمی و تنظیمی کوششیں اسی وقت اور صرف اسی وقت بارآور ہو سکتی ہیں جب پہلے ہم خود شخصاً و جماعۃً مسلمان بن جائیں۔ نماز با جماعت جو ہمارے تمام امراض کا علاج وحید تھی اس کی طرف سے ہم یکسر غافل و بے پروا ہیں اور پھر چاہتے یہ ہیں کہ کسی طرح ہماری بگڑی بن جائے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ مصلحین کا ذکر ہے اور وہاں عمل میں انکی شناخت ارشاد ہوئی ہے (وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ) کہ وہ نماز با جماعت پابندی سے ادا کرتے ہیں، وقت نہیں ہے ورنہ نماز با جماعت کے فضائل و مصالح، قومی و اجتماعی نقطۂ نظر سے ذرا تفصیل کے ساتھ عرض کیے جاتے۔ باقی اگر ذاتی رائے دریافت کی جائے تو جی یہ چاہتا ہے کہ خلافت کمیٹی کی ممبری کی شرط ہی نماز با جماعت رکھ دیجائے یعنی آیندہ سے ارکان صرف وہی مسلمان ہو سکیں جو نماز با جماعت کے پابند ہوں۔ آج سیکڑوں اسکیمیں اور تجویزیں قوم کے سامنے پیش ہیں، لیکن اگر آج سے ہر مسلمان مرد نماز با جماعت کا عہد کر لے اور ہر مسلمان عورت چرخہ کو اپنے لیے لازمی سمجھ لے اور کم از کم تجربہ ہی کے طور پر دو برس اس پر عمل رہے تو خدائے قادر و توانا کے فضل و کرم پر اعتماد کر کے دعوے کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اس دو برس کی مدت میں اسلامی ہند کی کایا کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ یہ نماز با جماعت ہی ہمارے دلوں میں اتحاد پیدا کر سکتی ہے جس کے فقدان نے آج ہر قسم کی ابتری

اور بدنظمی پیدا کر رکھی ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر جزئی اختلاف رائے وعقیدہ ایک مہتم بالشان مخالفت بن جاتا ہے۔

کام کرنے والوں کی کثرت و فراوانی پہلے بھی نہ تھی لیکن اب تو یکسر قحط ہو گیا ہے۔ کام اپنی جگہ پر بدستور لیکن کام کرنے والے عنقا، ہر شخص دوسرے پر معترض، ہر فریق دوسرے سے بدگمان، جو بچے کھچے اللہ کے بندے ابھی تک کام میں لگے ہوئے، خدا ان کی ہمت میں برکت وترقی دے۔ بڑے سے بڑے کام ہمیشہ قلیل و مختصر سی جماعتوں ہی نے انجام دیے ہیں۔ تعداد کی کثرت اور سامان کی زیادتی خدا سے اعتماد ہٹا کر تعداد وسامان پر کر دیتی ہے، اسی لیے اس کا انجام اکثر ناکامی پر ہوا ہے۔ میدان بدر میں تین سو مومنین صادقین نے اس فوج پر فتح پائی ہے جو تعداد میں ان کی تین گنی اور سامان جنگ کے لحاظ سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ ایران اور روما اپنے زمانہ کی متمدن ترین اور زبردست ترین سلطنتیں تھیں، مسلمانوں نے جب انھیں فتح کیا ہے تو اپنی تعداد، سامان جنگ، قواعد دانی، کسی اعتبار سے بھی ان کے ہمسر نہ تھے صرف قوت میں ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ آپ بھی اپنے دل میں یہی قوت ایمانی پیدا کر کے دیکھئے اور پھر ہمیشہ کے لیے دوسروں کی کثرت تعداد وغیرہ کے خوف سے امن ہو جائے گا۔ حضرت جوہر جو ہمیں آپ کے سامنے تشریف فرما ہیں انھوں نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

بیچارگی پر اپنی نہ جا شان خدا دیکھ　　　تو طیر ابابیل سے ہرگز نہیں کمزور

جس خدائے قدوس و توانا نے ایک منٹ پر میں یہ قوت دے دی تھی کہ وہ ایک زبردست بادشاہ کی زبردست فوج کو دم کے دم میں ملیامیٹ کر دے۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ آج ہم ناتوانوں اور بے کسوں کے ذریعے اپنے بڑے سے بڑے کام لے! اور دنیا کی بڑی بڑی گردن کش قوموں کا سر غرور ہمارے ہی دست ناتواں سے نیچا کرا کے چھوڑے۔

محترم بزرگو! اس طویل سمع خراشی کو ختم کر کے اب آپ سے ان کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کے لیے جو مہمانداری کے سلسلہ میں یقیناً ہوئی ہیں، آپ ہی کے الطاف کریمانہ کو آپ کے سامنے شفیع بناتا ہوں۔ اپنی ذات کے متعلق مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ آپ حضرات کی خدمت گذاری کی سرے سے اہلیت وصلاحیت ہی مجھ میں نہ تھی اور نہ ہے۔ زمانہ کی نیرنگی اور عبرت اندوزی کا یہ بھی ایک نمونہ ہے کہ مجلس استقبالیہ کی صدارت جیسی اہم اور جلیل القدر خدمت کے لیے قرعۂ انتخاب مجھ جیسے نااہل شخص پر پڑا۔ آج جو کچھ بھی آپ دیکھتے ہیں، یہ سب دفتر مرکزی کے کارکنوں اور مجلس استقبالی کے بعض مستعد کارگذاروں کی محنت وسعی کا نتیجہ ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔

اے دلوں کے پھیر دینے والے پروردگار! تو نے عرب کے شدید کینہ پرور و نفاق پسند سینوں میں ایمان کی حلاوت اور دین کی لذت ڈال کر سب کو ایک کر دیا تھا۔ تو نے اوس و خزرج کی لڑائیوں کی آگ کو جو پشتہا پشت سے بھڑکتی چلی آرہی تھی محبت اسلام کے پانی سے دم کے دم میں فرو کر دیا تھا تو آج بھی وہی ہے جو عہد سے تھا، آج اپنے نام کا کلمہ پڑھنے والوں کو توفیق دے کہ خلوص و محبت کے ساتھ ایک دوسرے سے مل کر تیرے دین کی خدمت پر آمادہ ہو جائیں! ان کے سینوں کو نفاق سے پاک کر دے اور ان کے دماغوں اور عقلوں سے مادی قوتوں اور طاغوتی حکومتوں کی مرعوبیت اور ہیبت دور کر دے!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

باب (۶۷)

سنہ ۱۹۲۷ء (۲)

(جوش کے ساتھ ہوش۔ جنون کے ساتھ تدبر)

قانون فوجداری کی مشہور و معروف کتاب، ضابطۂ تعزیرات ہند کھولیے، تو دفعہ ۲۹۵ الف آپ کو حسب ذیل الفاظ میں ملے گی:۔

"جو کوئی جان بوجھ کر اور بدنیتی سے ملک معظم کی رعایا کے کسی طبقہ کے مذہبی احساسات کو الفاظ کے ذریعہ سے زبانی ہوں یا تحریری، یا نقوش مرئی کے ذریعہ سے ٹھیس پہنچانے کی غرض سے اس کے مذہب یا مذہبی معتقدات کی توہین کرے گا یا توہین کرنے کی کوشش کرے گا، وہ دو سال کی سزائے قید کا خواہ وہ قید کسی قسم کی ہو، یا جرمانہ یا دونوں (سزاؤں) کا مستوجب ہوگا۔"

آپ کہیں گے کہ محمد علی کی زندگی خصوصاً اس کے متعلق ڈائری کو آخر تعزیرات ہند سے کیا تعلق؟ ______ تعلق ہے اور ابھی چند سطروں میں ظاہر ہوا جاتا ہے۔

سنہ ۲۷ء ابھی چل ہی رہا تھا کہ پنجاب کے کسی بدزبان بے لگام آریہ سماجی نے ایک کتاب نہایت گستاخانہ بلکہ "پاجیانہ" ذات رسالت مآب سے متعلق لکھ ماری۔ دو ایک اور کتابیں اسی زمانہ میں ایسی ہی اشتعال انگیز اور صبر آزما اس موضوع پر نکل چکی تھیں۔ مسلمان اب غصہ سے بیخود اور بالکل بپھرے ہوئے تھے۔ اتفاق وقت کہ اس گندی کتاب کے متعلق مقدمہ

جب پنجاب ہائی کورٹ میں گیا تو دوسرے ججوں کی رائے جو کچھ بھی رہی ہو جسٹس دلیپ سنگھ نے
اپنے فیصلہ میں یہ لکھ دیا کہ کتاب کی عبارتیں کیسی ہی ناخوش گوار ہوں بہر حال کسی قانون کی خلاف ورزی
نہیں کر رہی ہیں، اور اس لیے حدود قانون کے اندر ہیں۔ اس فیصلہ کا شائع ہونا تھا کہ پنجاب ہی
میں نہیں، سارے اسلامی ہند میں ایک آگ لگ گئی، اور جسٹس دلیپ سنگھ چونکہ نام سے ہندو
یا سکھ معلوم ہو رہے تھے (حالانکہ واقعۃً مسیحی تھے) اس لیے قوم کے سارے غصہ کا مرکز و محور ان ہی
کی ذات کو بننا پڑا ــــــــــ سارے مسلمان جوش سے دیوانے ہو رہے تھے۔ اخبارات
خصوصاً پنجاب کے اخبارات، ایک سے بڑھ کر ایک تیز مضمون لکھ رہے تھے۔ تقریریں شعلہ
برسا رہی تھیں۔ لیکن خاموش تھے تو ایک مولانا! ساکت تھا تو ان ہی کا اخبار ہمدرد۔

ان کا سکوت معاصرین کو انتہائی بے محل نظر آیا۔ اور جن کے سینوں میں رقابت کی آگ
مدت سے دبی ہوئی تھی، انھیں تو کھل کھیلنے کا جیسے خداداد موقع ہاتھ آگیا ــــــــــ
یاد کر لیجیے کہ کتنی پارٹیاں کسی نہ کسی سبب سے مولانا سے جلی ہوئی بیٹھی تھیں۔ خواجہ حسن نظامی اور ان کے
ساتھ کے سارے "خوش عقیدہ" صوفیہ و مشائخ۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب اور ان کے ساتھ
کے سارے اہلحدیث اور غالی "غیر مقلدین"۔ سرکار انگریزی کے وفادار و خیر خواہ سارے "خان بہادر"
رئیس اور امیر، وغیرہا ــــــــــ اب سب کے سب مل کر ٹوٹ پڑے اور ہر طرف سے شور بلند
ہو گیا، کہ "دیکھ لی محمد علی کی ہندو پرستی، ناموس رسولؐ پر اتنا بڑا حملہ ہو گیا اور ٹس سے مس نہ ہوئے۔
بولیں کیسے، ہندو کانگرس سے تنخواہ پا رہے ہیں۔ گاندھی جی اور موتی لال نہرو اور پنڈت
مدن موہن مالوی اور سیٹھ برلا کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں نہ! وقس علی ہذا۔
محمد علی انتہائی جوشیلے ہونے کے باوجود بہر حال ہوش بھی ذمہ دار ترین لیڈر کا رکھتے تھے۔

اور اپنا کام ہر تیز دھارے کے ساتھ بہنا نہیں، بلکہ عوام کو سیدھی راہ دکھانا، ملت کی صحیح رہنمائی کرنا جانتے تھے۔ ہفتوں بلکہ شاید مہینوں تک صبر و تحمل کے ساتھ گالیاں کھانے، آوازے سننے کے بعد بالآخر بولے۔ اور وہ بول بولے جسے سب کو سننا، سب کو ماننا پڑا، اور بالآخر اسی کے آگے سب کو جھکنا پڑا۔ جون کی ۲۰ تھی جب مولانا کا پہلا مضمون اس مبحث پر ہمدرد میں نکلا، اور پھر ۱۰ اگست کو۔ اور بھی ان کے مضامین نکلے ہوں گے۔ لیکن اس ڈائری کو تعلق ان کے مضامین سے نہیں، اس کا تعلق تو ان کی زندگی سے متعلق ڈائری نگار کے صرف ذاتی مشاہدات سے ہے

جولائی کی ۱۵ تھی، کہ لکھنؤ اور مضافات لکھنؤ کے مسلمانوں نے ایک بڑا ہی زبردست احتجاجی جلسہ لکھنؤ میں کیا، اور صدارت کے لیے مولانا کو دہلی سے بلایا۔ اتنا بڑا اور پُر شوکت جلسہ مسلمانوں کا لکھنؤ میں کمتر ہی ہوا ہوگا۔ تحفظ ناموس رسولؐ کے نام میں کشش ہی ایسی تھی۔ شیعہ سنیوں میں چلی ہوئی تھی لیکن آج کلمہ کی وحدت نے سب کو گلے ملا دیا تھا۔ نقیب اہل سنت انجم کے مدیر، اور شیعہ کانفرنس کے سکریٹری دونوں صدر محترم کے پہلو میں ایک ہی تخت پر بیٹھے ہوئے امیر، غریب، عوام، خواص، وہابی، بدعتی، قادیانی، اہل قرآن، سب کے سب آج صرف کلمہ گو تھے، اور ناموس رسولؐ کے محافظ۔ تحریک خلافت کے عین شباب کے زمانہ کی طرح آج چھوٹا اور بڑا مسلمان ہی ہر طرف سے ابلا پڑ رہا تھا ——— یہ دریابادی، محمد علی کی آمد حسب معمول لکھنؤ پہلے سے آگیا، اور پیشوائی کے لیے اسٹیشن پر موجود تھا ہی۔

جلسہ بعد عصر رفاہ عام ہال کے عقبی میدان میں ہوا، اس وقت تک یہاں کے جلسے عموماً دہلیں ہوا کرتے تھے، امین الدولہ پارک کا نام بطور جلسہ گاہ کے اب دو ہی چار سال سے آنا شروع ہوا تھا، عبرت اور بصیرت کی آنکھ یہ منظر دیکھ رہی تھی کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں ابھی کل دو برس پہلے مسئلہ حجاز

پر محمد علی تقریر کرنے کھڑے ہوئے تھے، اور شور و غل کر کے انھیں بولنے ہی سے روک دیا گیا تھا اور
کہاں اب اس عقیدت و محبت کے ساتھ سب کی نظروں کے مرکز وہی بنے ہوئے ہیں، اور ان
کے ایک ایک فقرہ پر تحسین کے نعرے، بلند ہو رہے ہیں!

مولوی ظفر الملک علوی (ایڈیٹر الناظر مرحوم) بڑے پر جوش لوگوں میں تھے، کہنا چاہیے
کہ جوش مجسم تھے۔ شروع میں تقریر ان ہی کی ہوئی، اور اس نے مجمع میں ہلچل سی ڈال دی مجمع
اشتعال پذیر پہلے ہی سے تھا، اب یہی معلوم ہوتا تھا کہ جما جمایا جلسہ اکھڑ جائے گا، اور مجمع خود قانون
کو ہاتھ میں لے کر کچھ نہ کچھ کر ہی گزرے گا۔ لیکن واہ رے محمد علی۔ جلسہ کو اب سنبھالنا ان ہی کا
کام تھا۔ آج کی تقریر نرم و گرم، جوش و ہوش کا ایک عجیب دلچسپ اور اثر آفریں مجموعہ تھا پہلے
تو انھوں نے جلسہ کو خوب گرمایا، اور پھر ٹھنڈا بھی خوب ہی کیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ

"ایسی کتابیں اور مضامین یقیناً ہر مسلمان کا خون کھولا دینے کے لیے کافی ہیں۔ جتنا بھی
جوش و خروش آپ میں پیدا ہو، سب بجا ہے۔ لیکن اصل کوشش فتنہ کے سر چشمہ کو بند کرنے
کی ہونی چاہیے نہ کہ فلاں جج کو ہٹا دینے کی۔ قصور قاضی کا نہیں، قصور خود قانون کا ہے۔ میں
کوئی وکیل نہیں، بیرسٹر نہیں۔ قانون میں نے جو کچھ سیکھا ہے وہ بار بار ملزم کی حیثیت سے عدالت کے
کٹہرے میں کھڑے ہو ہو کر سیکھا ہے۔ تو مجھ عامی کا پر زور مشورہ یہی ہے کہ آئندہ سدباب فتنہ کے لیے
قانون ہی کو بدلوائیے، اور تعزیرات ہند میں ایک مستقل دفعہ بڑھوا کر توہین بانیان مذاہب کو
جرم قرار دیجئے۔ اب تک یہ کوئی مستقل جرم ہی آپ کے ملکی قانون میں نہیں۔ رعایا کے فرقوں
کی دلآزاری کے تحت میں لا کر بعض عدالتیں ایسے مجرموں کو سزا دے دیتی ہیں۔ لیکن یہ تو
حاکم کی رائے ہوئی۔ کوئی مستقل قانون تو نہ ہوا۔ میں اسمبلی کا ممبر نہیں، دفعہ کا مسودہ میں تیار
کیے دیتا ہوں، کوئی ممبر صاحب اس میں مناسب لفظی ترمیم کر کے اسے اسمبلی میں پیش کریں

اور منظور کرائیں، تاکہ ہمارے آقا و ہادیؐ اور ان کے ساتھ تمام دوسرے مذہبوں کے محترم بانیوں
کی بھی شخصیتیں بدزبان و بے لگام لکھنے والوں کے حملہ سے محفوظ رہیں۔ علمی رنگ میں کسی مذہب
پر یا تاریخی حیثیت سے کسی مذہب کے بانی پر سنجیدہ تنقید کرنا بالکل دوسری شے ہے، اس کا دروازہ
ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے، لیکن جو طعن و تعریض، توہین اور سبّ و شتم جو کسی مذہب کے بھی پیمبر و ں
یا دوسرے بزرگانِ دین کے حق میں ہو آج سے اسے ہندوستان کے قانون میں قطعی جرم قرار
دیا جانا چاہیے

یہ تقریر محمد علی کی صحیح اور تاریخی رہنمائی کی ایک مثال تھی، شروع شروع اقبالؒ تک اس
کے موئد نہ تھے۔ رفتہ رفتہ سارا ملک تائید کرنے لگا۔ اور کہاں تو قوم ایک بہت ہی محدود
اور شخصی مقصد (جسٹس کنور دلیپ سنگھ کے ہٹائے جانے) کے پیچھے مٹی ہوئی تھی۔ کہاں اس
بلند اور اصولی مقصد کو اس نے اپنا نصب العین بنا لیا۔ کامریڈ تو بند ہی ہو چکا تھا۔ اب لے دے کے
ہمدرد ہی تھا۔ جس کی اشاعت خود ہی بہت محدود تھی، اور اشاعت زائد ہوتی بھی کیسے محمد علی
کی تاکید شدید رہتی تھی کہ "اخباری سنسنی خیزی" سے ہمدرد اپنا دامن برابر بچائے رکھے۔ بہر حال
کچھ اس کے سہارے، اور کچھ زبانی تقریروں سے، اللہ نے برکت یہ دے دی کہ یہی تحریک
مقبول ہو گئی۔ اور چند ہفتوں کے اندر ایک ممبر نے اسمبلی میں تعزیرات ہند کی دفعہ ۲۹۵
میں اضافہ کرا کے، دفعہ ۲۹۵ الف کے نام سے یہ دفعہ بھی منظور کرا دی جس کے الفاظ تک
اصلاً محمد علی ہی کے مرتب کیے ہوئے ہیں۔ اور یہ دفعہ جب تک بھی ملک کے قانون میں موجود
رہے گی اس کا اجر ان کے نامۂ عمل میں ثبت ہوتا رہے گا ——— خدمت دین
و ملت کے جو مستقل کام محمد علی اپنی مختصر سی زندگی میں انجام دے گئے۔ اس کی کوئی مستقل داستان

نہیں۔ چھوٹی بڑی خدا جانے کتنی ہی ان کی مخلصانہ خدمتیں اسی نوعیت کی ہیں، کاش کسی کو بھی
ان کی مفصل سیرت نگاری کی توفیق ہو جاتی! اور اب کیا ہو گی، دیکھتے ہی دیکھتے ان کے
جاننے والے بھی کتنے اٹھ گئے اور ان کی یاد بھی کتنے دلوں سے مٹ گئی! ع

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے!

اور ع

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

لیکن یہ سب بھی صرف ظاہر کے اعتبار سے ہے، ورنہ حقیقت کے لحاظ سے تو ہر متنفس
کے اعمال کا خدائی نامۂ اعمال ہی میں درج ہونا بس کرتا ہے۔

پتہ

(۱)

صدق بک ایجنسی، کچہری روڈ، لکھنو

(۲)

دار المصنفین اعظم گڈھ

قیمت.........۶ روپے